
علم الانسان ما لم یعلم
کتبخانہ
جامعہ ملیہ اسلامیہ
دہلی
شعبہ
شمارہ
عدد داخلہ

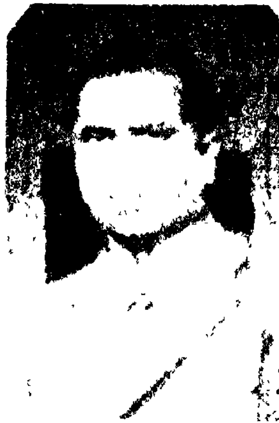
[illegible]



[illegible]



[illegible]



[illegible]



[illegible]



[illegible]



[illegible]



[illegible]



[illegible]



[illegible]



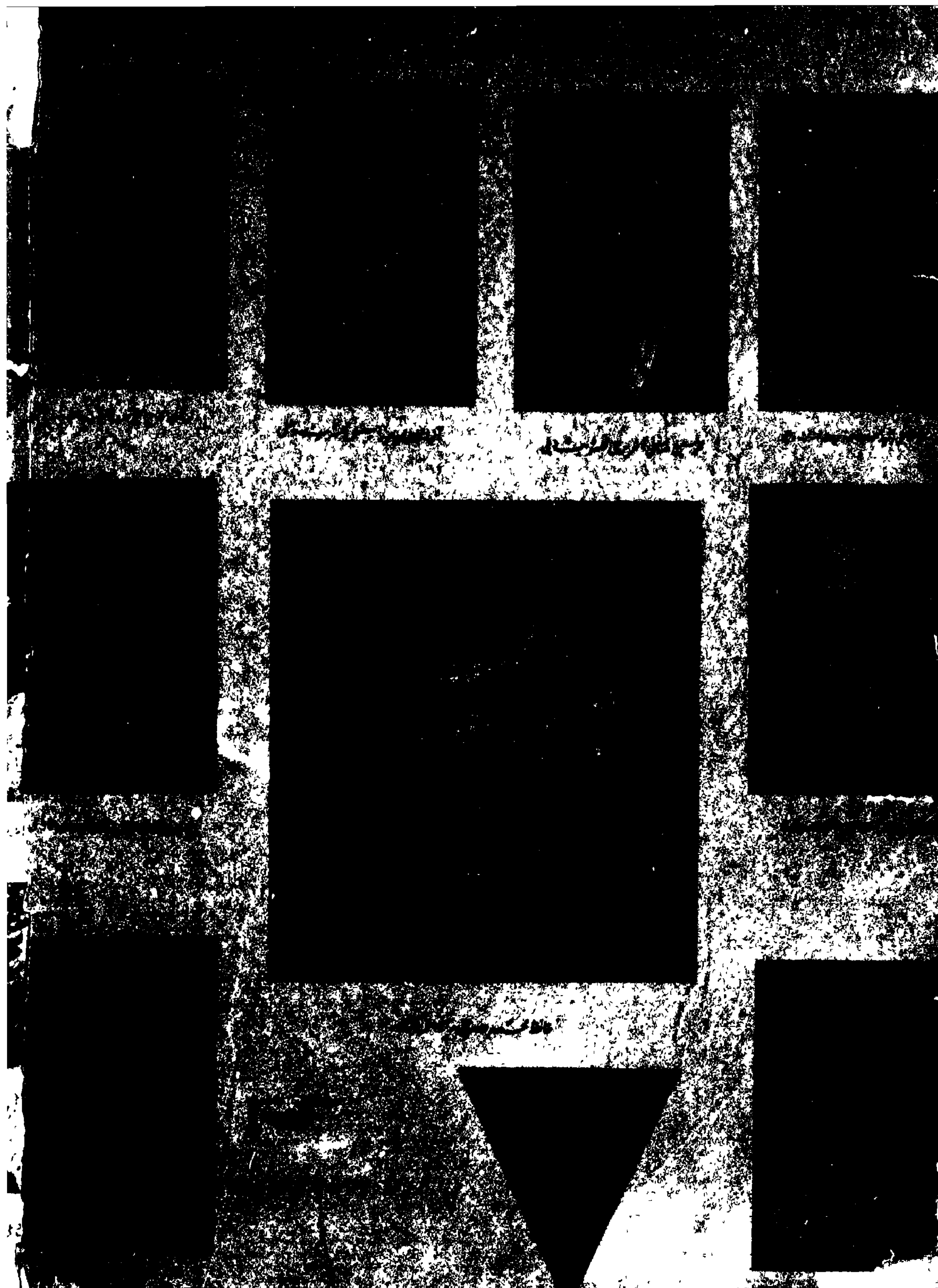
[illegible]



[illegible]



[illegible]



اُن طلائی زنجیروں کے نام

جو عنقریب میرے پاؤں میں پڑا چاہتی ہیں'

انوار حقی

ہمارا کتب خانہ جہاں تاجروں کو معقول کمیشن ملتا ہے

تاجران اور لائبریریوں کی معلومات کے لئے مختصر فہرست کتب

کتاب	مصنف	قیمت
مونتہ بیرونی سائنس	مولوی عبد الرحمٰن خان صاحب	[illegible]
مشرق مغرب کے حالات	محمد اسحاق	[illegible]
اسلامی تہذیب	مولوی غلام دستگیر	[illegible]
قرآن اور علم جدید	ڈاکٹر میر ولی الدین	[illegible]
روح روشن مستقبل	سید طفیل احمد منگلوری	[illegible]
الاسلام منتظم	حکیم محمد عثمان صاحب	۲ر
محمد رسول اللہ	مقبول احمد سیوہاروی	[illegible]
آخری رسول	ماہر القادری	۱۲
رہنمائے مدینہ	مولوی مسعود علی صاحب	[illegible]
رزم نامہ سلیم منظوم	منظر پانی پتی	[illegible]
بہارستان بچوں کے لئے	سید رواعظیم	[illegible]
مدینہ قوالی	حافظ سکندر بخت	[illegible]
رہنمائے قرآن	سر فاست جنگ بہادر	[illegible]
تذکرۃ الاولیا	محمد حسام الدین	[illegible]
ویدک	مہندر راج سکسینہ	[illegible]
عورت کی عفت	فرزند توحید	[illegible]
[illegible]	سلیم راشد	[illegible]
روز پاکستان	مرزا مظفر بیگ	۱ر
[illegible] یادگار	مرزا فرحت اللہ بیگ	۱۲ر
گیت اور نگمہ	اختر انصاری	[illegible]
[illegible]	محمود زمانی مرحوم	[illegible]
تعلیم القرآن	غلام دستگیر صاحب	۱۱ر
چند گھنٹے کی سیتی	ڈاکٹر محمد [illegible]	[illegible]
رنگ شاہ اور خاتم	مولانا ظفر علی خان	[illegible]
قرآن و لیاقت	ابو محمد مصلح	[illegible]
جنگان ریز اور قرآن	〃	[illegible]
دو بینلے دکن اور ترقی	〃	[illegible]
تکنیک شہ میں	بزرجی قوم دوش	[illegible]

کتاب	مصنف	قیمت
روحانی تو علم	محمود اکرام	۱۰ر
سرخ [illegible]	〃	[illegible]
غلمی [illegible]	علی جام پوری	۱ر
جنتا کی پروں میں	حاجی نبی احمد	[illegible]
دلوان رنگین و انشا	رنگین و انشا	[illegible]
گلوم پیتوڑ	مسز محمودہ فاروقی	۱۲ر
رموز اقبال	ڈاکٹر میر ولی الدین	[illegible]
فاسعہ تقدیر	نجا تیلوی	[illegible]
تانین	میجر منصور	[illegible]
ہلال شر		[illegible]
روح حیات	اختر قریشی صاحب	[illegible]
مکاتیب بسند دی	مخزدی بیگم	[illegible]
تاترک	اشفاق علی صاحب	[illegible]
ہمارے نبی کے صحابہ	اعجاز الحق قدوسی	[illegible]
رسول پاک کی اسا بزرگیاں	〃	[illegible]
سیرت امام حسین	〃	[illegible]
رکن کاہ رسول کی تو علانیہ	〃	[illegible]
سراپائے رسول	〃	[illegible]
گنجینۂ مناجات	انتخاب امداد اللہ [illegible]	[illegible]
سیدہ فاطمہ سلام	〃	[illegible]
میلاد اکبر	[illegible]	[illegible]
مدار مدکور	کوثر علی اقبال گوہر	[illegible]
عباسی [illegible]	ڈیزائنز [illegible]	[illegible]
خزائن مطب جدید	[illegible]	[illegible]
چشمۂ فیض یا کلید کامیابی	سید شاہ بخاری	[illegible]
تحریر قدرت یا علم القیافہ	مولوی احتشام الدین صاحب	[illegible]
سو سو شعر دنگ ماند خوبصورت کتابیں	مختلف شعرائی سیٹ	۱۲ر

کتاب	مصنف	قیمت
تینا کی کہانیاں	ہاشمی جلدہ ۵ مختلف مصنفین کا سیٹ	[illegible]
علم اخلاق	نوابزادہ صلاح الدین	[illegible]
نوش انجام	مدیرہ ڈاکٹر شاہ شبیر	[illegible]
دیوان طباطبائی	طباطبائی	[illegible]
خواب کی دنیا	عبد المالک آروی	[illegible]
مضامین مالک	〃	[illegible]
شادی یا بیاہی پیار	توقیر مرزا	[illegible]
سرمایۂ نازش	نازش بلایانی	[illegible]
مشاطۂ سخن	صفدر مرزا پوری	[illegible]
فلسفۂ تعلیم اسلام	بخاری امام صاحب جامع دہلی	[illegible]
بانگ درا اقبال مع فرہنگ	ڈاکٹر اقبال	[illegible]
بال جبریل	〃	[illegible]
بہرام کا شکار	ندیم صہبائی فیروز آبادی	[illegible]
نقاب پوش بہرام	〃	[illegible]
حکم کی ملکہ	〃	[illegible]
معشوقہ مبارک	〃	[illegible]
فریب جمال	〃	[illegible]
نرگی کشمیر	〃	[illegible]
بہرام سلطانہ حصہ اول	〃	[illegible]
کالا شکاری حصہ دوم	〃	[illegible]
کالی بلا حصہ سوم	〃	[illegible]
کالی چڑیل حصہ چہارم	〃	[illegible]
بہرام مبارک	〃	[illegible]
بہرام پر جیلی کے حملے	〃	[illegible]
بہرام کی ڈائری	〃	[illegible]
بہرام کے ہم خوابی	〃	[illegible]
بہرام کی خوفناک آنکھیں	〃	[illegible]

ملنے کا پتہ:- عتیق الرحمان اینڈ سنز تاجران کتب چوک بھوپال

حافظ [illegible] الحق [illegible] پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس [illegible] سے چھپوا کر دفتر قومی لائبریری نئی دہلی سے شائع کیا۔

معمہ نمبر ۲ کے انعام پانیوالے خوش نصیبوں کی فہرست

پہلا انعام مبلغ سو روپیہ بالکل صحیح حل پر

آنسہ ساجدہ خاتون۔ امین آباد لکھنؤ۔

دوسرا انعام مبلغ ۷۵ روپے ایک غلطی پر فی کس پانچ روپیہ۔

گنیش پرشاد لاہور۔ جمیلہ خاتون کراچی۔ عطاء الرحمن آگرہ۔ جمال احمد کلکتہ۔ نسیمہ بیگم راولپنڈی۔ رام پرشاد۔ اٹاوہ۔ ابراہیم بمبئی۔ جمیل انصاری کانپور۔ سلطانی رامپور۔ زاہدہ بیگم پٹنہ۔ مقصود احمد دہلی۔ قمر جہاں بیگم (یو پی)۔ علی قلی خاں مدراس۔ زاہدہ ظفر الہ آباد۔ مرزا اقبال بیگ کوہاٹ۔

تیسرا انعام پچاس روپے ۲ غلطی پر فی کس ایک روپیہ پونے سات آنے

مشتاق احمد دہلی۔ اے ٹی سیف الدین سورت۔ مہر کرتار سنگھ۔ عزیز احمد۔ محمود دہلی۔ احسان احمد کانپور۔ محمد یوسف بمبئی۔ اقبال سنگھ کانپور۔ شاہد نظر احمد آباد۔ سورج بھان۔ منور بہاری گیا۔ جھانسی۔ بابو لال کلکتہ۔ جالندھر۔ عائشہ سلطانہ رام نگر۔ رفیعہ اقتدار دھولیہ۔ شمس الدین بدایوں۔ مقصود احمد چاٹگام۔ آر۔ آر۔ واسطی پلیپار۔ خان دولتانہ ساہیوال۔ معراج النساء ہوشنگ آباد۔ سی۔ جی نائڈو۔ اشک بہادر نگر۔ محمد مہدی بمبئی۔ باجی رفیقہ حبیب دہرہ دون۔ وجے کشور ماتھر بنگلور۔ حسرت برنی بلند شہر۔ الہ آباد۔ سید کلب حسین لکھنؤ۔ مریم زمانی حیدر آباد دکن۔ جی این آر۔ اے۔ بھیا فضل الدین انبالہ۔ کرم الہی۔

انعام خصوصی مبلغ ۲۵ روپے سب سے زائد حل پر!

حنفیہ اکبر حسین ناگپور (بارہ سال)

معمہ نمبر ۳ کا صحیح حل :- زر۔ عیش۔ نرم۔ ذہانت۔ رزق۔ بندوق۔ ناک۔

انعامی رقومات

۳۰ مارچ ۱۹۴۷ء تک ارسال کر دی جائیں گی۔ اگر ۳۰ مارچ کے ایک ہفتہ کے بعد تک انعام یافتگان کو رقوم نہ ملی ہوں تو براہ کرم دفتر کو فوراً مطلع فرمائیں۔

ایڈیٹر معمہ

قوم کا انعامی معمہ نمبر ۴

ڈھائی سو ۲۵۰ روپیہ کے نقد انعامات

پہلا انعام سو روپیہ۔ دوسرا انعام ۷۵ روپیہ۔ تیسرا انعام پچاس ۵۰ روپیہ

انعام خصوصی ۲۵ روپیہ (سب سے زائد حل بھیجنے والے کو)

قوم کے انعامی معمے ۱-۲-۳ جس قدر مقبول ہوئے وہ ہمارے لئے باعث مسرت ہیں۔ اب ہم معمہ ۴ نذر قارئین کرتے ہیں اس معمہ میں بھی متبادل الفاظ کی فہرست پیش کر دی گئی ہے۔ آپ ہر اشارہ پر کافی غور فرما کر ان ہی مجوزہ متبادل الفاظ میں سے چیدہ الفاظ منتخب کر کے صحیح حل مرتب فرمائیں۔ ہمارے محفوظ حل میں ان کے سلاوہ اور کوئی لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ فیس داخلہ ایک نام سے ایک حل کی ایک روپیہ اور تین حل کی فیس ایک ہی نام سے دو روپیہ۔ داخلہ کی آخری تاریخ ۲۵ را پریل ۱۹۴۷ء ہے۔

اشارات	نمونہ حل (حروف)	متبادل الفاظ
(۱) کسی کو سامنے دیکھکر "ان" کے چہرہ کا رنگ ـــــ ہو جاتا ہے۔	گ ل ا ب ی	شہابی۔ گلابی۔
(۲) عریاں نقش اور بازاری ادب بھی ہماری اخلاقی اور ـــــ پستی کا ذمہ دار ہے۔	س م ا ج ی	سیاسی۔ سماجی۔
(۳) اس میں انسان کیا نہیں کر گذرتا۔	ح م ا ق ت	خیانت۔ شرافت۔ حماقت۔ جہالت۔ ندامت۔
(۴) یہ ستاروں کی طرح معصوم جان ـــــ	ا ب ر و	آبرو۔ آرزو
(۵) بعض لوگ اپنے محبوب کو ـــــ زندگی بھی کہتے ہیں۔	ق ر ا ر	قرار۔ بہار
(۶) یہ مشہور ہے کہ ہندوستانی عورت انتہائی ـــــ ہوتی ہے۔	ح ی ا د ا ر	وفادار۔ حیادار
(۷) محبت کرنیوالا بعض اوقات اس سے بھی متاثر ہوتا ہے۔	گ/ت ل	گل۔ تل

معمہ حل کرنے سے پہلے اگلے صفحہ پر شرائط ضرور ملاحظہ فرما لیجئے۔

حل مطابق نمونہ نقشہ حل ارسال فرمایئے۔ اشارات کی عبارت اور متبادل الفاظ کے لکھنے کی ضرورت نہیں۔

داخلہ کی آخری تاریخ ۲۵ را پریل ۱۹۴۷ء

قواعد معمہ

۱۔ حلوں کے ہمراہ رسید منی آرڈر ضرور روانہ کیجیے۔ ٹکٹ یا پوسٹل سرٹیفکیٹ قابل قبول نہ ہوگا
۲۔ ۲۵ اپریل ۱۹۴۷ء کے بعد پہنچنے والے حل شامل نہیں ہونگے۔ اور اس کی وصول شدہ فیس معمہ نمبر ۵ کیلئے امانت رکھ لی جائیگی
۳۔ رستہ میں گم ہونیوالے یا تاخیر سے پہنچنے والے حلوں کا دفتر ذمہ دار نہ ہوگا
۴۔ ایک شخص خواہ کتنے ہی حل بھیجے اس کو انعام خصوصی کے علاوہ عمومی انعام میں سے ایک ہی انعام دیا جائے گا۔
۵۔ اگر حلوں کی تعداد مرسلہ فیس کے اعتبار سے زائد ہوئی تو ایڈیٹر معمہ کو اختیار حاصل ہوگا کہ کوئی زائد حل خارج کر دے۔
۶۔ مستحقین انعامات عمومی و خصوصی کی تعداد ایک سے زائد ہونے کی صورت میں رقوم انعامات بحصہ مساوی تقسیم کر دی جائینگی۔
۷۔ فہرست انعام یافتگان ماہ مئی ۱۹۴۷ء کے قوم میں شائع ہوگی۔ اور رقوم انعامات ۱۵ مئی ۱۹۴۷ء تک ارسال کر دی جائینگی۔
۸۔ مقامی حضرات اپنا حل اور فیس دفتر "قوم" میں دستی بھی دے سکتے ہیں۔
۹۔ صحیح حل اور جملہ امور سے متعلق ایڈیٹر کا ہر فیصلہ قانوناً اور ہر صورت میں ہر شریک معمہ کے لئے قابل قبول ہوگا۔
۱۰۔ حل علاوہ کوپن کے سادہ کاغذ پر بھی اس صورت میں قابل قبول ہو سکیں گے کہ ان کے ساتھ ایک کوپن شائع شدہ ہو۔
۱۱۔ کسی معمہ پر اگر وہ حل کے مطابق نہ ہو اور انعام نہ ملا ہو تو ایک روپیہ فیس کے ساتھ اس پر نظر ثانی کرائی جا سکتی ہے۔
۱۲۔ معمہ کے سلسلہ میں کسی خاص بارے میں خط وکتابت اس شرط پر کی جا سکتی ہے کہ جواب کیلئے لفافہ بھیجا جائے۔ غیر ضروری خطوط کا جواب نہیں دیا جائیگا
۱۳۔ جملہ خط وکتابت۔ حل اور رقوم کی ترسیل پتہ ذیل پر کی جائے۔

ایڈیٹر معمہ دفتر ماہنامہ "قوم" لائبریری روڈ دہلی

۱			ا	ب	ی		شہابی۔ گلابی
۲	س		ا		ی		سیاسی۔ سماجی
۳			ا		ت		نزاکت۔ شرافت۔ حماقت جہالت۔ ندامت
۴	ا			د			آبرو۔ آرزو
۵			ا	ر			قرار۔ بہار
۶			ا	د	ا	ر	وفادار۔ دنیادار
۷		ل					گل۔ تل

نام اور مکمل پتہ

آخری تاریخ داخلہ ۲۵ اپریل ۱۹۴۷ء

پوسٹل آرڈر یا ٹکٹ کسی صورت میں بھی قابل قبول نہ ہوں گے۔

۱	.	.	ا	ب	ی		شہابی۔ گلابی
۲	س		ا		ی		سیاسی۔ سماجی
۳			ا		ت		خجالت۔ شرافت۔ حماقت جہالت۔ ندامت
۴	آ	ـ	ر				آبرو۔ آرزو۔
۵			ا	ر			قرار۔ بہار
۶			ا	د	ا	ر	وفادار۔ حیادار
۷		ل					گل۔ تل

نام اور مکمل پتہ

جلد ۰ — شمارہ ۳

نگارشات

چندہ سالانہ : للعہ
فی پرچہ : ۶ر
قیمت سالنامہ ۱۲ر

سالنامہ قوم دہلی

ادارہ :-
انوار الحق حقی
سلمان الارشد فاروقی

نونہال کلب

انور حقی

اردو صحافت کا بحرانی دور

کاغذ کی کنٹرول کے زمانہ میں اردو صحافت جن مشکلات سے دوچار ہوئی ہے وہ ناقابلِ بیان ہیں اس نازک دور میں متعدد اخبارات ورسائل کاغذ نہ ملنے کی وجہ سے بند ہو گئے اور جو زندہ رہے وہ بھی اس طرح . . . . زندہ بدست مردہ حالانکہ اشاعت وآمدنی کے اعتبار سے یہ زمانہ بے حد شاندار رہا کیونکہ سینکڑوں کی تعداد میں چھپنے والے رسائل واخبارات کی اشاعت ہزاروں ہو گئی بلکہ بعض بعض تو لاکھ کی منزل کے قریب پہونچ گئے اور اشاعت کی اس ہمہ گیری کو دیکھکر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ جیسے ہندوستانی عوام اس نکتہ کو سمجھ گئے ہیں کہ زبان کی ترقی کے لئے اخبارات ورسائل کی سرپرستی ضروری ہے گو یہ دوسری بات ہے کہ ہم اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں اور نہ اس اشاعت کو ہم عوام کی ذہنی بیداری سے تعبیر کر سکتے ہیں کیونکہ جنگ کی برکات سے جہاں کچھ عرصہ کے لئے عوام کو بڑی دور تک اقتصادی ومعاشی مشکلات سے بے نیاز کر دیا تھا اس حد تک افراطِ زر کی وجہ سے ان عریاں اور فحش رسائل کی سرپرستی کی گئی جو جذباتِ اسفل کی تسکین کا ذریعہ تھے اور یہی وجہ ہے کہ پاکیزہ اور صحت مند ادب کے ترجمان رسائل پر اس زمانہ نے کوئی اثر نہیں ڈالا۔ انکی اشاعت بڑھی ضرور مگر بہت قلیل تعداد میں اور یہ اصولاً اس لئے بڑھنا چاہئے تھی کہ ان رجحانات کا نتیجہ تھی جو یہ پرچے پیش کر رہے تھے، رہا ان رسائل کی اشاعت کا سوال جو عوام کی ذہنیتوں کو مسموم کرکے ان کی جنسی بھوک تیز کرکے اپنا کیسہ بھر رہے ہیں تو اگر انکی تعداد ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں اور کروڑوں تک بھی پہونچ جائے تو اس سے اردو ادب کے وقار میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا اور پھر جب سے یہ اعلان ہوا ہے کہ کاغذ پر سے کنٹرول اٹھایا جا رہا ہے تو ہر بوالہوس حسن پرستی شعار کرکے آبروئے اہلِ نظر کو ضیاع میں کرنے کیلئے بیتاب نظر آرہا ہے۔ جہاں تک معیاری اخبارات ورسائل کے

قوم کا پیغام

اجراء کا سوال ہے ہم ان کو ملک وزبان کیلئے فالِ نیک سمجھتے ہیں مگر سوقیانہ وعامیانہ مذاق کے رسائل نہ صرف ہمارے بلکہ ہر بہی خواہ اردو کے لئے باعثِ اذیت ہیں اور اطلاعات اسی قسم کی موصول ہو رہی ہیں کہ عامیانہ مبتذل بازاری ذوق کے پرچوں کو بڑے طمطراق سے شائع کرنے کے پروگرام بنائے جا رہے ہیں تاکہ کوک شاسترانہ قسم کے ادب کی ترویج واشاعت کا فریضہ صحیح طور پر انجام پاتا رہے۔ ان رسائل کے اجراء سے ہم کو کوئی معاصرانہ حسد نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کی وجہ سے اچھے اور معیاری رسائل کو اشتہاری اعتبار سے شدید ترین نقصان پہنچ جائے گا۔ کیونکہ ابھی سے ان پرچوں کے مالکان نے اشتہاری فضا کو گندہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ گو ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس قسم کے پرچے دوچار اشاعتوں کے بعد خود اپنی موت آپ مر جائیں گے۔ مگر تجارتی ساکھ ہمیشہ یا ایک طویل عرصہ کے لئے ضرور بگڑ جائے گی، رہے وہ حضرات جو صحیح طریقہ سے کام کرنا چاہتے ہیں اُن کی خدمت میں ہمارا یہ مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ، کے بجائے اگر متحدہ طور پر لمیٹیڈ ادارے بنا کر اس کاروبار کو شروع کریں تو انفرادی سعی کے بجائے یہ اجتماعی کوشش زیادہ کامیاب ہوگی کیونکہ اس طرح نہ تو اُن کو مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا اور نہ ناتجربہ کاری کی بنا پر کسی نقصان سے دوچار ہونا پڑے گا بلکہ معیاری صحافت کا پاکیزہ نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ یہ سنجیدہ طریقہ سے زبان وادب کی صحیح خدمت بھی کر سکیں گے، ورنہ ظاہر ہے کہ اس بحرانی دور میں معمولی سرمایہ سے نکلنے والے رسائل اس مقابلہ کی دوڑ میں نہیں دوڑ سکیں گے کیونکہ ہر پرچہ ظاہری ومعنوی اعتبار سے ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کریگا اور زیادہ سے زیادہ رعنائیاں پیدا کرکے اپنی جگہ بنانے اور مقبولیت حاصل کرنے کی جدوجہد کریگا اس غلط تنافس کی وجہ سے جو شدید مقابلہ ہوگا اس سے نہ صرف نئے بلکہ پرانے رسائل واخبارات کو بھی شدید ترین نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے اسلئے ہمکو امید ہے کہ مستقبل میں ہمارے نئے ساتھی ہمارے مشورہ کی روشنی میں کوئی قدم اٹھائینگے، اسکے ساتھ ساتھ ہماری ایک التجا یہ بھی ہو کہ اشتہارات کے حصول کے سلسلہ میں جس گداگرانہ ذہنیت کا مظاہرہ کیا جارہا ہے اسے فوراً ختم کر دیا جائے۔ کیونکہ یہ نہ صرف ان کی بلکہ ہماری اور ہر خوددار صحافی کی توہین ہے۔

اداره

سنگِ میل

غلامی۔ افلاس، سماجی پستی اور بھوک ترقی پسند ادب زندگی کے ان ہی بنیادی مسائل سے ہم آہنگ ہے۔ چنانچہ خاص نمبر کے بعد سے ادارۂ قوم کا بھی یہی مطمح نظر ہے۔ اور وہ اس پر سختی سے عمل پیرا بھی۔ اس سلسلہ میں کس قدر دشواریاں پیش آئیں ان کے اظہار کی اس لئے چنداں ضرورت نہیں کہ ہر اصول کے لئے انسان کو کچھ قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ پھر ادارہ قوم اس سے کیونکر محفوظ رہ سکتا تھا۔ پالیسی کی اس تبدیلی سے بیگانے ہی خفا نہیں ہوئے۔ بلکہ اپنے بھی بگڑ گئے۔ لیکن یہ خفگی ہمارے اصولوں میں ذرا بھی لچک پیدا نہیں کر سکی۔ اور آج سالنامہ قوم پیش کرتے ہوئے ہم کو صرف اس لئے مسرت ہو رہی ہے کہ یہ اس دل کش خواب کی حسین تعبیر ہے جو ہم خاص نمبر کے بعد سے برابر دیکھ رہے تھے۔ تعبیر مکمل ہے یا نامکمل اس کا فیصلہ تو ہمارے مقابلہ میں آپ زیادہ بہتر کر سکیں گے لیکن اتنا کہنے میں ہم بھی کوئی باک محسوس نہیں کرتے کہ اس سالنامہ کو ایک مثالی حیثیت صرف اس لئے حاصل ہے کہ اس کے لکھنے والوں نے اپنے نام سے فائدہ اٹھانے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے بلکہ ہر فنکار نے حالات و واقعات کے سطحی مظاہرہ سے گذر کر ان کی اصلی حقیقت و ماہیت دریافت کرنے اور سمجھنے کی پوری پوری کوشش کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ سالنامہ کے نظم و نثر کے مصرعوں و جملوں کے پیچ و خم اور الفاظ کی بندشوں میں خونچکاں زندگی بھی مقید نظر آ رہی ہے اور دم توڑتی ہوئی انسانیت کی جانکنی کا منظر بھی دکھائی دے رہا ہے۔ کہیں طنز ہے تو کہیں لطیف مزاح مگر مقصد سب کا ایک ہی ہے۔ کسی کے یہاں فرار کا شائبہ نہیں۔ بلکہ ہر فن کار دنیا اور زندگی کے خلاف جہاد کرتے ہوئے خوش گوار مستقبل کو اپنانے کی کشمکش میں مصروف نظر آ رہا ہے۔ ماضی اور حال کی تلخیوں کے

دھندلکوں میں بھی ان کو امید کی ایک نئی جگمگاتی ہوئی کرن نظر آ رہی ہے۔ ایسی کرن! جو ان سوگواریوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ظلمتوں میں غائب کر دیگی۔ منظومات میں کتنی ہی روح فرسا چیخیں اور تلخیاں اشعار میں ڈھل کر صفحۂ قرطاس پر منتقل ہو گئی ہیں۔

ارشد تھانوی ہندوستان کے ممتاز استادوں میں سے ایک ہیں مگر وقت کے تقاضوں نے سب سے پہلے ان کو متاثر کیا اور بڑھاپے میں جوانی کے خون کی گرمی لے کر یہ میدان کارزار میں کود پڑے اور زمانہ کی دکھتی ہوئی رگوں پر بڑی سفاکی و بیدردی سے نشتر زنی کر کے اس متعفن زدہ پیپ اور خون کا تجزیہ کرنے کے بعد اس زمانہ کے بکھے ہوئے انسان نے نئے زمانہ کو تولا پرکھا اور پھر چیخ پڑا۔

جو راشی و خائن ہے وہی چین کرے ہے
مکاری و عیاری ہی دنیا کو بھرے ہے

اور... جو حسن و ضمیر اور دیانت کا ہے پابند
کولھو میں پلا کرتے ہیں اس کے زن و فرزند
سولی پہ لٹکنے کی مصیبت وہ بھرے ہے

چنانچہ **غلام ربانی تاباں** کی "تلخیوں" میں زندگی کی یہی اصلیتیں پوری طرح بے نقاب ہیں۔ ہر عزم ناکامی سے دوچار ہے کوئی سعی بر آور نہیں ہوتی بلکہ...... میں نے جو گیت بھی چھیڑا وہ فغاں بن کے رہا

اور......... میں نے جو راہ نکالی وہی مسدود ہوئی

"اور جو پھول چنا خار بداماں نکلا"

لیکن امنگوں کی یہ شکست اس کے احساس میں پسپائی پیدا نہیں کر سکی گو یہ ضرور ہے کہ وہ اس موقع پر

زیست تو زیست ہے اب موت کا ارماں بھی نہیں

کھکر کچھ دیر کے لئے مضمحل سا ہو گیا لیکن اس اضمحلالی کیفیت سے سوتا ہوا شاعر بیدار ہو گیا۔ اور گرد و پیش پر نگاہ ڈال کر وہ بے نیازی سے گنگنایا۔

زندگی لالہ و گل ہی تو نہیں خار بھی ہے لب خنداں نہ سہی دیدہ نمناک سہی

ادھر اقتصادی مجبوریاں دیہاتی بچہ کی معصوم ضدوں میں اُلجھ رہی ہیں ڈاکٹر شہرت بچہ اور خودداری کی نفسیاتی گتھیوں کو سلجھانے میں مصروف ہے۔ ایک باپ کے مجروح احساسات کی لرزتی ہوئی آواز اور آنسوؤں کی تھرتھراہٹ ان اشعار میں بھی نظر آ رہی ہے۔

ان کھلونوں کا خدا کے لئے بیمار نہ بن
جن کو میں لے نہ سکوں ان کا خریدار نہ بن
ایک تماشا سا سر کوچہ و بازار نہ بن
——— دیکھ لیا کہتی ہے تجھ سے میری شرمندہ نظر

مگر اس شرمندہ نظر کے باوجود جب بچہ
کہیں انگور کے خوشے کہیں شربت کے گلاس
دیکھتا ہے تو اسے
"مسکراتے ہوئے ظرفے کہیں ہنستی ہوئی پیاس"

کا خیال آجاتا ہے۔ اشکوں کی روانی معصوم جذبات کی موت کا اعلان کرتی نظر آتی ہے۔ ایک باپ کا دل اُن آنسوؤں کو کیسے برداشت کر سکتا مگر الفاظ کے علاوہ دوسرا سرمایہ ہی کہاں ہے۔ اس لئے پھر بھینچے ہوئے الفاظ کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے نکل پڑتے ہیں۔

مجھ سے دیکھے نہیں جاتے یہ ترے دیدۂ تر
ضد نہ کر اے مرے معصوم مرے لخت جگر

لیکن نہ دیکھنے کے باوجود ان آنسوؤں کو دیکھنا پڑتا ہے۔ یہ ہندوستان ہے جہاں کی پیاسی دھرتی ایسے لاکھوں اور کروڑوں انمول آنسوؤں کو اپنے سینے میں جذب کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔

دھرتی کی اس سی لامحدود وسعت میں ان گنت گاؤں بھی بکھرے پڑے ہیں۔ ایسے گاؤں جہاں پر ابھی تک معصومیت کا دور دورہ ہے۔ جہاں کے باسیوں پر اب تک شہر کے فریب کا ملمع نہیں چڑھا۔ قتیل شفائی دیس کے ان ہی حسین خطوں کی معصومیت کی تصویر کشی اچھی طرح کر رہا ہے۔ پوری نظم پائل کی لطیف جھنکار کی طرح سامع نواز ہے۔ سادہ الفاظ کے انتخاب سے پوری نظم میں گاؤں کی سی سادگی پیدا ہو گئی ہے۔ پائل کی اس جھنکار میں نغمگی ہے لیکن مقبول حسین احمد پوری کا "نوحہ" مسلسل نوحہ ہے مٹ جانے والی زندگی کا۔ بیتاب فطرت شاعر حقائق سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ اس کے سوچنے کا ڈھنگ نرالا ہے جبھی تو وہ یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہو گیا کہ ؎

خاک نے ڈھالا جسم کا ڈھانچہ رعنائی اور شان لئے
مٹ کے رہا سب حسن و کرشمہ اپنا نقش و نشان لئے
کیا یہ جلوے کیا یہ آنکھیں' یہ فانی وہ خوابی پیکر
کیسے قرار و بقا یاں ہمدم ہیں موہوم یہ سارے منظر

مگر احمد ندیم قاسمی فانی پیکروں کے دھڑکتے ہوئے دلوں کے حسین اتصال سے شباب و جوانی کا ایک لطیف سنگم بنا رہا ہے۔ ایسا سنگم جس کو دیکھ کر قدرتی طور پر خود فراموشی کی سی کیفیت پیدا ہو جائے۔ ادھر مبکش حیدرآبادی اس منظر سے متاثر ہوئے بغیر اپنی منزل کی طرف پہنچنے کے لئے بیتاب ہے۔ ہر صبح اس کے لئے پیام نو لاکر اس کے عزائم میں نئی روح دوڑا رہی ہے۔ وہ دشوار گذار گھاٹیوں یا تھکا دینے والی مسافت سے ہراساں نہیں کیونکہ ———

منزل کی طرف بڑھنے والا کیا سوچیگا کیوں جلنے لگا
آبلے ننگے تلوؤں پر کب آئے اور کب پھوٹ گئے ———

اور اسی لئے ———

بڑھتے قدموں نے دیکھا ہے اس دھندلی دھندلی سرحد پر
کچھ زندہ کرنیں ساتھ ہوئیں کچھ مردہ سائے چھوٹ گئے

مگر آغا سرخوش قزلباش حال کی بے کیفیوں سے نڈھال ہے۔ مستقبل کی یہ درخشانیاں اس کی نگاہوں کو خیرہ نہیں کرتیں۔ اس لئے کہ ....

یوں گذر جاتا ہے ہر رنگین منظر پے بہ پے
جس طرح ہر شئے کو دیکھے کوئی چشم خواب سے

چنانچہ ....

ولولوں کے قلب میں جوش جوانی کو لجا
زندگی کی نبض کا بھی تو نہیں ملتا پتا

اس طرف ساحر قدوائی حال پر ناقدانہ نظر ڈالتا ہوا گذر

رہا ہے اضطراب اس نے

بھٹکتے ہوئے شہروں کے گلی کوچوں میں
کتنی تہذیب کی سڑتی ہوئی لاشیں پائیں
کتنے تابندہ و مہتاب نما ہاتھوں پر
غم و اندوہ کی پرسوز خراشیں پائیں

تو وہ تڑپ کر یہ کہنے پر مجبور ہو گیا ——

خالق کون و مکاں تھا در پیست و بلند
تیری دنیا کو بہت غور سے دیکھا لیکن
مجھ کو ہر شے میں کسی شے کی کمی نظر آئی

اثر جلیلی بھی زمانہ کی بے وفائی سے کافی متاثر ہے کیونکہ

ایک یاس بے نہایت و اک رنج بے کنار
افسانۂ حیات کا عنواں ہے ان دنوں
اور —— کیا پوچھتا ہے مشغلہ ہائے اثر ندیم
معروف شکوۂ غم دوراں ہے ان دنوں

یہ دن کبھی بدلیں گے بھی یا زندگی اسی طرح یاس و نامحرومیوں کا شکار رہے گی ..... !

اسد بھوپالی کی رائے میں

تاریک شب نمود سحر کے قریب ہے

کیونکہ مظلوم زندگی کا لہو رقص میں ہے آج اسی شب کی صبح کا **اشعر ملیح آبادی** کو بھی انتظار ہے جبھی تو وہ

"سلوٹیں سوچ کی ڈالے ہوئے پیشانی پر"

بیٹھا ہوا بڑبڑا رہا ہے۔

سلوٹیں ہیں مرے ماتھے کی تفکر کا نشان
آتش زیست کے بھڑکے ہوئے شعلوں کا دھواں

کیوں؟ —— صرف اس لئے کہ ——

مجھ سے دیکھے نہیں جاتے یہ زمانے کے چلن
سوچتا ہوں کہ بدل جائے یہ فرسودہ نظام
اور اس رات کی تابندہ سحر سے پھوٹے
مسکراتی ہوئی ہنستی ہوئی ایک سرخ کرن

لیکن **منظور احمد** اس وقت اس ذہنی مریض کو سمجھانے میں مصروف ہے جو دواؤں سے اچھا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ ان مریضوں میں سے ہے جو سوسائٹی کے قواعد، اخلاقی قیود اور ماحول کی بندشوں کی وجہ سے اپنی خواہشات کو کبھی تکمیل کی اجازت نہیں دے سکا۔ فرائڈ کے نظریہ کے مطابق اسی موقعہ پر ذہن لاشعور وجود میں آتا ہے۔ کیونکہ سوسائٹی ان خواہشات کو نہ تو فنا کر سکتی ہے نہ دبا سکتی ہے۔ اس لئے ذہنی قوتیں اس کام میں مصروف ہو جاتی ہیں اور یہی مصروفیت ان کو بیمار کر کے آہستہ آہستہ منتشر اور پراگندہ کر دیتی ہے۔ ماہرین نفسیات کی رائے میں انسان کو اپنی بیمار اور کچلی ہوئی تمناؤں کا کسی نہ کسی طرح اظہار کرتے رہنا چاہیئے۔ تاکہ اپاہج اور مفلوج اُمیدوں کی سڑاند ذہنی صلاحیتوں کو برباد نہ کر دے اسی اصول کے پیش نظر تو منظور کہہ رہا ہے ؎

دل کے رازوں کو چھپانے سے تو حاصل نہیں ہو گا کچھ بھی
یہ تو ظاہر ہے کہ اظہار سے انگشت نمائی ہو گی
تو پھر —— کچھ بھی ہو ان کو کچلنا تو نہیں ہے ممکن
یہ تیرے ذہن کو لگ جاتے ہیں دیمک بن کر

پس —— ناامیدی کی اس وادیٔ تاریک سے بچنے کے لئے
اپنے احساس سے دنیا کو منور کر دے

چنانچہ حیدرآباد کے نوجوان شاعر **سلیمان اریب** نے دل کی گڑگڑاہٹ اور بے ہنگم شور میں ایک نازک دل کی جو دھڑکن سنی تھی اُسے اپنی نظم "نشیب" میں سمو دیا ہے اور یہ معصوم دھڑکن ہر مصرعے میں اس نزاکت سے برابر دھڑکتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ **الطاف مشہدی** ان دھڑکنوں سے بے نیاز "اپنوں کی حکومت" کے حسین تصور میں کھویا ہوا ہے۔ غلامی اور محکومی کے استبدادی دور سے نجات کا ایک ایسا خواب جو ذہنی تعطل کے باوجود آج کا نوجوان اس یقین کے ساتھ دیکھ رہا ہے کہ بہ شرمندہ تعبیر ہو گا الطاف کا نرالا انداز بیان اس نظم میں بھی اپنے انفرادی خلوص کے ساتھ موجود ہے خوابوں کے ان جزیروں میں **موج علیگ** کی للکار بھی گونج رہی ہے۔

ابھی احساس کی قندیل جلی رہنے دے
ابھی کچھ اور سنور نے دے شکستوں کا گداز
ابھی بہتے ہیں یہ آنسو تو انہیں بہنے دے

اس لئے کہ

تو اکیلا تو مسرت سے نہیں جی سکتا
اپنے ہمسایوں کے آنسو تو نہیں پی سکتا

آج کے زندہ شاعر کی وسعت نظر اور وسعت دل کا اندازہ اس نظم سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

اشعار میں ڈھلی ہوئی ٹیسوں اور سسکیوں کے بعد افسانوں میں ان ڈھکے چھپے ناسوروں پر نظر ڈالئے کس قدر گہرے ہیں یہ زخم جنہوں نے ہزاروں جسموں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔

"خدا سائنس کی ترقیوں کو سلامت رکھے نئے نئے امراض ظہور میں آتے رہتے ہیں۔ ہمارے بزرگوں نے بلڈ پریشر اور ٹائیفائیڈ قسم کے نام کاہے کو سنے ہونگے۔"

"اسی قسم کے ایک وبائی مرض کا نام فلمریا بھی ہے۔ اس نام پر چونکنے کا حق اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب یہ ثابت ہو جائے کہ آپ ملیریا یا ٹائیفائیڈ کے ناموں پر چونکے تھے۔ جس طرح وہ امراض جدید سائنس کے تحائف ہیں اسی طرح یہ مرض بھی ہندوستان میں پھیل رہا ہے۔"

مگر اس مرض کی تحقیقات کا سہرا ہندوستان کے سب سے بڑے مزاح نگار **شوکت تھانوی** کے سر ہے جو زندگی کی تلخیوں کو قہقہوں کے سانچے میں ڈھالتا ہے یہ حساس فنکار ہماری معاشرتی کمزوریوں کو اپنے ذہن کی بھٹی میں پگھلا کر اس طرح پیش کرتا ہے کہ ہم بلبلا اٹھتے ہیں اور اگر غور کریں تو بیساختہ قہقہے دراصل ہماری اسی بلبلاہٹ کی دوسری شکل ہیں۔ شوکت کی تحریروں میں سچا خلوص اور معاشرتی انقلاب کی بیتابی پوری طاقت سے موجود ہے مگر کھوکھلے قہقہے بلند کرنیوالے اس پر غور کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتے۔ "فلمریا" میں بھی ہندوستانی نوجوانوں کی فلمی مریضانہ ذہنیت پر شوکت تھانوی نے بڑے دلکش انداز میں طنز کر کے ہمارے لاشعور میں دبی ہوئی فلمی خواہشات کو بے نقاب کر دیا ہے۔ کالج کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اگر ایکٹر و ایکٹرس بننے کے حسین خوابوں میں الجھے ہوئے ہیں تو دوسری طرف ممتاز ادیب و شاعر اور صحافی مکالمہ نویس۔ نثر نگار اور ہدایت کاری کے حسین تصور میں کھوئے ہوئے ہیں۔ اگر صوبجاتی تعصب سے اپنے کو بلند کر لیا جائے تو یقیناً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شوکت تھانوی کی مزاح نگاری ترقی پسند ادب میں نشان منزل کی حیثیت رکھتی ہے۔

وجاہت سندیلوی۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ گو وجاہت کی وکالت نے اردو کے ایک ممتاز افسانہ نگار کو ہم سے چھین لیا ہے۔ پھر بھی جب یہ افسانہ نگار وکیل کی قید سے چھٹکارا پاتا ہے تو "پھپھی خالہ" جیسے افسانہ کی تخلیق ہو جاتی ہے پھپھی خالہ متوسط طبقہ کی دردناک زندگی کا ایک ایسا مرقع ہے جس کو بنانے میں آرٹسٹ نے اپنی پوری فنکارانہ مہارت صرف کر دی ہے۔

"..... آج ہر متوسط طبقہ کے گھر میں پھپھی خالہ کے جیسے اور خالے نظر آتے ہیں۔ لڑکیاں کیا ہیں! کچلی ہوئی روحوں اور مسلے ہوئے جذبات کی زندہ نعشیں"

صرف عصمت آپی کا جابرانہ ڈھونگ رچانے کے لئے ان معصوموں پر بیجا سختیاں کی جاتی ہیں اور اسی لئے ....

"...... ہماری معاشرت میں لڑکے اور لڑکی کے درمیان ایسا مصنوعی اور غیر فطری ماحول قائم کیا جاتا ہے کہ لڑکی لڑکے کو ہمیشہ چور اور لڑکا لڑکی کو ہمیشہ چرائی جانے والی چیز تصور کرتا رہتا ہے۔ یہ ماحول قائم اسی لئے کیا گیا ہے کہ چوری نہ ہو لیکن درحقیقت چوری روکنا تو درکنار یہ تو چوری کرنے اور چوری ہو جانے کے لئے اور بھی ورغلاتا ہے" خارجی ماحول اور داخلی احساس کے مطابق اور ہم آہنگی کی وجہ سے اس افسانہ کو وجاہت کے دوسرے افسانوں کے مقابلہ میں شاہکار کی حیثیت حاصل ہے۔

ایک بوڑھا ایک جوان ایک عورت اور چار ننھے بچے یہ ہیں پریم ناتھ پردیسی کے افسانے سچی کے کردار جنت نظیر کشمیر کے وہ انسان جو حیوانوں سے زیادہ بدتر زندگی گذارنے پر مجبور ہیں۔ قدرت کی بنائی ہوئی اس چھوٹی سی جنت کے اندر انسانوں کا بنایا ہوا ایک وسیع جہنم بھی ہے۔ ایسا جہنم جس کے اندر انسانی ہڈیاں سلگ سلگ کر چیخ رہی ہیں جہاں تعفن کی مارے ناک دینا بھی دشوار ہے اسی لئے کوئی اس طرف نگاہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ کرشن چندر اور رامانند ساگر کے بعد پردیسی تیسرا شخص ہے جس نے اس جہنم کی مکروہ اور خوفناک تصاویر پیش کیں کیونکہ وہ خود اس جہنم کا ایک فرد ہے۔ اسی لئے اس کے افسانے اس زندگی کی صحیح نمائندگی کرتے ہیں جہنمی انسان بھی پاکیزہ دل رکھتے ہیں۔ مگر دنیا کہتی ہے کہ یہ بدمعاش ہیں لٹیرے ہیں۔ یہ دوسروں کے

عمر والوں کو مات دیتے ہیں لیکن یہ دیسی کہتا ہے کہ ہوتے زرد چہرے اور بے نور آنکھوں والے ایک جنبی انسان کو دیکھ کر۔

وہ ...... مجھے محسوس ہوا جیسے دنیا کا عظیم ترین سخی میرے سامنے کھڑا ہے اور تمام دنیا کی جاہ طلب سخاوت اپنی سخاوت سے پامال ہو گئی ہو۔

کوثر چاندپوری اردو کے پرانے افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں مگر حالات کے ساتھ ساتھ کوثر کا انداز نگارش بدلتا جا رہا ہے جذبات اور مصنوعی اخلاقیات اب اُن کے افسانوں سے کوسوں دور ہو گیا ہے پرانی قدروں کا صحیح شعور رکھنے کے باوجود نئی قدروں کی تخلیق کا جذبہ ان کے تازہ افسانوں میں بڑی حد تک موجود ہے۔ "بے معنی جوان" کوثر کا ایک ایسا افسانہ ہے جس کو مثالی حیثیت سے ان رجعت پسندوں کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے۔ جو ابھی تک ترقی پسند ادب سے نہ جانے کیوں بغض رکھتے ہیں۔

انجم صہبائی کا زنداں ایک نفسیاتی تجزیہ ہے جس میں معاشرت کی ویرانی اور ہماری زنجیروں میں جکڑی ہوئی ایک معصوم روح کی ذہنی تلملاہٹ کو پیش کیا گیا ہے۔ انجم صہبائی کی موجودہ ماحول سے بیزاری اور جھنجھلاہٹ پورے افسانے میں بکھری نظر آتی ہے۔ اس نوجوان افسانہ نگار کا مستقبل بیحد تابناک ہے۔

اشتیاق عارف دنیائے ادب میں نووارد نہیں ہیں سننے والے کانوں میں اشتیاق مرحوم کے انسانوں کی صدائے بازگشت ابھی تک گونج رہی ہے مرحوم کی عارف سے تبدیلی پہلی مرتبہ قوم کے ذریعہ ہو رہی ہے۔ انتشار میں اس نوجوان افسانہ نگار نے مسائل حاضرہ کی شدید ناقابل گرفت الجھنوں پر بڑے تلخ لہجہ میں طنز کیا ہے۔ تلخیٔ احساس کے باوجود لفظوں کے دوش پر آرزوؤں اور تمناؤں کے بے شمار جنازے کانپتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ "کہتے ہیں جس کو عشق" **عمران الارشد** کا ایک طویل افسانہ ہے۔ زندگی یہ بھی تو ہے۔ عمران الفاظ کی سادگی میں مطلب کی بڑی بڑی باتیں بڑی معصومیت سے کہہ جاتا ہے۔ اس کا انداز واعظانہ ہو اور خطیبانہ نہیں ہے وہ ہنستی مسکراتی روتی بسورتی زندگی کو اپنے اصلی روپ میں پیش کر دیتا ہے۔ نہ وہ الفاظ کا سہارا لینا جانتا ہے نہ اس کے یہاں آرائش کی دیویاں ہیں نہ وہ انسان کو ابھی شیطان

ہے۔ اس لئے اس کے انسانوں میں ایک خاص سکون ہوتا ہے۔ اور انداز بیان کی یہ سادگی قاری کے ذہن کو بیحد متاثر کرتی ہے۔ اس افسانہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں جذبات اور احساس کی شدت کو اس طرح سے ہم آہنگ کیا گیا ہے کہ مرکزی خیال کمزور ہونے کے بجائے اور زیادہ واضح ہو گیا ہے۔

انجم سلمانی ابراہیم جلیس کی طرح اپنے عقائد کا سختی سے پابند ہے اس کے ہر افسانے میں اس کے نظریات جھلکتے رہتے ہیں چنانچہ جلوس میں بھی اس کا اشتراکی نقطہ نظر عیاں ہے۔ انجم کی انقلاب آفریں ترقی اسے مستقبل قریب کا بہت بڑا افسانہ نگار بناتی نظر آ رہی ہے۔

قمر جمالی کا مرکز رومان کی لطیف ترین چاشنی میں سمویا ہوا ہے۔ امرین آپا کی متانت اور سنجیدگی بھی عورت کے دل کی ان معصوم دھڑکنوں کو نہیں چھپا سکی۔ جو وہ اپنے سے بھی چھپانا چاہتی تھیں۔ قمر اس افسانہ میں ممتاز مفتی سے کافی متاثر نظر آ رہا ہے۔ لیکن اس تاثر نے اس کی مخصوص انفرادیت کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا۔ بلکہ اس سے افسانے میں ایک خاص قسم کا تنوع پیدا ہو گیا ہے۔

ابراہیم یوسف کا ڈرامہ ننھا مجاہد ڈرامائی کیفیتوں کا حامل ہے ابراہیم یوسف ترقی پسند ادب میں ڈرامائی عنصر کی کمی کو بڑی ہوشیاری اور چابکدستی سے پورا کر رہا ہے۔ فنی قیود اور جدید رجحانات کو ڈرامہ میں ملحوظ رکھنا اس کی فنی پختگی کی دلیل ہے۔ ہماری رائے میں ترقی پسند ادب میں ڈرامہ کی کمی کو پورا کرنے میں ابراہیم یوسف کا بہت بڑا حصہ ہے۔

...... مقالے سیاسی بھی ہیں اور معاشرتی بھی۔ تاریخی مواد بھی ہے اور معاشی تحقیقات بھی۔

"۴۶ء کا معاشی پس منظر" **محمد احمد سبزواری** کا ایک معاشی مقالہ ہے۔ جس میں ۴۶ء کے معاشی و اقتصادی حالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ معاشی مضامین کے سلسلہ میں سبزواری کو اپنے دوسرے ہم عصروں میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔

ابوسعید بزمی ہندوستان کے ان بلند پایہ صحافیوں میں سے ایک ہیں جنکی شخصیت صحافتی حلقوں میں مسلم الثبوت تسلیم کی جا چکی ہے بزمی کے سیاسی مقالے اپنی اہمیت و افادیت کے اعتبار سے سیاسی

ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ مختصر مقالہ بھی مسلمانوں کے سیاسی شعور کو بیدار کرنے میں بڑی حد تک ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

حیدرآباد کے نوجوان ترقی پسند نقاد **حسینی شاہد** کا مقالہ "ادب کیا ہے"؟ اپنی اہمیت کے اعتبار سے بے حد مفید ہے۔ اس نوجوان نقاد نے ادب کی نئی اور پرانی قدروں کا بڑی خوبصورتی سے تجزیہ کر کے ادب کی ارتقائی ہیئت پر نئے انداز سے روشنی ڈالی ہے۔

"ایک طرف روحانی دلپذیر و دلنشین مقاصد و نتائج ہیں۔ دوسری طرف عصرِ حاضر کے نظر فریب مناظر و مظاہر غرضیکہ ایک تہذیب میں مذہبی روح کی اساس پر معاشرت کو قائم کیا گیا ہے۔ دوسری جانب ملحدانہ لادینی نظریات پر مذہب کا ڈھانچا تیار کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے اس وقت ہمارا ملک دو تہذیبوں کی چکی کے پاٹ میں آ گیا ہے۔" اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ معاشرت کا نیا ایوان کن بنیادوں پر تعمیر ہوگا؟ **وجدی الحسینی** نے اپنے اس معاشرتی مقالہ تمدنی بحران میں اسی مسئلہ پر بحث کی ہے۔ وجدی کے معاشرتی مقالوں کی جامعیت اب مسلمہ بن چکی ہے اور اسی لئے سنجیدہ طبقہ اس کے مقالوں کا متمنی رہتا ہے۔ "خود اپنے قلم سے" ہمارا نیا مستقل عنوان ہے جس کے ماتحت ہندوستان کے ترقی پسند فنکار اپنے حالاتِ زندگی اور نمونہ تحریر کے ساتھ ساتھ اپنے نظریہ ادب بھی پیش کرینگے۔ اس بار **جاں نثار اختر** کے حالاتِ زندگی اور نمونہ کلام پیش ہے۔ ادبی اعتبار سے موجودہ دور کی یہ ایک ایسی ادبی مبسوط تاریخ ہو گی جس پر کل کے مورخ کو کسی قسم کے شک و شبہ یا اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔

ہمارا تمدن اور اس کا تحفظ **ضبط ایم اے** کا ایک اہم مقالہ ہے جس میں اسلامی تعلیمات و روایات کو بڑی خوبصورتی سے پیش کر کے اس کی روشنی میں اپنے تمدن و تہذیب کو محفوظ رکھنے کے لئے نئے انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ اسلامی کلچر و تہذیب کی بلندی کا تو اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ آج کی دنیا کی مہذب متمدن قومیں اس کے خوشہ چیں رہ چکی ہیں۔ ایسے اہم موضوع پر ضبط نے جس سلیقہ و احتیاط سے قلم فرسائی کی ہے وہ ان کی پختگی نگارش کا زندہ ثبوت ہے۔

دردِ مستقل

آغا سرخوش قزلباش

مضمحل ایسا کیا ہے گردشِ ایام نے
دھند سی چھائی ہوئی ہے اب نظر کے سامنے

ڈھل چلی یوں زندگی بے کیفیوں کے روپ میں
جس طرح کمہلائیں غنچے گرمیوں کی دھوپ میں

اک سکوتِ بے محل ہے، اک مسلسل خامشی
جس طرح سے شام کو کھیتوں کی گونگی زندگی

دل پریشاں، روح مضطر، ذہن میں اک انقلاب
سوگوارِ آرزو، دم توڑتا لطفِ شباب

الجھی الجھی سی عجب بے ربط بہکی گفتگو
روح سے نا آشنا احساسِ عزمِ جستجو

یوں گزر جاتا ہے ہر رنگین منظر پر بے
جس طرح ہر شے کو دیکھے کوئی چشمِ خواب سے

بے حسی کے رنگ میں چھانے لگی افسردگی
کچھ عجب ویران سے ماحول میں ہے زندگی

ولولوں کے قلب میں جوشِ جوانی تو کجا
زندگی کی نبض کا بھی تو نہیں ملتا پتا

کر سکے تو چاہتا ہوں اے نگاہِ زخم ساز
دل کو لطفِ خاص سے اپنے بنا نشتر نواز

اک خلش پھر چاہتا ہوں زندگی کے واسطے
اور خلش کیسی مسلسل ٹیس ہونی چاہیئے

درد ہی آغاز ہے اور درد ہی انجام ہے
زندگی تو ایک دردِ مستقل کا نام ہے

چٹکیاں

چٹکی ساز

مسٹر کے ایل گابا کے مشرف بہ اسلام ہونیکے بعد آپ کے نام کے اختصاری حروف میں کوئی تبدیلی نہ دیکھ کر ہمارے عقل گھوڑے پر ایک ہلکا سا چابک پڑا تھا۔ لیکن آج ہم آپ کو ایک ایسا واقعہ سناتے ہیں اور سناتے ہی نہیں بلکہ چشم خود دکھاتے ہیں جس نے اس اسپ تازی کی کمر ایک ہی ہنٹر سے سرخ کر دی ہے۔ سنہ ۴۵ء میں صوبہ بہار کے ضلع پٹنہ کے گاؤں دیرہ سے 'قوم' کو ایک ایسے افسانہ نگار کی قلمی اعانت کا شرف حاصل ہوا تھا جس کو افسانہ نگار ہونیکے علاوہ صاحب کرامت ہونیکا بھی فخر حاصل تھا۔ اس بزرگ صفت نوجوان کو قدرت کا خاص عطیہ یہ تھا کہ ہر جمعرات کی رات کو جب بستر استراحت پر یہ آنکھیں بند کرے تو پھر جنسی تبدیلی کے ساتھ بیدار ہو۔ مدیر 'قوم' کے نام یکے بعد دیگرے تین خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عجیب و غریب ہستی ۸ دسمبر سنہ ۴۵ء کو ایک ترقی پسند افسانہ نگار تھی اور ۱۵ دسمبر کو آسی طرز نگارش کا افسانہ نگار اور پھر ۲۲ دسمبر کو ایک نازک خیال شاعرہ۔ ..... قلم کی احتیاط اور ہاتھ کی صفائی کے علاوہ مدیر 'قوم' کو حالات سے لاعلم رکھنے کا بڑا سبب نام کے اختصاری حروف تھے یعنی م۔ع۔ ان دونوں حروف میں یہ خوبی تھی کہ بغیر اپنی ہیئت کذائی بدلے مسٹر گابا کے کندن لال اور خالد لطیف کی طرح ممتاز عصمت بھی بن جاتے تھے اور محمود عالم بھی۔

مدیر 'قوم' کی طرف سے تصویر کے مطالبہ پر ۸ دسمبر کو ارشاد ہوا:۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ آپکی فرمائش کا کیا جواب دوں کیونکہ تصویر کے مطالبہ کو آسانی کے ساتھ ٹال دینے کی جرأت ہوتے ہوئے بھی میں اپنے آپ کو معذور پاتی ہوں۔ 'ممتاز عصمت' اور اس کے بعد ۱۵ دسمبر کو:۔ حسب فرمائش تصویر ارسال کر رہا ہوں۔ وصول فرمائیں۔ 'محمود عالم' اور پھر ۲۲ دسمبر کو ایک غزل کیساتھ 'ممتاز عصمت' لیکن جب اس سلسلہ میں بدولت نے جاسوسی فرمائی تو اس پراسرار خاتون نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے اور کہا :۔ "ایسا بھی ہوتا ہے اس زمانے میں"

اب اس سلسلہ میں مدیر 'قوم' نے چٹکی ساز کی اس درخواست کو منظور فرما لیا ہے کہ اس باکرامت خاتون کی وہ تصویر سالنامہ میں شائع کر دیں جو کیمرہ کی آنکھ نے ان دنوں کھینچی تھی جب کہ یہ مرد تھا۔

مدیر۔ مدیر اعلیٰ۔ مدیر مسئول۔ مدیر اعزازی ایڈیٹر وغیرہ یہ سب قسمیں تو آپ نے پڑھی سنی اور دیکھی ہونگی لیکن بالذات آج ان قسموں میں ایک کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں یعنی .. 'مدیر محفوظ' .... ہماری لغت میں اس کے معنی ہیں ایک ایسا کمینی قسم کا انسان جو شہرت و عزت سے بے نیاز ہو کر خدمت خلق میں ہمہ تن مصروف رہے۔ یہ قلم گھسے اور نام کسی کا چلے۔ اسے شہر میں بھی کوئی نہ جانتا ہو اور یہ تصورات کی دنیا میں دنیا پر حکومت کرتا ہو قلم کی نشتری نوک سے سنان و تیر کا کام لیتا ہو۔

پچھلے دنوں راقم الحروف کا ایک 'مدیر محفوظ' کے ساتھ چاندنی چوک کی سیر کا پروگرام طے ہوا۔ قطب روڈ سے ٹرام پر سوار ہوئے لیکن رش اس درجہ تھا کہ فٹ بورڈ سے آگے رسائی نہ ہوسکی۔ اور فٹ بورڈ بغیر ٹکٹ سفر کرنیوالوں کے سلسلہ میں بدنام ہے۔ اتفاق سے اُس ٹرام کا کنڈکٹر ہماری بدولت سے واقف تھا۔ اس نے جونہی ہمیں دیکھا تو ہمارے لئے جگہ کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن ہم نے اُسکی نظر پڑتے ہی ایک قسم کی شرمندگی محسوس کی اور فوراً اُتر گئے۔ ایک لمحہ بعد ہمارے ساتھی بھی اُتر گئے۔ مگر قبل اسکے کہ ہمارے ساتھی ٹرام کا ہینڈل چھوڑیں کنڈکٹر کی مشکوک نظر موصوف کو مفت خور الیقین کر چکی تھی ..... بس چشم زدن میں ایک چانٹا پڑ گیا لیکن ذرا آہستہ ہوا اس لئے لگا کہ ہینڈل چھوڑنے اور چانٹا رسید کرنیکا ارادہ ایک ہی لمحہ میں ہوا تھا۔ بلکہ ابھی ختم نہیں ہوئی جب ٹرام تقریباً دو ڈھائی سو قدم کا فاصلہ طے کر چکی تو ایک ستم ظریف نے ان حضرت کو اس بارے میں مطعون کیا ..... تو پہلے گال سہلاتے ہوئے آپ نے فرمایا "ہاں یار کچھ محسوس ہوا تھا لیکن میں تو سمجھا تھا یونہی کسی کا ہاتھ لگ گیا ہے لیکن ..... لیکن اچھا اسکی ایسی کی تیسی یکبارگی بھاگ پڑے مگر ٹرام .... ہاتھ آئی تھی نہ آئی بھاگتے بھاگتے جب سانس پھول گیا تو دانت پیس کر فرمانے لگے۔ "اچھا بچہ جی ..... ٹرام نمبر .... چھبیس"

پروفیسر جاں نثار اختر ایم۔اے

خود اپنے قلم سے

آپ حالات دریافت کرتے ہیں تو سُنیئے !

پیدائش میری ۱۹۱۴ء کی ہے۔ ابتدائی تعلیم لشکر گوالیار ہی میں ہوئی بعدازیں علی گڑھ کالج اور علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی وہیں سے ایم۔ اے پاس کیا اور اب وکٹوریہ کالج گوالیار میں اُردو لکچرار کی حیثیت سے کام کرتا ہوں علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں مختلف ادبی خدمات بھی انجام دیتا رہا۔ انجمن اردوئے معلٰی اور انجمن حدیقۃ الشعرا کا سکریٹری رہا اور علی گڑھ یونیورسٹی میگزین کی ادارت بھی میرے سپرد رہی۔

شاعری کا ذوق ورثتاً ملا لیکن مری شاعری علی گڑھ کے ماحول میں پروان چڑھی۔ ابتداً صرف غزلیں کہتا تھا پھر نظم کی طرف طبیعت مائل ہوگئی چنانچہ اب زیادہ تر نظمیں ہی کہتا ہوں۔

شاعری کے متعلق میرا نظریہ کیا ہے؟ شاعری میرے نزدیک زندگی کی ترجمان ہے۔ رومان، اخلاق اور سیاست سب کچھ شاعر کے لئے موضوعات کا کام دیتے ہیں۔ شاعر صرف حسن و عشق ہی سے تو متاثر نہیں ہو سکتا بحیثیت انسان کی حیثیت سے زندگی کے اور شعبے بھی تو اُسے متاثر کرسکتے ہیں۔ پھر جب اُس کے پاس اپنے تاثرات کے اظہار کا ذریعہ شعر ہے تو ظاہر ہے تاثرات کے لئے بھی یہی ذریعہ اظہار اختیار کریگا۔

میں رومانی نظمیں بھی کہتا ہوں اور انقلابی بھی۔ چونکہ رومان اور انقلاب دونوں کو زندگی سے متعلق سمجھتا ہوں۔ میری نظموں کا ایک مجموعہ سلاسل کے نام سے کتب خانۂ علم و ادب دہلی سے ۱۹۴۲ء میں شائع ہو چکا ہے پیش لفظ جناب جوش ملیح آبادی کے قلم سے ہے اب عنقریب دوسرا مجموعہ شائع ہونے والا ہے۔ دو نظمیں ایک رومانی دوسری انقلابی پیش کرتا ہوں۔

کسی سے

کتنی راتوں سے تجھے نیند نہیں آئی ہے

یہ تری سرد جبیں یہ تری بے خواب آنکھیں
چھاؤں میں چاند ستاروں کی پُرآب آنکھیں
یہ پراگندہ سی مایوس نگاہیں تیری
یہ تری سانس میں ٹوٹی ہوئی آہیں تیری
پھیکا پھیکا سا یہ رنگ گل رخسار ترا
دل کی دھڑکن سے لرزتا ہُوا یہ ہار ترا
الجھے الجھے سے تری طرح یہ گیسو تیرے
یہ تھکا جسم یہ بے جان سے بازو تیرے
کروٹوں میں یہ گزرتی ہوئی راتیں تیری
زیر لب سے یہ رُکتی ہوئی باتیں تیری
اُف یہ ناکام محبت کی کہانی تیری
ہائے آغوش سے محروم جوانی تیری
تو ہے بیتاب تو یہ ارض و سما ہے بیتاب
تو ہے بے خواب تو عالم کی فضا ہے بے خواب
تو جو سو جائے تو تاروں کو بھی نیند آجائے

میرا چراغ

زندگی کے خشمگیں طوفان ہیں
بحر برق و باد کے طغیان ہیں
موت کے ظلمت فزا میلان ہیں

بقیہ صفحہ ۲۲۳ پر

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ ایم اے
پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

ادبی تنقید

ڈاکٹر ذاکر حسین کی یونیورسٹی کی حدود میں ہندوستانی لکھی بولی جانی چاہیئے ورنہ واجب اعتراض ہوگا کہ

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

اردو کے ہندوستانی بنانے میں زیادہ دقت نہیں پڑتی تین چیزیں حذف کر دیجئے، اضافت، فارسی عربی طرز کی جمع، اور ترکیب، اردو ہندوستانی بن گئی۔ مگر معترض کہتا ہے کہ گال سے غازہ، لب سے مسّی کی دھڑی، آنکھ سے کاجل گیا۔ تو معشوق دیدہ باید۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حُسن بے آرائش و زینت بھی حسن ہے اور اکثر سادگی حسن کی دلآویزی کو چار چاند لگا دیتی ہے آخر محبوب کا ایک نام سادہ رو بھی تو گنانے والوں نے گنایا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حسن اب درباروں ہی کی زینت نہیں رہا۔ زبان اور بیان کا لطف لینے والے عوام میں بکثرت موجود ہیں۔ ادیب کا مخاطب آج [illegible] کا بادشاہ ہے نہ محلہ [illegible] کا ہم عصر شاعر اور نہ [illegible] ساز یار کھ [illegible] اس کا مخاطب سب [illegible] ادیب اور [illegible] کی صحبت داری ایک ہی ہو کہ بقول سب کے

آپ کی شخصیت [illegible] صحبت داری
ایک گنہگار ہیں ہم [illegible] تمہارے [illegible]

ادبی تنقید کی تاریخ دوسری کسی چیز کی تاریخ [illegible] نہیں [illegible] بدلتا زمانہ ہر چیز کے رنگ روپ کو بگاڑتا سنوارتا [illegible] چلا جاتا ہے قلم [illegible] چنگی پیشتر سماج میں [illegible] کرتا ہے جب کبھی کوئی خواہ [illegible] اپنے درد [illegible] پر بند کر دیتے ہیں [illegible] نہیں ہو پاتا دنیا یعنی اس کی دلچسپیاں اور اس کے [illegible] دماغ پر برابر [illegible] ہیں آخر ادیب ہے کیا؟ [illegible] زبان سب اور

زبان کو یہ مرض ہے کہ وہ چلتی رہتی ہے۔ دل کی پیام رسانی کا کام کرنے میں خوش رہتی ہے۔ عورت ہی نہیں مرد بھی پیٹ کا ہلکا ہے۔

کبھی پردے کی بات رنگیں نے ✦ بولی چلمن سے میں و کرا بھلا
بات رہتی نہیں ترے جی میں ✦ تو بھی کتنا ہے پیٹ کا ہلکا

ادب میں روح [illegible] جھلکا دکھاتی ہے اور جی کی بات زبان پر آجاتی ہے۔ جی کی بات کا اظہار کر کے زبان [illegible] کرتا ہے کوئی [illegible] یہ لوگ تو [illegible] اور [illegible] نے کام لے سکتے ہیں [illegible]

[illegible]

ہم کو تو یاد کوئی غزل [illegible] یاد [illegible]

جب پرکھ، دیکھ بھال، جانچ پڑتال، چھان پھٹک پر اتر آئے تو پھر نقادوں پر اور خود لفظ تنقید اور دوسرے متعلق لفظوں کے [illegible] کا جائزہ کیوں نہ لیا جائے۔

اگر ادیب [illegible] پر [illegible] حسن کے ساتھ [illegible] احوال [illegible] اور سب زاویوں، سب [illegible] اور [illegible] پر [illegible] تو [illegible] تو ادب [illegible] "سونے آنے او [illegible]" وہ کیونکر [illegible] سے خالی ہیں اور احوال [illegible] کو [illegible] زبانوں [illegible] زاویوں [illegible] کے راہ کب سے دستیاب ہو گئے ان کا مطالعہ [illegible] سبھی۔ ان کو [illegible] ان کی [illegible] قدرت۔ [illegible] اور [illegible] بھلا کہنے کہ بجائے بُرا کہنے کی خواہش [illegible] اور مشاقی بھی۔ نقاد کو اس کی [illegible] اس کی ہر بات میں سب سے پیش پیش۔ [illegible] اس کی ہمہ دانی اور خضر [illegible] کے دعوے صاحب [illegible] گرا دیتے ہیں۔

کھڑے کھڑے خفگی، بات بات پہ بگڑی
سلوک جیسے یہ ہوں اس سے کیا نباہ کریں

ادیب بیچارے بہتیرے پینترے بدلتے ہیں مگر نقاد میاں کی ناک سے
برابر بھنچو گرتے رہتے ہیں ؎

کن کن ڈھبوں سے درد دل اپنا بیاں کیا
بے درد حیف ہے کہ نہ آیا یقیں تجھے
کیسی ہی بندگی تو بجا لائے پر نثار
ممکن نہیں وہ شوخ کہے آفریں تجھے

پھر نقاد کے کینے کو کوئی کیا کرسکا۔

کینہ جو ترے دل میں بھرا ہے سو کدھر جائے
ممکن ہے کہیں سنگ کے پہلو سے شرر جائے

اور لیجئے ایک نقاد کچھ کہتا ہے دوسرا کچھ، دن رات کا فرق ہے اور یا پھر سب ایک ہی آستانہ پر سجدہ کرنے کو آمادہ رہتے ہیں دل میں ایمان ہو نہ ہو ادھر نقاد طرازوں کا یہ حال ہے کہ معشوقوں کی طرح ایک بات پر ٹھہرتے ہی نہیں۔ مولانا نقاد اپنا گز سنبھالتے اور ٹکڑی اچھالتے ہی چلتے ہیں اُدھر ادیب وہ گیا وہ چلا ؎

کہتا ہے کوئی برق کوئی شعلۂ آتش
اک دم تو ٹھہر جائے تو اک بات ٹھہر جائے

ادیب اور صنّاع تو فطرت خود بناتی ہے مگر ان نقادوں کو کون کاٹ چھیل یا چھان پھٹک کر تیار کرتا ہے؟ اور پھر یہ عیب بینی اور حرف گیری کرتے کرتے قصیدہ کہتے کہتے بولتے مانتے ناپتے اکتا نہیں جاتے؟ کیا یہ اپنے باٹ بدلتے نہیں؟ کیوں نہیں بدلتے!

مسرا جلاس برا کہتے ہیں اور منہ پھٹ ہو کر بشرلفا تنقید کے نکالنے لگتے بیچارے ادیب کی شخصی اور ذاتی اور ماحولی مجبوریوں پر نقاد کی نظر ہی نہیں جاتی۔ اس کے خدمت کے جذبہ یا نہ اظہار کی تمنا پر معمولی ادیب کسی بات کا دعوے ہی نہیں کرتا اور جنہوں نے خاص دعوے کرتے ہیں تو اس دعوے کی تکذیب کے علاوہ اس کی تفہیم کی ضرورت ہوگی ہے نقاد کی تشخیص اور روا بیمار کو لے ڈوبتی ہے ؎

کیا قہر ہے یہ تیرا انجھ کو رلا کے ہنسنا ٭ پھر تپ بیلے ستمگر یوں کھل کھلا کے ہنسنا
عیاری تو دیکھو رلانے کے لئے آنکھ۔ دیوانہ کیا ہے ہمیں مشہور کسی نے

آج کل کے نقاد بے طب کے طبیب ہیں جو آیا اُسے اچھا خاصہ بیمار بتایا نسخہ میں لکھا کر زندگی سے تائب ہو جانے میں مکمل صحت کا راز ہے یا پھر وہ نقاد ہیں جن میں مروّت ہی مروّت ہے، دوستی ہی دوستی، محبوب کے حواری ٹھہرے

ما شاء اللہ دلنشیں اور ہمارے رقیب اور دشمن ساز شیوں کا حلقہ ہے۔ ہندی بھیجئے اور کو سالہ رگڑ دیوانہ صاحب کیسی تاریخ ہے!

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد سے شمس العلماء احسان اللہ خان تاجور تک ساٹھ ستر برس کا عرصہ ہوتا ہے اردو میں تخلیق و تنقید کے کام پر پہلے فارسی چھائی رہی اور جب سے انگریزی اس کی محرک چلی آتی ہے تنقید شروع ہو گئی چالاک نظم میں شاذ و نادر معمولی نثر لکھنا مشکل ہے۔ باوضع، باسلیقہ نثر لکھنے والے درجن دو درجن سے زیادہ نہ ہوئے اور ایسی نثر جو ایک طرف تخلیق کی داد دے اور دوسری طرف تنقید کا حق ادا کرے دس پانچ ہی نبھا سکے۔ صاحب طرز تھے تخلیق سے تنقید میں جا پڑے پھر بھی وہی رنگ وہی زور، وہی ضبط، وہی ژرف نگاہی، سرسری طور پر باتوں میں اڑایا مضمون دلکش اور جگر دوز پایا۔ دلنشیں ادا دیکھی، بس خوشی میں خوش اور غم میں افسردہ ہو گئے ؎

تم جو افسردہ ہوئے سن کے مرا حال سو کیوں
سرسری طور سے باتوں میں اڑا دینا تھا

ان ایسے گنے نقادوں نے سعی کی تو بھی وہی تخلیق بیان بحال رہا اور یہ خوب رہا، خوباں کی ہر ادا منظور رہا اور اگر دلبری کی طرز اور خود نمائی کی ادا بدلتی ہے تو کیا کہنا۔ یہی حال عشق کا ہونا چاہیئے ؎

ہم اور بحر محبت کی ہوائیں مضطر ٭ کبھی اس پار قدم ہے کبھی اس پار قدم

اور سچ پوچھو تو ان نقادوں یعنی چاہنے والوں کو میں محبوبوں سے یعنی شعرا و ادبا سے ایک طرح سے اچھا سمجھتا ہوں ؎

انہیں لوگوں کی بدولت یہ حسیں اچھے ہیں
چاہنے والے ان اچھوں سے کہیں اچھے ہیں

جن نقادوں کو میں تاریخ کے اوراق کی زینت جانتا ہوں ان کے نام گنا دوں آزاد، شبلی، حسرت، طباطبائی، چکبست، نظر، عبدالماجد، ابوالکلام شائق، ہنگامی سب سے بڑی بات یہ کہ ان میں سے ہر ایک کی اپنی دھن ہے۔ اپنی لگن ہے، پھر اپنی گت، اپنی وضع، اپنی ادا، اپنی نئی، نرالی، انوکھی، نام جانے بغیر آپ کہہ سکتے تھے کہ یہ فلاں کی آواز ہے ازل سے خوباں میں نام لکھوا کر لائے تھے ؎

ازل سے کسی کا ہوں اے بے نظیر ٭ یہ الفت برس دو برس کی نہیں

واللہ ان کو ادب سے عشق تھا اور ہے۔ منہ دیکھے کی محبت نہیں نہ ہوس، اور شہرت کو اس میں دخل، آزاد جنوں میں بھی اردو سے عشق نبھاتے رہے

اور ابوالکلام حسرت کی طرح جن میں سے یہی تخلیقی نظم و نثر کی زادیوں کی طرف اڑاتے ہیں۔ شبلی، علامہ اقبال اور عبدالماجد کا فرط ذوق ان کی سوانحیت بھی زیر ذکر تھی۔ چکبست ایک نظر بیچارے کے رونے پیٹے۔ مگر جب تک جئے ہزار زبان سے ادب کے گن گاتے رہے ان کے ذوق بیان کے ہزاروں اجزا تھے سے

اجزا الگ الگ میرے ذوق بیان کے ہیں
وسعت دوامیں سینکڑوں ٹکڑے زبان کے ہیں

اب تنقید کے ابو الآزاد کو لیجئے آب حیات کے مصنف دربار اکبری کے مصنف ہیں۔ الفاظوں نے دربار سجا کر رکھ دیا۔ فطرت نے انہیں تصویر کش بنایا تھا، بچپنے میں وقت پر تلی رہی رہ گیا۔ یہاں آکر برش کا کام قلم سے لینا پڑا۔ ان کا مقصد تصویر بنانا تھا۔ اعتبار آلی شے کی شکل، اصلیت سے غرض نہ تھی۔ رنگوں لکیروں کو بڑھا گھٹا کر مد و جزر تصویر بنا دی۔ انہوں نے ادب کا سراپا لکھا ہے۔ ادب کی مجموعی حیثیت کا۔ رنگوں اور صورتوں کے توازن کی قائمی کے لئے چیزوں کو لیا۔ چیزوں کی فرداً فرداً ان کی حیثیت اور ماہیت کو الگ پھینک دیا۔ آب حیات کا دوسرا نام ہے چند تصویریں سے

دل میں ہے بزم حسیناں کا مرقع ثاقب ؂ ہم نے شیشے میں اتارا ہے پری خانے کو

نثر میں نظم کی خوبیاں کھپائی ہیں اور عبارت سے رنگ آمیزی کا کام لیا ہے یہ لغوی لحاظ سے تاریخ نہیں مگر تاریخ سے ایک جائز کام لیا جا سکتا ہے وہ ہے IMAGINATIVE RECONSTRUCTION یعنی تصور کی قوت سے وہاں کی پھر سے آباد کر دیا جائے آزاد نے یہ طرز آغاز کی انتہا تک پہنچائی انہیں کے ساتھ یہ قلم بھی ہوگئی سخن کا سحر انہیں کے نصیب میں آیا سے

ایک عالم کو لیا سحرِ سخن سے تسخیر ؂ ابھی معلوم نہیں تم کو کرامات مری

آزاد نے سخن کے دربار کو درباری کی نظر سے دیکھا اور درباری کی قلم سے کھینچا سے

معشوق بن کے چاہئیے عشق کو اسیر ؂ محبوب بن کے چہرۂ محبوب دیکھئے

تنقید کا ماخذ لفظ ہے "نقد" جو کچھ موجود ہے سامنے ہے، حاضر ہے کیا نہیں، کیوں نہیں اور کسی کے پاس ہے کیونکر ہاتھ آسکتا ہے ان سے بحث نہیں۔ اپنے محبوب کی جملہ خوبیوں کا اسلوب سے شمار کر اسکنا بڑی بات ہے۔ تنقید کا بہترین نمونہ یہ ہے کہ ہم کسی ادیب کے سب اوصاف کسی حکمت و سلیقہ سے حوالہ بالا ثبوت دیکھیں۔ اردو میں اس تمام کو ایک گروہ نے خوبی سے انجام دیا ہے۔ لوبت رائے نظر، ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریابادی، احمد شاہ شاق بنہ قانی کی کمیابی کو میں نے بلوہ دیکھا۔ انہیں لاجواب پایا۔ "نقد" کو گلدستہ ساز و موتی ڈھونڈھ کر سجا سجا کر معطر کر کے سامنے رکھا ہے اور اپنی پسند کو ثابت کر دکھایا ہے۔

ابوالکلام آزاد کا مضمون "سرمد شہید" لیجئے۔ عبدالماجد کا مضمون "خواجہ میر درد دہلوی" پڑھئے۔ شاق کا مضمون "برق پر تاثیر" اور نظر کا مضمون "چکبست پر دیکھ" تریں، چکبست کا دیباچہ "گلدستہ فیض" اپنا جواب آپ ہے ایک ایک فقرے میں مضمونوں کے دریا بند ہیں، ضبط اور جامعیت اور نگینی اور چستی ان کی طرز کی جان ہیں۔ جاہل لوگ کتاب کی کتاب لکھ ڈالتے ہیں۔ حسرت اور آزاد ایسے دو فقروں میں غالب اور ذوق کے کمال کی داد دے لیتے ہیں۔ سے کیا جاہل نے علم کا نقطہ بڑھا دیا ؂ فرہنگ سینکڑوں تو ہزاروں لغت بنے

ہنر ہے حسینوں کے وصف لکھنا بہترین تخلیق ہے سے

اسیرؔ وصف لکھے ہم نے جب حسینوں کے ؂ ہر ایک صفحۂ دیوان نگار خانہ ہوا

تعریف و توصیف کی شراب پینے پلانے کو تمیز چاہئیے ورنہ اقبال کے بیشتر "نقادوں" نے اقبال کو ملک بنا دیا ہے اور خود کو رسوا کر رکھا ہے سے

شراب شیخ نے پی طرفہ بے تمیزی سے ؂ کہ منہ میں جُبّہ، امتیاز ڈوب گیا

حسرت ایسے شاعر پر ایک شخص کا مضمون "آجکل" میں دیکھا جی ڈوب گیا سے

بات قاصد کی غلط، جھوٹ جواب نامہ ؂ لے کے خط بیٹھ رہا گھر کہیں آیا نہ گیا

اس طرح کی وصف شناسی والی تنقید کے لئے وسیع مطالعہ کی ضرورت نہیں۔ گہرے احساس کی ضرورت ہے، وسیع تجربہ کی ضرورت ہے۔ واہ اور آہ کہنے کا ڈھب اور ڈھنگ چاہیئے۔ اچھے فقروں کا انتخاب، پھر ان شعروں کی ترتیب، پھر ان پر خشک توشیح کے بجائے ان پر رنگ آمیز لطیفہ بازی اور حاشیہ آرائی۔ یہ وہ بلندیاں ہیں جن کا سر کرنا کار سے دارد۔ ایسی تنقید میں گفتگو اور طول گفتگو نہیں۔ اشارے کنائے درکار ہیں سے

گفتگو یار سے غیروں کے مقابل کیا تھی ؂ یک دگر ہو گئے آنکھوں کے اشارے دوچار

کی مجمع احباب میں گفتار سمجھ کر ؂ اک بات کہی ہم نے تو سو بار سمجھ کر

ایسی تنقید جوہری کی پرکھ ہے۔ آزاد کی تنقید تصویر کشی اور دربار طرازی تھی

قدر آنسو کی جانتے ہیں ملک ؂ جوہری رکھتے ہیں گہر کی نظر

جوہری سچ کہتا ہے فخر و مباہات اور قصیدہ بازی سے دور رہتا ہے سے

کس قدر تازہ مضامین ہیں اسیرؔ ؂ راست لکھتے ہیں مباہات نہیں کرتے ہیں

جیسے موزوں ۔ اسے منقد، کہتے ہیں اس کی سر ریان حالی کی مگر جیسے بہت زور نہ ملے ۔ ابن تہذیب ۔ ورد میں شبلی، چکبست، علامہ اقبالی اور حسرت سب پر بہت رکھتے ہیں، حسرت ۔ کی انداز سنا۔ مگر حسرت کا جواب

دوسری … شے … ہے
محبوب … ان کوشش … ترقی ہے۔ یہ … زمانہ
… تنقید۔ خوبی اور عیب، دونوں پر حاوی ہوتی ہے وہ مقابلہ موازنہ
سے نہیں گھبراتی وہ نہیں دیب کے … ترلائی ہے مگر اس سے محبت اور نفرت
کی تخریب، تحریص نہیں کرتی قبل اس کے کہ ایسی تنقید قلمبند کی جا سکے نقاد میں
وسیع مطالعہ، غیر جانبداری، گہری نظر، تجزیہ کی طاقت اور توازن قائم کرنے کی
صلاحیت جمع ہونی چاہئیں۔

یہاں … کا … نہیں ہے سنجیدگی اور متانت کی ضرورت ہے تنقیص سے
ایسے نقاد دور بھاگتے ہیں۔ البتہ ادیبوں کو وہ انتخاب کرتے ہیں جن کی عظمت
کے … قائل ہیں۔ البتہ ان کی عظمت کے مکمل اجزا کو تحریر میں لانا، ان کی صد پہلو
عظمت کو … کرنا، ان کی خامیوں کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دینا، دوسرے
باکمالوں کی خوبیاں گنانے میں تامل نہ کرنا، ان فرائض کو شوق سے انجام دیا جاتا ہے

… کا پہلا تنقیدی مضمون حسرت ہی نے شائع کیا تھا۔ … طباطبائی
کی تنقید … حسرت … اردوئے معلیٰ کے صفحات محفوظ رکھے جس شخص
نے … کی … فائل اس میں … دیکھی وہ تنقید کے مقاصد سے آشنا
ہے … تنقید کے الفاظ و اسلوب سے واقف ہے نہ اسے تخلیقی تنقید کا کبھی لطف
حاصل ہوا ہے

شبلیؔ صحیح معنوں میں مغربی طرز کی تنقید رائج کرنے والے تھے ہر چند کہ
انہیں مغربی تنقید کے تمام بہترین انگریزی نمونے میسر نہ ہوئے۔ فارسی ادب کے وسیع
مطالعہ نے شبلیؔ کو ایک خاص … عطا کر دیا تھا جسے مشاقی سے قریبی رابطہ ہے
(INTUITION) دل سے شبلیؔ وہاں پہنچ جاتے تھے جہاں اور لوگ لاکھ تجزیے
… نہ … شبلیؔ کہہ سکتے ہیں۔

گلشن اک مدرسہ ہے میرا، بلبل کو سبق پڑھا رہا ہوں
یاروں سے میں گو جدا رہا ہوں، پر دل سے تو آشنا رہا ہوں
… خدا رہا ہوں … میں … رہا ہوں

ادبی تنقید کا معیار حسرت کے تذکرۃ الشعرا اور نکات سخن کی تنقیدی
عبارات ہیں، یہاں غصہ نہیں، غم نہیں، نفرت نہیں، عشق نہیں، رعونت نہیں
خوشامد نہیں، … بازی نہیں، … سازی نہیں … تمام نہیں … نہیں
یہاں ادب کی غرض و غایت ہے، ادب کی نیرنگی کا احساس ہے، ادب
کے اجزا کا لحاظ ہے۔ ادب کی … ہے۔

یہاں وسعت ہے، پختگی ہے، متانت ہے، ہمدردی ہے، صاف گوئی
ہے، قافیہ، ردیف، بحر، وزن، ان کا اثر، ان کی ساخت پر بحث ہے۔
الفاظ کے انتخاب کا خیال ہے، ترکیبوں کی تراش کا لحاظ ہے، الفاظ کی نشست
بندش، اصوات کی آمیزش اور ناآمیزش پر نظر ہے، اثر و تاثیر کی جانچ پڑتال ہے۔
یہاں شخصیت، مطالعہ، فطرت، صلاحیت، اکتسابی اور ذہنی کمال
سب کا بیک وقت جائزہ لیا جاتا ہے۔
غرض یہاں تصویر کشی، وصف گوئی، عیب بینی، سب سے انصاف کا سلوک
کیا جاتا ہے۔

ادب کے ہر صنف سے وابستگی ہے گرانی وارستگی بھی بدستور قائم ہے۔ نیاز
اور بے نیازی، تجزیہ اور ترمیم دونوں ہم آغوش دکھائی دیتے ہیں۔ فلسفہ و تصوف
ہم بزم ہیں، زبان و بیان ہم قدم … تفصیل … کمال … آسانی اور … کمال دونوں کی
قدر کی جاتی ہے اس شرط پر کہ وہ ادب کی خدمت میں کامیابی کی حدود تک پہنچ
جائیں حسرت کہہ سکتے تھے۔

سحر شمع شبستاں ہوں میں، شام پروانۂ سوزاں ہوں میں
قافلے والوں کا ہوں راہنما، جادۂ راہ بیاباں ہوں میں
دیکھ اے گل مرے داغوں کی بہار
اک تماشائے گلستاں ہوں میں

مے عذاب ہے میری دے گا مخمور * بندۂ ساقی دوراں ہوں میں
ہندو مسلم سکھ یہاں ایک ہی گھاٹ پانی پیتے ہیں ایک ہی خم سے ترقی
پسند اور غیر ترقی پسند کو شراب عطا کی جاتی ہے۔

آج کل کے تنقیدی مضامین کو دیکھئے گمان ہوتا ہے کہ اس وقت ہندوستان
کے طول و عرض میں پچاس لاکھ اردو ادیب ہیں ان میں سے ہر ایک شاعر بھی ہے،
نثر نویس بھی، نقاد بھی ہے اور مصلح بھی، زاہد بھی ہے اور فاسق بھی، عابد بھی
بھی ہے اور عاشق بھی، ترقی پسند بھی ہے رجعت پسند بھی۔ سرمایہ دار بھی ہے
مزدور بھی، شہری بھی ہے دیہاتی بھی، مغنی بھی ہے مصور بھی، استاد بھی ہے
شاگرد بھی۔ اللہ بچائے۔

ان پچاس لاکھ کی اکائی یوں سمجھئے جیسے لاکھ تو ریڈیو کے بنائے ہوئے
ہیں۔ ۱۹ لاکھ اخباروں اور رسالوں کے ٹھہرے ہوئے اور باقی ایک لاکھ کی تخلیق اور
تربیت کی ذمہ داری کالجوں کے پروفیسروں اور شاعری کے سکولوں پر ہے۔
یہ آنکھ … نہیں پچاس لاکھ آدمی خوش و خرم تھے ملک کی خوشحالی

جو مقصد ہے۔ ایک نکتہ اور سن لیجئے آج کل کے نقاد تنقید نہیں کرتے وکالت نامے لئے پھرتے ہیں۔ بعض سرکار بننے پر مصر رہتے ہیں جن کے وکیل ہیں اُسے ہمہ تن ہمہ صفت موصوف ثابت کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ دوسرے وکیل کے موکل کو سراپا عیب جانا ہی دم لیتے ہیں۔ تفسیر و تاویل کا یہ حال ہے کہ ایک شعر ایک مصرع میں ایک لفظ میں کئی معانی ڈھونڈھ لیتے ہیں اس کے بل بوتے پر جتنی بڑی عمارت چاہیں کھڑی کر سکتے ہیں۔ توصیف کی عمارت ہو یا تنقیص و تخریب کی۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ آج کل کے نقادوں کے ہر ممدوح میں فصاحت و بلاغت، روانی تسلسل، بندش، الفاظ کا صحیح چناؤ، اصوات کا توازن و تصادم، ترقی پسندی پرانی روش سے دلچسپی غرض کہ سب کچھ موجود ہے۔ المختصر یہ کہ بلا کا ادیب ہیں اور سب کے سب اعلیٰ درجے کے۔

حقیقت یہ ہے کہ اردو ادبی تنقید کے کھاتے میں DEBIT کے عنوان کے نیچے بھی ایک اتنی لمبی فہرست بنتی کہ CREDIT کی سرخی کے تحت ہیں نقاد صاحب جن باتوں کو بالخصوص بھول جاتے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱) اچھی وقتی لحاظ سے عمدہ تصنیف اور چیز ہے اور اعلیٰ پایہ کی ہمیشہ زندہ رہنے والی اور (۲) ادیب کا یہ فرض نہیں کہ وہ فضا میں ناچتے کودتے الفاظ اور خیالات کو خواہ وہ کسی نوع کے ہوں قلم بند کرے۔ (۳) ہمارے ہی ملک میں ایک درجن کے قریب زبانیں ہیں پھر دنیا کی گنتی تو بہت ہی زیادہ ہے جس شخص کو دوسری نئی پرانی زبانوں کے نئے پرانے ادب سے واقفیت ہے اس کے لئے اردو ادب کی اہمیت ایک دوسری صورت اختیار کرتی ہے (۴) جدت کا تقاضہ بہت وسیع اور اہم ہے ہم نئی نئی تشبیہوں اور استعاروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ نئے زاویوں کی کھوج میں، نئے طرزوں کی ڈھونڈھ بھال میں۔ نئے الفاظ نئی ترکیبوں نئی صورتوں نئے پس منظر یہ ہمیں بے تاب رکھتی ہے۔ (۵) ایک آدھ چیز سے سیری نہیں ہوتی، وحدت، کثرت، تجزیہ، ترکیب، ترتیب ان سب کے تقاضے پورے کرنے ہوتے ہیں، وحدت سے مراد اثر اور نظر کی وحدت ہے، کثرت سے مراد بہ کافی اور تنوع۔ ترتیب سے عبارت ہے ربط، اور بے ضبط اور متانت اور تھوڑے میں بہت سا کہہ جانے کی اتنی ہی توقع ہوتی ہے جتنی کہ خود رفتگی، طنز و مزاح و لطف اور کہہ یہ ربط تفصیل کی۔ (۶) مجموعی حیثیت سے کلام کو دیکھنا چاہیئے۔ صاحب کلام کی شخصیت کو پرکھنا چاہیئے اور ماضی، حال کے پس منظر میں کسی شاعر کے رتبے کا تعین کرنا چاہیئے۔ (۷) حال و مستقبل ماضی کے شجر کے پھل ہوتے ہیں اس درخت میں پیوند لگتے جاتے ہیں کسی قوم، ملک، گروہ کے ماضی حال مستقبل سب کو بیک وقت نگاہ میں رکھنا چاہیئے۔ (۸) روحانی اقدار ہر حال میں مادی اقدار پر غالب ہیں ان سے زیادہ اہم اور ضروری، مفید اور حسین ہیں۔ روحانی اقدار کا ادب کی جانچ پڑتال میں خاص درجہ ہے۔ (۹) ادب میں خیالات کی توسیع کے ساتھ ساتھ زبان کی توسیع بھی ضروری ہے۔ نئے الفاظ نئی ترکیبیں تراشی جانی چاہئیں، مفید پرانے لغات کا احیا بھی ضروری ہے نئے پرانے کا امتزاج فن کارانہ امتزاج بلکہ وصال خوش سلیقگی کی کسوٹی ہے۔ (۱۰) اردو ادب کا خطاب ابھی تک قوم سے عنصر عام اور تہذیب ہند کے سے نہیں۔ ہمیں عوام کی بہ زبان اور ان کے بدلتے ماحول کو ہنر کے ساتھ ادب کے گلدستے میں گوندھنا ہے۔

تنقید کی مختلف قسموں کے لئے الگ الگ لفظ وضع کئے جانے چاہئیں دیکھئے یہ انگریزی میں سات اصطلاحیں ہیں ان کے مترادف اردو میں کیوں نہ تیار کئے جائیں۔

(ا) STUDY ———— مطالعہ
(ب) APPRECIATION ———— توصیف
(ج) CRITICISM ———— تنقید
(د) SURVEY ———— جائزہ
(ر) ANALYSIS ———— تجزیہ
(س) REVIEU ———— تبصرہ
(ش) INTERPRETATION ———— تاویل

انسان کے لئے اپنے ہی نیک و بد سے پورے طور پر آگاہ ہونا بہت مشکل ہے دوسرے کے حسن و قبح سے کما حقہ واقفیت کس قدر مشکل نہ ہوگی۔ نقاد میں صبر، ہمدردی تفحص، گرد و پیش سے باخبری اشد ضروری ہے۔ انصاف کی باگ ڈور ہاتھ سے نہ چھوٹے جو کچھ موجود ہو اسی پر کفایت کی جائے، مبالغہ سے پہلو بچایا جائے اور سب سے اہم بات یہ کہ شرافت کو ہاتھ سے نہ دیا جائے۔ ادب میں رقابت اور رکاکت کی گنجائش نہیں۔ نقاد اگر محبت، شرافت، عدالت، توازن، ہمدردی اور دوررسی سے کام لے گا تو یقیناً وہ ایک تخلیقی کام انجام دے سکے گا اگر اس کے برعکس وہ رعونت، بد دیانتی، بے انصافی، عدم توازن، نفرت، بیگانگی اور کوتاہ بینی کو استعمال کرے گا تو اس سے بدتر تخریبی کام نہیں۔ ہر کسی کے خون جگر کی کما حقہ قدر کرنی چاہئے نہ کم نہ زیادہ ؎

اے کاش خونِ دل کی مرے قدر وہ کرے ÷ اس مست ناز کو بھی کبھی شوق بادہ ہو

تنقید کی بہترین تعریف یہ ہے کہ وہ وسیع المشربی سے متصف ہو اس میں کم ظرفی کا شائبہ نہ ہو ؎

وسعت مشرب کہیں کم ظرف کے آئے نہ ہاتھ ÷ رتبۂ دریا نہ حاصل ہو کبھی ہرگز حباب کو

ہر کسی کے جنون کا مداوا دینی چاہئے اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ بہار میں سب پر جنون سوار ہو تو لب سب کو آ رہو چیلا ہے ہاں مگر قیس دنیا میں کم ہوتے ہیں قلم زن منشی پچاس لاکھ ہیں اور ادیب پچاس کیا پانچ بھی نہیں۔ انشا اور ادب میں امتیاز جزو ایمان ہے۔ قیمتیں کم محض جستجو تو جس قدر دقیق ہوگا وہ بہتر سے بہتر نمونہ بن سکے گی۔ میری یہی دعا ہے کہ ادیب بدست تہوں اور ان مستوں کا دل خنک ہے سدا

محزوں رہے دعا ہے مستوں کا دل خنک جو مے کی صراحی برون یں رہو سے سدا لگی

مے آتشیں ادیب کو یکجا کرنا اور اس سے لطف مزید اٹھانا تنقید کی معراج ہے

حسرت کے نام اور کام سے خواص آشنا ہیں مگر وہ کبھی اردو ادب کے ایک نہایت باخبر نقاد کے نام سے واقف نظر نہیں آتے۔ سو چاہے تنقید و تخلیق کے معیار کا نمونہ انہیں کے قلم سے پیش کیا جائے۔ شمس العلما نواب سید امام صاحب اثر نے جو کچھ لکھا وہ غزل گوئی اور اس کے شرائط کے عنوان کے تحت میں لکھا۔ مگر حقیقتاً وہ کل تنقیدیات پر بلکہ افسانہ اور ناٹک پر بھی حاوی ہے زبان اور بیان ملاحظہ ہو خیال کے علاوہ واردات قلبیہ کے بیانات متعلقات سے بے کیف ہو جاتے ہیں۔ غزل کے جتنے مضامین ہوں داخلی ہوں مگر ایسے رفیع درجے کے ہوں کہ جس سے انسان کے عالم باطنی کا شرف ظاہر ہو سکے جس سے انسان کی بزرگی اور عظمت ہویدا ہو سکے جس سے انسان کا دل عرش اللہ تعالیٰ ثابت ہو سکے جس سے انسان نمونہ قدرت خداوندی سمجھا جائے جس سے انسان کے قوائے اخلاقیہ کی خوبیوں کا انکشاف متصور ہو۔ جس سے انسان کی وسعت ادراک کا پتہ مل سکے جن سے عرفان حق کی راہ سجھائی دے سکے جن سے عالم روحانی کا اندازہ حسب قوت بشریہ کیا جا سکے۔ مضامین عشقیہ ایسے نہ ہوں کہ معشوقان بازاری کی طرف محمول کئے جا سکیں فسق و فجور سے تمام ترب لگاؤ ہو۔ عشق پیرایۂ فسق میں نہ دکھایا جائے بلکہ اس عظمت و بزرگی کی شان سے بندش پائے جو اس کی شان ہے۔ تعالی العشق عن فہم الرجال۔ اسی طرح وہ مضامین جو حسن سے تعلق رکھتے ہیں ان کے انداز ایسے عالی ہوں کہ فوراً خیال سامع معشوق حقیقی کی طرف کھنچ جائے جاننا چاہئے کہ حسن و عشق بتغیر الفاظ صفات خداوندی سے ہیں اسی لئے کہ حسن و جمال سے وا مد ہے اور عشق و محبت بھی متعدد ہیں۔ جمال کی نسبت حدیث شریف میں وارد ہے۔ ان اللہ جمیل و یحب الجمال۔ اور محبت کے متعلق متعدد آیات قرآن مجید میں پائے جاتے ہیں مثل یحبہم و یحبونہ۔

غزل گوئی کے لئے قابلیت علمی کی اس قدر حاجت نہیں ہے کہ جس قدر

عمدگی دل کی عمدگی طبع عبارت ہے ان اوصاف حمیدہ سے جن سے انسان، انسان کہلاتا ہے۔ اب مولانا مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی کی تحریر دیکھئے اور وہ بھی شبلی نعمانی پر۔ اسے کہتے ہیں تنقید۔ اسے کہتے ہیں صداقت اور طرز۔ اسے کہتے ہیں جبلی شرافت۔ اسے کہتے ہیں تصویر کشی، اسے کہتے ہیں عدالت ——— دوستی اور مخالفت دونوں شدید تھیں لیکن دوستوں کی مروت کبھی ان کو رکیک تملق اور چاپلوسی پر آمادہ نہیں کرتی تھی۔ عزیز دوست کی خاطر وہ اپنی رائے سے نہیں ہٹتے تھے۔ مخالفوں کی مخالفت رو برو نہیں رکھتے تھے مگر ان کے پس پشت بیان اختلاف میں کبھی ان کی زبان سے ایسے الفاظ نہیں نکلتے تھے جو نفسانیت اور معاندانہ عیب جوئی پر دلالت کریں۔ مخالف کی رائے کی تردید سختی کے ساتھ کرتے تھے اپنی رائے کے دلائل کا زور شور سے اظہار کرتے باوجود اس کے یہ کبھی نہیں ہوتا تھا کہ مخالف کے ذاتی یا صفاتی عیوب پیش کر کے اس کو ذلیل و رسوا کریں ——— صحبت نہایت پاکیزہ و شگفتہ تھی۔ انسان خواہ کسی رتبہ کا ہو ان کی باتوں سے محظوظ ہوتا تھا جس مسئلہ پر گفتگو کرتے ان کے کمال کی خوبیاں نظر آتیں عقلی پیرایہ، مورخانہ انداز، شاعرانہ نکتہ سنجی ان کے بیان کے رفیق و ہمدم تھے جب کبھی کسی مسئلہ علمی پر گفتگو ہوئی بعض نادر اور نازک پہلو ہر دو بیان کئے فضول باتیں میں نے ان کی زبان سے کبھی نہیں سنیں ——— ہر ذوق میں شدت چاہتے تھے۔ نمک کھانے میں تیز ہو۔ دسترخوان پر نمک رکھ لیتے اور کھانے میں ملتے جاتے۔ شیرینی بھی گلوسوز مرغوب تھی یہ عام منظر تھا کہ کافذ پر قند رکھی ہوئی ہے باتیں کرتے جاتے ہیں قند کی ڈلی منہ میں ڈالتے جاتے ہیں وہ قند سے اور سامع ان کے کلام سے شیریں کام ہے۔ ایک مرتبہ جلسہ ندوۃ العلماء کے سلسلے میں بریلی ان کا میرا ساتھ ہوا قریباً ہر اسٹیشن پر شیرینی خریدی اور چکھی بلکہ کھائی بعض شیریں ہونا سلانی تھا اس کے حسن و قبح سے بحث نہ تھی۔ پانی تیز سرد پیتے تھے۔ جاڑوں میں بھی یہی ہوتا اس کے ساتھ سردی و گرمی بہت محسوس کرتے۔ ایک مرتبہ جاڑوں میں حبیب گنج تشریف لائے متعدد رضائیاں اوڑھیں تسلی نہ ہوئی۔ دوسرے روز خاص اہتمام سے لحاف خوب روئی بھروا کر تیار کیا گیا۔ چائے سادہ اور کڑی پیتے تھے۔

اب مولانا عبدالسلام ندوی کا حسن تنقید دیکھئے ——— زبان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ شعر کے تمام اجزا ایک دوسرے سے الگ اور ممتاز ہوں یعنی وہ نثر میں نہ ادا ہو سکیں ——— مولانا حالی زمانہ کے نشیب و فراز کی تصویر خوب کھینچتے ہیں لیکن تعریض اور انبساط مرا مولانا کا حصہ ان سے بھاری ہے ان دونوں بزرگوں میں خطیب اور خیر خواہ کا فرق ہے ——— واقعہ کی اصل تصویر کھینچنا شعر کی حقیقت میں داخل ہے لیکن کسی شعر میں یہ وصف بکمال نہیں پایا

پایا جاسکتا جب تک شاعر قادر الکلام نہ ہو۔ مولانا کو اس میں اس قدر کمال حاصل ہے کہ لفظ لفظ واقعہ کی اصل تصویر ہوتا ہے۔

مختلف شہروں کے مبتدے نام امرا کا طول طویل لقب ایسی چیزیں ہیں کہ جو شعر میں لائی جائیں تو ترکیب کی چستی، زبان کی صفائی، بندش الفاظ میں ایک نمایاں فرق پیدا ہو جاتا ہے مولانا کے اکثر قصیدے اسی قسم کے القاب اور ناموں سے بھرے ہوئے ہیں لیکن اس سے زبان اور ترکیب کی چستی میں بال برابر فرق نہیں آتا اور لطف یہ کہ اکثر تخفیف کا قاعدہ بھی نہیں جاری کرتے

شاعر کا حاسہ عموماً قوی ہوتا ہے اس لئے محسوسات کا اثر نہایت شدت کے ساتھ اس کے حواس پر پڑتا ہے اسی بنا پر وہ چاہتا ہے کہ اسی شدت کے ساتھ وہ کیفیت سامع کو بھی محسوس ہو لیکن اپنا سا حواس مخاطب میں پیدا کردینا شاعر کا کام نہیں ہے اس لئے وہ فطرتاً اس کیفیت کو تشبیہہ سے استعارے سے نازک الفاظ سے مختلف طرز بیان سے مخاطب کے خیال میں پیدا کرنا چاہتا ہے اس کی مثال بالکل عید کے چاند کی ہے۔ ایک ہی شخص جوش شادمانی میں کبھی اس کو دوربین سے، کبھی مسجد کی چھت سے، کبھی دریا میں، غرض مختلف حیثیتوں سے دیکھتا ہے لیکن ان دیدہ ریزیوں کا حاصل صرف اس قدر ہے کہ چاند کی پوری تصویر آنکھوں میں اتر آئے تاکہ عید کی خوشی دوبالا ہو جائے اور اس کو کوئی شخص معیوب نہیں سمجھتا۔ اسی طرح نازک استعارہ، واقعہ کا نشیب و فراز، تشبیہہ، طرز بیان کا چڑھاؤ اتار کوئی عیب نہیں۔

حاصل یہ کہ فرقۂ جدید کی سادگی اور قدیم فرقہ کا تصنع دونوں میں بے اعتدالی پائی جاتی ہے۔ موازنہ سخت مشکل کام ہے کیونکہ اس میں تمام تر لطیف ذمہ داری کو دخل ہے۔ خواجہ غلام الثقلین کی قلم سے ایک نمونہ موازنہ کا دیکھیئے۔

مولانا حالی کی نثر میں خصوصیت یہ ہے کہ معنی اور الفاظ بالکل برابر ہیں کلام میں کہیں ابہام یا اشکال نہیں۔ لفظ البتہ بعض جگہ مشکل ہیں تنقید اور رائے کے لئے اس سے بہتر طریقہ ادا اس زمانے میں نہیں ہو سکتا۔ سلاست کلام میں، سرسید کا درجہ مولانا مرحوم سے بہت زیادہ ہے بامحاورہ اور دلچسپ عبارت لکھنے میں یہ پروفیسر آزاد یقینی بالا ہیں۔ مگر جو فلسفی عمق حالی میں ہے آزاد میں اس کا پتہ نہیں اور لٹریچر کے جن رموز پر حالی پہنچے ہیں سرسید مرحوم وہاں تک نہ پہنچ سکے۔

سعدی ایک کامل شخص ہیں مگر وہ انسان کو کامل بنانا چاہتے تھے حالی ایک کامل شخص ہیں مگر وہ قوم کو بنانا چاہتے ہیں۔

آخر میں REVIEW یعنی تبصرہ کے بہترین نمونے جن کی جامعیت اور جن کا اجمال نمایاں ہے حسرت کے جادو رقم قلم سے درج کر کے رخصت ہوتا ہوں

ایک شاعر کا انجام۔ یہ ناول بھی حضرت نیاز کے زور قلم کا نتیجہ ہے ناول کا پلاٹ تصنع سے خالی نہیں ہے لیکن طرز بیان کی جدت اور ترکیب الفاظ کی ندرت نے اس کمی کی تلافی کافی سے زیادہ کر دی ہے حضرت نیاز کے تخیل اور ترکیب کی ترکی شان پر بعض لوگوں نے چند اعتراض بھی کئے ہیں لیکن ان سے معترضین کی بدمذاقی کے سوا اور کچھ نہیں ثابت ہوتا۔

کملا۔ اس ڈرامے کا پلاٹ خامیوں سے پاک نہیں اور دیہاتی زبان کا چربہ بھی صحیح نہیں اترا ہے تاہم زبان کی عام خوبی اور افسانے کی دلچسپی میں کوئی شبہ نہیں۔ بحیثیت مجموعی کتاب قابل دید ہے اگرچہ اس کا مرتبہ مسٹر چکبست کے مرتبہ تصنیف سے کسی قدر پست ضرور ہے۔

حق یہ ہے کہ ہندو سوسائٹی کی جیسی صحیح تصویریں ان افسانوں (پریم پچیسی) میں کھینچی گئی ہے اس سے بہتر کسی قصے یا ناول میں کم از کم ہماری نظر سے نہیں گذری۔

ظاہر ہے کہ حسرت موہانی آج سے بتیس ۳۲ برس پہلے ایک ایسے طریقے پر کاربند تھے جسے میں نے آج ایک انگریزی رسالہ میں دیکھا ہے:-

THE MAIN BUSINESS OF A REVIEWER IS TO ACT AS LIAISON OFFICER BETWEEN THE AUTHOR & THE READER.

رباعیات

احمد ندیم قاسمی

(۱)

کیوں حدِ نگہ کو آسماں کہتے ہو؟
کیوں ذوقِ نظر کو کہکشاں کہتے ہو؟
مریخ و زمیں ہیں جبکہ ذراتِ جمال
ہر ذرے کو کیوں ایک جہاں کہتے ہو؟

(۲)

دھوکے میں خوشی کے، مجھ سی حسرت کھلی
پردے میں مشیت کے، رعونت کھیلی
شہپارۂ تخلیق نہ جانا - ہیہات
"انسان" سمجھ کے مجھ سی فطرت کھیلی

(۳)

طے ہو چکی جو راہ، وہ پیچیدہ نہیں
جو زلف بکھر چکی، وہ ژولیدہ نہیں
کرنیں ہی برس رہی ہیں ترچھی ترچھی
واللہ نگاہیں تیری دزدیدہ نہیں

(۴)

آنکھیں ہیں تری، سلونی شاموں میں چراغ
عارض ہیں ترے شفق سے لبریز ایاغ
یہ تیرا بدن ہے یا ستاروں کی ہنسی
یا جوشِ بہار سے بھبکتا ہوا - باغ!

شوکت تھانوی

فلمیریا

خدا سائنس کی ترقیوں کو سلامت رکھے۔ نت نئے امراض ظہور میں آتے ہیں ورنہ پہلے ہمارے بزرگوں نے بلیڈ پریشر اور فائیلریا قسم کے نام کاہے کو سنے ہوں گے اور اب بھی جب وہ سنتے ہیں تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان میں اور اسی قسم کے دوسرے ناموں میں کیا فرق ہے مثلاً ٹائیفائڈ ایریا، سانسٹینٹی نوپل، انسائیکلو پیڈیا وغیرہ ان کے نزدیک امراض اور شہروں کے، شہروں اور کتابوں کے نام سب اس طرح یکساں ہیں کہ وہ بیچارے سانسٹینٹی نوپل میں مبتلا ہو کر انسائیکلو پیڈیا جا کر علاج کرانے کیلئے پاسپورٹ طلب کر سکتے ہیں اور جب پاسپورٹ مل جائے تو راستہ میں ٹائیفائڈ ایریا پڑھتے ہوئے چلے جائیں گے۔ اور یہ بات ان کی سمجھ میں مشکل ہی سے آ سکے گی کہ ان کو کوئی شبہ ہو گیا ہے یا کوئی مرض۔ وہ کسی کتاب کا سفر کر رہے ہیں یا ان کو ٹائیفائڈ ایریا کی شکایت ہے۔ ٹائیفائڈ اور ٹائیفائڈ کا سا فرق سمجھنا ان کے لئے آسان نہیں ہے۔

جی ہاں اسی قسم کے ایک وبائی مرض کا نام فلمیریا بھی ہے اس نام پر آپ کو چونکنے کا حق اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب یہ ثابت ہو جائے کہ آپ ملیریا یا فائیلریا کے ناموں پر چونکے تھے جس طرح وہ امراض جدید سائنس کے تحائف ہیں اسی طرح یہ مرض بھی کچھ ہی دنوں سے ہندوستان میں وبا کی طرح پھیل رہا ہے اور اگر اس کے لئے ہمارے ماہرین سائنس نے جلد سے جلد کوئی انجکشن یا کوئی برقی علاج دریافت نہ کیا تو قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کو وہ نقصان پہونچے گا جو ملیریا اور فائیلریا وغیرہ سے ہرگز نہ پہونچا تھا۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ دوسرے امراض کی چھان بین کرنے کے بعد ان کی تشخیص کے طریقے بھی دریافت کر لئے گئے ہیں مثلاً انسان کا خون لے کر دیکھا جائے تو پتہ چل جاتا ہے کہ اس کو ملیریا ہے یا ٹائیفائڈ مگر فلمیریا کی شناخت ذرا مشکل ہے اور ابتدائی مدارج میں تو اس کو پہچانا ہی نہیں جا سکتا پتہ اس وقت چلتا ہے جب مریض پر مرض کا پورا غلبہ ہو چکتا ہے اور دوا کے مدارج گذر کر دعا کی نوبت آ جاتی ہے۔

اس مرض کا حملہ عام طور پر نوجوانوں پر ہوتا ہے۔ کالج کے طالب علم اور اسکول کے لڑکے اس کم بخت کا شکار ہو کر اپنی زندگی تباہ کر لیتے ہیں اس کے جراثیم مچھروں یا مکھیوں وغیرہ سے نہیں پھیلتے بلکہ پرچھائیوں سے پھیلتے ہیں اور یہ پرچھائیاں آنکھوں کے راستہ دماغ میں داخل ہو کر پہلے تو دماغ کو ماؤف کرتی ہیں اس کے بعد دل کی حرکت کو بھی عجیب بیہودہ حرکتوں میں مبتلا کر دیتی ہیں اس مرض کے آثار شروع شروع میں یہ ہوتے ہیں کہ مریض آئینہ کے سامنے تنہائی میں بیٹھ کر منہ چڑھایا کرتا ہے کبھی آنکھیں گھماتا پھراتا ہے کبھی مختلف زاویوں سے چہرے کو متین بنا کر دیکھتا ہے کبھی خود بخود مسکراتا ہے کبھی ہنستا ہے کبھی بسورتا ہے کبھی روتا ہے اور کبھی کبھی زیر لب کچھ بڑبڑایا کرتا ہے ان آثار کے معنی یہ ہیں اس کو نہ صرف فلمیریا ہو چکا ہے بلکہ فلمیریا کے جراثیم اس کے دل و دماغ کو بالکل ماؤف کر چکے ہیں اب آپ دیکھیں گے کہ اس کے عادات و اطوار میں رفتہ رفتہ تبدیلیاں پیدا ہوتی چلی جائیں گی خاموش اور غیر محسوس تبدیلیاں جیسے گھنٹہ کی سوئی کو چلتا ہوا نہیں دیکھا جا سکتا حالانکہ وہ متحرک ہوتی ہے وہ غسل خانہ میں نہاتے ہوئے غالب یا میر کے مصرعے اور اشعار نہ گنگناتا تھا بلکہ اس کے ذوق ترنم کو اب اس قسم کی چیزیں تسکین دیتی ہیں کہ:-

میں تو دلی سے دلہن لایا رے۔ اے بابو جی
ہریا برس گئی اس پار
گھر ہم نے لے لیا ہے ترے گھر کے سامنے
ساون کے بادلو۔ ان سے یہ جا کہو
انکھیاں ملا کے جیا برما کے چلے نہیں جانا۔ او۔ چلے نہیں جانا
جا میں نہ تیرا بالموا۔ بے وفا۔ بے وفا
اے ماں۔ اے ماں۔ اے ماں۔ ترے چرنوں پر ماتھا کاش جھکا دیں گے۔

وہ ڈاکٹر رانی لبنٹ مسز سروجنی نائیڈو ، زیب النسا مخفی وغیرہ کی بجائے سیتا دیوی ، شبنم ، نرگس ، مینا ، مینا اور رشاد وغیرہ کے تذکرے کریگا ، وہ مولانا آزاد ، مسٹر جناح ، پنڈت نہرو ، مرزا شبلی ، رویندر ناتھ ٹیگور ، گاندھی جی کی بجائے دلیپ کمار ، موتی لال ، اکبر ، الناصر ، یعقوب ، ورشا ، اشوک کمار کے حوالے دیگا ، اس کے ذہن میں بجائے دیوان غالب ، مسدس حالی ، تلاش حق اور گیتانجلی کے جو چیزیں محفوظ ہونگی ان میں سے چند ، پکار ، رتن ، خاندان ، خزانچی و شاہجہاں وغیرہ ہیں اسکے انداز گفتگو میں فرق پیدا ہو جائے گا اس کے لباس میں تبدیلیاں آ جائیں گی اس کے سر کے بالوں کی ساخت بدل جائے گی اس کی مونچھوں کی تراش تنگ چھوٹی اور بڑی ہو جائیگی وہ بولے گا پٹھانیوں کی طرح ، چلے گا اداکاری کرتا ہوا ، اٹھے گا ایکٹنگ کرتا ہوا بیٹھے گا اس طرح جس طرح شہر سے دور میں الناصر دیوکی رانی کے یہاں صوفہ پر بیٹھا تھا وہ چلتے چلتے اس طرح اچھلے گا جس طرح پکار میں جہانگیر فریادی عورت کی آواز پر اچھلتا تھا اور وہ بولے گا اس طرح جس طرح سکندر میں راجہ پورس سکندر اعظم سے ہم کلام ہوا تھا وہ جیسے خاصے شعر کہتے غالب اور انیس کے اتباع کی جگہ بہا کوئی مدھوک کی پیروی اختیار کرے گا اور شعر اور موسیقی کے فرق کو بھول کر جہالت میں مبتلا ہو جائے گا۔

جب مریض کو اتنی شکایتیں پیدا ہو چکی ہوں اس غریب کا تو اللہ ہی حافظ ہے اب اس کا ہر کام سے دل اچاٹ ہو جائے گا۔ پانچ وقت کی نماز کی جگہ شہر کے ہر سینما ہاؤس کے مختلف شو دیکھنے کی عادت ہو جائے گی باقاعدہ کام پر جانے کی جگہ بیٹھ کر فلمی گیت گنگنانے کی عادت پیدا ہو گی کہ لکھنا پڑھنا چھوڑ کر فلم اکیڈمی جانے لگے جانے کی جگہ سنیمو میں جا بیٹھے ، دیکھنے اور سیکھنے کے بجائے سٹوڈیو میں حصہ لے اور زندگی کی ہر حقیقت کو اسی رنگ میں دیکھنا چاہیگا جو پردہ سیمیں پر اس کو نظر آتے ہیں یہاں تک کہ وہ باقاعدہ فلمیریا میں مبتلا ہو کر سب کچھ چھوڑ کر بمبئی ، کلکتہ یا لاہور کا رخ کرتا ہے اس لئے کہ زمانہ کی اس خرابی کے پاگل خانے عام طور پر انہی تین شہروں میں ہیں۔

یہاں تک تو میں نے اس مرض کی نوعیت ، اسباب ، آثار اور تشخیص پر روشنی ڈالی ہے اب میں اپنے چند ذاتی تجربے بیان کروں گا جن کی وجہ سے مجھکو اس جدید مرض کی تحقیق اور تفتیش کی طرف متوجہ ہونا پڑا بات یہ ہوئی کہ مجھکو ۱۹۴۲ء میں نوکری کی وجہ سے لاہور آنا پڑا اور ایک سال تک نوکری میں مبتلا رہنے کے بعد تین سال تک خدا کے فضل سے اچھا رہا البتہ کبھی کبھی سوکھا ہونے کی شکایت ہو جاتی تھی ، سنہ ۱۹۴۶ء میں پرانی بیماری کا حملہ ہوا اور تمام جسم میں کچھ تبدیلی ہوئی ، خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا ورنہ کہنا یہ ہے کہ اسی سلسلے کے زمانے میں مجھکو اس مرض کے بے شمار بیماروں کو دیکھنے کا موقع ملا جو بجائے ہسپتال جانے کے فلم کمپنیوں میں ہر روز بہت بڑی تعداد میں آیا کرتے ہیں اور اعتقاد یہ رکھتے ہیں کہ یہی ان کا دار الشفاء ہے ایک سے ایک شریف زادے جن میں سے اکثر کے والد محترم کسی مسجد میں موذن کسی مکتب کے ملا اور اچھے خاصے مرد مومن ہوتے ہیں اور بلند اقبال ان کا نام روشن کرنے کے لئے فلم ایکٹر بننا چاہتے ہیں فلم ایکٹری بھی شرافت کے ساتھ کی جا سکتی ہے اور بہت سے کامیاب فلم ایکٹر نجیب الطرفین بھی ثابت ہو چکے ہیں اور ان کے شجرۂ نسب میں بھی کسی تبدیلی کی ضرورت آخر تک محسوس نہیں کی گئی مگر وہ تو فلم کمپنی میں ہیرو سے شروع ہو کر آخر میں ذلیل سے ذلیل کام کرنے کے لئے بھی تیار ہو جاتے ہیں اور اصرار یہی ہوتا ہے کہ ہیرو تو خیر مجھ کو میری صلاحیت بنا دے گی مگر آپ فلم بردار کی حیثیت ہی سے سہی فلم میں کام کرنے کا موقع تو دیں۔

ان بیچارے مریضوں کی خود اعتمادی غلط فہمی کی شکل اختیار کر لیتی ہے نگاہ غلط بین ہو جاتی ہے ضمیر انگڑائی لیتا ہے اور شیطان کان میں پھونک دیتا ہے کہ بیٹا تیرا مستقبل تجھ کو پکار رہا ہے کہ میں تجھ کو آدمی بننے کے بجائے جاری بنا دوں گا میری جان میں تجھ کو انسانیت کی پستیوں سے نکال کر ماسٹر نثار کا درجہ دیدوں۔ بس نگاہ آنکھیں بند کر عقل کو معطل کر اور بڑھ میری طرف میں تجھ کو کب تک بھلا مانس دیکھ کر خون کے آنسو بہاتا رہوں جبکہ میں یہ جانتا ہوں کہ تجھ کو اگر تو مرد ہے تو درگا موٹے اور عورت ہے تو درگا کھوٹے بنا دوں۔

یہ بیچارے بغیر اینہ دیکھے ہی چلے آتے ہیں۔ اکثر ایسے ہوتے ہیں کہ بنگال کے قحط کا اندازہ ان کی صورت سے ہو سکتا ہے بہت سے ایسے کہ دیکھنے والا حیران رہ جائے کہ ان کی تصویر زیادہ مناسب رہے گی یا کارٹون گڑانے والے نوجوان نہایت سنجیدگی کے ساتھ یہ بتلاتے ہیں کہ پروڈیوسر ان کو دیکھتے ہی جھومنے لگیگا خوشی کے مارے ناچے گا۔ اور دیوانوں کی طرح چیخ کر کہے گا۔ "آخر مل گیا مجھ کو میرا ہیرو مل گیا میرے تخیل کا وہ پیکر ، وہ میرے سامنے آ گیا جس کی جستجو میں میری زندگی گھسیٹ رہی ہوئی تھی ، وہ حقیقت منتظر لباس مجاز میں آ گئی جس کے لئے ہزاروں سجدے جبین نیاز میں تڑپ رہے تھے" مگر پروڈیوسر ان کو دیکھکر حیران رہ جاتا ہے کہ ان کو کیا بنائے یا ان کا کیا بنائے؟

فلمیریا کے مریض صرف اداکاری ہی کے خبط میں مبتلا نہیں ہوتے بلکہ بہت سے کہانی لکھو لکھو کر لایا کرتے ہیں بہت سے کہانیاں لے کر موجود ہوتے ہیں اور اس سلسلہ میں اس خاکسار کو بھی عجیب مصیبت میں مبتلا ہونا پڑتا ہے کہ ان فلمیریا کے مریضوں کے ساتھ کس طرح پیش آئے جب وہ اپنی کہانی سنانے بیٹھتے ہیں تو عام خیال ان کے ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ پروڈیوسر ان کی کہانی کا بیان سن کر جیسے ہمیشہ ہے اور ہماری

(باقی صفحہ ۴۳ پر)

پروفیسر اشہر لکھنوی ایم۔ اے

ہندوستان کا پہلا مغل باغبان

ہندوستان کی سرزمین اپنی تر و تازگی کے لئے ہمیشہ مشہور ہے اور رہے گی۔ اس کے سر بفلک پہاڑ، روح افزا گھاٹیاں اور آئینہ دار میدان ابدالآباد تک اہل وطن کے لئے طرۂ امتیاز بن کے قائم رہیں گے۔

علاوہ دوسرے سلاطین عہد ماضی کے وہ دور جو مغلوں کی سلطنت ہندوستان میں شروع ہوتا ہے اس نے بھی یہاں کے مختلف نباتاتی، جو آرائی زیبائی اور تمدنی شعبوں میں گوناگوں اضافے کر کے عملاً یہ ثابت کر دیا کہ ایران سے آنے والے صاحب اقتدار باشندوں کو اس زمین دامنگیر سے کس قدر ذہنی تعلق تھا اور کسی حد تک وہ اس کی زینت و زیبائش کے دل سے خواہاں تھے جیسا یہ خطہ جنت ریز و لطافت نواز تھا ویسے ہی اس کو سلطنت مغلیہ کے لطیف مزاج تاجدار ملے کیونکہ یہ امر بھی مسلمہ ہے کہ سرزمین ایران اپنی شاداب زمین اور لطافت آب مرغزاروں کی فضا کے پیدا ہونے والے افراد میں خوش گل اجسام، ذکاوت دماغ، اور احساسات لطیف پیدا کرنے میں اس کرۂ دلفریب پر آباد ہونیوالی تمام اقوام میں امتیاز خاص رکھتی ہے ——— اگر بابر بادشاہ ایران سے شکست کھا کر یہاں نہ وارد ہوتا اور وہیں اپنے مخالفین کو زیر کر لیتا تو اس کا جذبۂ زیبائش، فلاح ملک اس سے زیادہ برسر کار نہ ہوتا جتنا ہندوستان میں اس سے کام لیا گیا۔ لہٰذا ابراہیم لودی کو شکست دینے کے بعد اس کے مذکورہ بالا جذبے کامل فوراً ہی شروع ہو جاتا ہے اور اس زمین پر اس کی وہی نظر بہبودی و فلاح پڑنے لگتی ہے جیسی وہ ایران میں رہ کے وہاں کی فضا پر ڈالتا اور اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے مختلف ذرائع اختیار کرنے شروع کر دئے۔ اس نے سب سے پہلے اس نظر فریب منظر کے درست کرنے کی طرف توجہ منعطف کی جس کو دست قدرت نے سب سے پہلے صحن عالم پر نمایاں کیا تھا۔ یعنی "نباتات" پودے، نازک پودے! پھول، دلفریب پھول! ۔ ثمر، خوش ذائقہ دار ثمر!

یہ شستہ لطیف خیال اور رعایا پرور بادشاہ جو حیثیت ہندوستان کو ... آبیاری، باغبانی کرنے آیا تھا چنانچہ اس نے آگرہ میں جمنا کے جانب شرق ایک وسیع زمین کو ہموار کرنے کا حکم دیا اور مختلف درختوں کے پودے لگائے جانے کی تجویز کی جس کی طرف جہانگیر نے اپنے تزک میں یوں اشارہ کیا ہے۔

"حضرت فردوس مکانی بابر بادشاہ بعد از شکست دادن ابراہیم لودی بطرف شرقی آب جمنا در آگرہ زمینے خوش آب و ہوا انتخاب نمودہ احداث فرمودہ مرکز در آنجا باغ سلافت باغ بود، و شہرت تمام آن بگل افشان فرمودند۔"

پتہ چلتا ہے کہ اس باغ کی تکمیل و ترتیب میں فقط پیشہ وار باغبان و حکم بردار ملازمین ہی کی محنت و مشقت شامل نہیں تھی بلکہ خود اس منتقل باغبان نے اپنے ملک گیر ہاتھوں سے اس میں جا بجا تخم ریزیاں کیں اور کیاریاں بنائیں معمول کر لیا تھا کہ بعد عصر "گل افشان" تشریف لاتے تھے اور اپنی گلکاریاں دیکھ کے پھولے نہیں سماتے تھے۔ اراکین و عمائدین سلطنت میں بادشاہ کی اس گل افشانی نے ذوق چمن آرائی پیدا ہو گیا اور سینکڑوں چھوٹے بڑے باغ سرزمین آگرہ پر نظر آنے لگے جن میں اکثر و بیشتر "گل افشان" کی قلمیں لگائی گئی تھیں حتیٰ کہ سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار تک فضائے دارالسلطنت خوشبو ریز و ثمر خیز رہی

لیکن غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سے وقتی آگرہ کے اطراف و جوانب میں خاندان شاہی سے سلسلہ رکھنے والے ارباب ریاست اور متوسل سلطنت زمینداروں کی بیشتر جائدادیں یا تو دوسر تک نو دشمنوں کو بطور عطیہ بخش دی گئیں یا نیلام ہو گئیں۔ اسی سلسلے میں یہ رشک فردوس باغ بھی ایک ہندو خاندان کے ہاتھ لگا جس نے اس کا نام تبدیل کر کے رام باغ رکھ دیا تھا۔ مگر اس وقت بھی اسے پرانے اثرات کے تحت اسے بجائے "گل افشاں" کے بابر باغ کہتے ہیں۔

اگرچہ اس وقت اس باغ کی حیثیت تاج محل باغ یا شاہی باغ کے سامنے کچھ نہیں اس پر بھی سلطنت مغلیہ کے ابتدائی دور سے دلچسپی رکھنے والی آنکھیں اس باغ کی شکستہ تاریخ عمارت پر پڑی رہتی ہیں ——— اس وقت گل افشاں

کی جو صورت ہے وہ قابل ذکر نہیں البتہ جب بابر نے اس کی تشکیل کی تھی اس وقت کے درختوں کا شمار و بیان حسب ذیل ہے:-

خربزہ۔ آم اور دوسرے میوہ دار درخت اطراف و نواحی آگرہ میں بکثرت پائے جاتے تھے اور پائے جاتے ہیں ان سے بحث نہیں وہ تو باغ میں لگائے ہی گئے ہونگے البتہ اکبر بادشاہ کے عہد میں جن میوہ دار درختوں کا وجود ہندوستان میں نہ تھا غیر ولایتی درختوں کی قلمیں زمین ہند پر لگائی گئیں اور نہایت کثرت سے چنانچہ اقسام انگور مثلاً انگور صاحبی۔ انگور کشمشی، انگور شمشی، سرزمین پنجاب میں بیل چڑھے جن کے متعلق جہانگیر کی حسب ذیل یادداشت ملتی ہے چنانچہ لکھتا ہے:-

"در بازارہائے لاہور در موسم انگور آن مقدار کہ خواہند از ہر قسم و ہر جنس بہم میرسد"

اس کے بعد انناس کا نمبر آتا ہے اس کے متعلق بھی جہانگیر کی یادداشت سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین میں اس مفرح قلب اور زمین زاد پھل کا وجود نہ تھا اگرچہ اس وقت نواح برما میں بکثرت پیدا ہوتا ہے لکھتا ہے:-

"از جملہ میوہ میوہ الیست کہ آنرا انناس می نامند و در بنادر فرنگ می شود۔ در غایت خوشبوئی و راست مزگی ست و در باغ "گل افشاں" آگرہ ہر سال چندین ہزار بری آید"

ہندوستان کے خوشبودار پھولوں کی بابت جہانگیر کی رائے ہے کہ ان کو تمام عالم کے پھولوں پر ترجیح دی جاسکتی ہے ذیل کے پھول ایسی مست خوشبو رکھنے والے ہیں کہ جن کا مثل دنیا کے کسی خطے میں نہیں پایا جاتا۔

(۱) گل چنپہ۔ نہایت نازک بصورت اور خوشبودار جیسے گل زعفران لیکن یہ زرد ہوتا ہے اور وہ مائل بہ سپیدی۔ درخت بھی نظر فریب ہوتا ہے جس میں اچھا خاصہ گھناؤ بھی ہوتا ہے لطف یہ کہ موسم بہار میں اگر ایک پھول بھی شاخ میں ہوتا ہے تو تمام باغ عطر فروش ہو جاتا ہے۔

(۲) گل کیوڑہ۔ اس کی پتیاں دوہری نہیں ہوتیں خوشبو اس قدر تند و تیز ہوتی ہے کہ بوئے مشک سے کسی طرح کم نہیں۔

(۳) راے بیل۔ خوشبو میں یاسمن سفید کے مثل ہوتا ہے لیکن اس پھول میں ورق پائے جاتے ہیں۔

(۴) گل مولسری۔ جس کا درخت موزوں اندام اور سایہ دار ہوتا ہے اس میں نہایت بھینی خوشبو ہوتی ہے۔

(۵) گل سیوتی گل کیوڑہ کی طرح ہوتا ہے فرق یہ ہے کہ کیوڑے میں کانٹے ہوتے ہیں۔ اس میں نہیں ہوتے رنگ زردی مائل گل کیوڑے کی طرح سفید نہیں۔ ان سب پھولوں سے خوشبودار تیل بنتے ہیں۔

بڑے درختوں میں جن کا وجود ہندوستان میں نہ تھا سلطنت مغلیہ کی برکت سے ان کی اس عہد میں افراط ہوگئی ہے کہ اب معلوم ہوتا ہے کہ اسی سرزمین سے نشو و نما پاتے ہوئے ہیں مثلاً سرو، صنوبر، چنار، سفیدا مرد، بید مولہ، ان درختوں کا ہندوستان کو خیال بھی نہ تھا ان سب سے بڑھ کے درخت صندل کا ذکر ضروری ہے جو ہندوستان سے لایا گیا اور اب ہندوستان میں بکثرت پایا جاتا ہے

(تزک جہانگیری)

فلمیریا (صفحہ ۲۳ کا بقایا)

کہانی سننے کے بعد یقیناً یہ کہانی چرائے گا اس اچھوتے پلاٹ کو نے اڑے گا ان نمکین مکالموں کو اپنے دماغ میں محفوظ کرے گا اور پھر ان کو اپنا کارنامہ بنا کر فلم کمپنی سے نوکریاں، جاگیریں، خلعت اور طرح طرح کے انعام اکرام حاصل کرے گا اور ہم کو صاف جواب دے کر ٹالدے گا ادھر ہم غور کرتے ہیں کہ اس خرافات سے اپنے دماغ کو کس طرح بچائیں اگر اس کہانی کا کوئی جزو ہمارے دماغ میں کسی طرح رہ گیا تو وہ تمام ذہن کا چال چلن خراب کر دے گا کہانی سننے سے معلوم ہوتا ہے کہ کہانی کے ڈائریکٹر صاحب نے آج تک سینما دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی اور فلمی کہانی کو سونگھنے کا بھی اتفاق ان بیچارے کو کبھی نہیں ہوا ہے مگر سنانے کا انداز ایسا کہ گویا جواہرات دکھا رہے ہیں اور چوکنا ہیں کہ کوئی راز دیکھنے والا اٹھا کر جیب میں نہ ڈال لے گا گانے لانے والے ان سے بھی بڑھ کر صاحبان کمال، اگر نثر کے دو ٹکڑوں میں کہیں سے قافیے مل گئے ہیں تو یہ ان کا شاہکار ہے اور اگر ان کو قبول نہ کیا جائے تو سینریو بنانے کا انچارج یا تو جاہل ہے ورنہ متعصب۔

ان مریضوں پر غصہ آنے کی وجہ سے بہت سے کمپنی والے خود اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے ہیں مگر نقصان غریبوں پر کیا! وہ تو مریض ہیں ان کے لئے تو دعا کرنا چاہئے اسلئے کہ دوا اب تک دریافت نہیں ہوئی ہے۔

ارشد تھانوی

نظرِ خوش گذرے

ایک شاعرِ دیرینہ کا یہ قول ہے ارشد — ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد
بیچارہ نوازتی نہ کرے جو نہ ڈرے ہے

ہے تجربہ اس دور کے شاعر کا مگر اور — آیا ہے اسے رنگ زمانے کا نظر کچھ
جو راستی وفا آن ہے وہی جبیں کرے ہے

اب خیر و سعادت کے قوانین سنتے ہیں — تہذیب کے اخلاق کے آئین سے ہیں
مکاری و عیاری ہی دنیا کو برے ہے

وہ جن کا عمل سامراجانہ نہیں ہوتا — خرمن سے میسر انہیں دانہ نہیں ہوتا
سرسبز کھیت ان کے ہی گوسالہ چرے ہے

جو مصلحت اندیش ہے دل ریش نہیں ہے — احمق ہے وہ جو مصلحت اندیش نہیں ہے
نادانی سے تقدیر پہ الزام دھرے ہے

سو نیکیوں کا ایک ہے کتنا ہی وہ ہو بد — جو مقتدرِ عصر کی کرتا ہو خوشامد
پھر اس کا مقابل نہ ورے ہے نہ پرے ہے

معصوم سمجھتا نہیں جو اہلِ خطا کو — کہتا جو خداوند نہیں غیرِ خدا کو
اس عہدِ ترقی میں وہ بن آئی مرے ہے

جو شخص ضمیر اور دیانت کا ہے پابند — کولھو میں پلا کرتے ہیں اس کے زن و فرزند
سولی پہ لٹکنے کی مصیبت وہ بھرے ہے

بیٹھا ہوا میں رنگِ جہاں دیکھ رہا ہوں — دنیا تھی کہاں اب ہے کہاں دیکھ رہا ہوں
یہ بھی میری ارشد نظرِ خوش گذرے ہے

[illegible] ایم ۔ اے (عثمانیہ)

ادب کیا ہے؟

[illegible] ہزاروں سال کی دیرینہ [illegible] تہذیب نے ایک نمیر کو سہتے ۔ انسانیت [illegible] ہیں [illegible] دور وہ کی چیز ہوتی ہے [illegible] اور [illegible] باقی نہیں رہتی جو آرزو اور تمنا [illegible]

[illegible] تصورات جنم لیتے پال [illegible] سکتے [illegible] رہتے ہیں۔ پھر بعض کی آغوش میں [illegible] جنم لیتے ہیں ۔ ان کے چہرے اور قدامت سے ٹکراتے ہیں حیات کا [illegible] ارتقائی [illegible] منزلوں سے گزرتا حال کو سنوارتا اور مستقبل کی تخلیق کرتا [illegible] سے اپنی طرف رواں دواں چلا جا رہا ہے [illegible] تصورات تفکرات کی تبدیلیوں اور معاشی و معاشرتی تغیرات کے سائے میں قوموں کا آرٹ اور ادب پرورش پاتا رہا کل تک جن قدروں کو مین [illegible] سمجھا جاتا تھا آج وہ فرسودہ اور رجعت پسند ہو چکی ہیں اس لئے کہ ماضی کے سایوں پر بکھا جانا اور عہد حاضر کے ادب [illegible] ان کی ترویج و تخلیق [illegible] عقل کی [illegible] معلوم ہوتی ہے جبکہ زندگی ابتدائے آفرینش سے آج تک ارتقائی راہیں طے کرتی عصری کی جلو میں ترقی کی منزلوں کی طرف رواں دواں ہے ۔ ادب میں لکیر پیٹنا ماضی پر مرثیہ خوانی ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مرثیہ خوانی "خاص کی چیز" ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ماضی جس کے نشاۃ ثانیہ کے ترانے الاپے جا رہے ہیں دلکش اور درخشاں رہا ہو ۔ لیکن ادیب مستقبل کی طرف پیٹھ کئے ، حال کے تقاضوں سے منہ موڑے ، حقائق و واقعات کی دنیا پر صبر کر کے محض نوری دنیا اور من کو دنیائے سحر سے کوئی ایسا شہ کار پیش نہیں کر سکتا جس کے دل میں حقیقت کی دھڑکن ، اور جس کی فضاؤں میں زندہ اور عریاں حقیقتوں کی تڑپ پائی جاتی ہے اور ہمارے دکھ سکھ آرزوں اور تمناؤں [illegible] اور تمنایات کا ہو اور جو حال [illegible] ان اور مستقبل کا معمار کہلا سکے ۔

ادب کی قلمرو فکر و تخیل بے کراں ہے اور ادیب جمود و سکون ، متلاشی [illegible] مسرتوں کا شیدائی اور ماضی کی بھول بھلیوں کا رسیا نہیں ہوتا بلکہ وہ حرکت ، نشاط روح ، جدل مسلسل اور تغیر کا پیغامبر ہوتا ہے اس کی نگاہ کسی ایک نگار پر مرتکز ہو کر اسی کی نہیں ہو رہتی اور اگر کوئی دم کے لئے اس کی ہو رہے بھی تو خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہے

جو نظر قرار گیرد بہ نگار خوب روئے
تپد آں زماں دل من پئے خوب تر نگارے

اس لئے کہ بقول اقبال ہے

ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے
سر منزلے نہ دارم کہ بمیرم از قرارے

وہ سکون ، قدامت اور رجعت کا دشمن ہوتا ہے اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہر منزل سے گزر جاتا ہے ۔ بہشت کی بے کرانی بھی اس کی منزل نہیں ۔ اس لئے کہ وہ جاوداں ہوگی وہاں درد مندی کی نوا ہوگی نہ غم نہ غم گسار ۔

ہومر ، دانتے ، چاسر ، رود کی ، تلسی داس اور سلطان محمد قلی قطب شاہ سے لیکر جوش اور مخدوم تک شاعری مختلف اصناف متنوع تبدیلیوں اور متغیر اقدام کے باوجود تین مکاتیب خیال میں منقسم ہے ۔ مقصدی ، جمالیاتی اور واقعاتی ۔

مقصدی ادب کے علمبرداروں کا خیال ہے کہ ادب اور آرٹ کی روح اور عظمت موضوع کی اہمیت میں مضمر ہے ۔ اس لئے ادب اور آرٹ کے موضوع اور متن کا انسانیت کے لئے اہم اور ضروری ہونا لازمی ہے ۔ اس کو اخلاق ، خیر ، صداقت اور رہنمایانہ عناصر سے ہونا چاہیئے اس نظریئے کی رو سے آرٹ کی تخلیق میں اخلاقی ، معاشرتی اور تعمیری قدروں کی

کارفرمائی ضروری ہے۔

ادب برائے ادب یا جمالیاتی نقطۂ نظر سے ادب اور آرٹ کی رفعت اس کے (FORM) میں ہوتی ہے۔ آرٹ جو کچھ پیش کیا جائے وہ حسین اور تجزیہ انبساط ہو [illegible] فن کار کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے فن کے طلسم سے کسی شئے پر اس طرح چھا جائے کہ نتیجتاً انتہائی خوشگوار اثر پیدا ہو۔

واقعاتی مکتب خیال کے نمائندوں کا خیال ہے کہ آرٹ اور ادب کا کمال فن حقیقت کو من وعن پیش کرنے میں پوشیدہ ہے۔ فن کار کو اپنے موضوع سے خلوص ہو اور وہ مبنی برحقیقت ہو۔

ٹالسٹائے نے حقیقی آرٹ کے لئے یہ التزام عائد کیا ہے کہ فن کار کی تخلیق کسی نہ کسی اعتبار سے نئی ہو۔ اس کا متن انسانیت کے لئے ضروری ہو اور اسلوب واظہار سریع الفہم ہو۔ آرٹ اور ادب کی تخلیق میں بیرونی اثرات اور تمدیدات نہیں بلکہ اندرونی تحریک کارفرما ہو یعنی ادب وہ ہے جس میں کوئی نئی اور تازہ بات پیش کی گئی ہو اور وہ کسی نہ کسی حد تک متن، سانچے، اسلوب اور خلوص کے تلازموں کی تکمیل کرتا ہو۔ ان میں سے کسی ایک بات کی بھی کمی رہ جائے تو وہ ادبی تخلیق نہیں کہلائے گی۔

افلاطون اور ارسطو کے نقاط نظر سے آرٹ اور ادب نقالی ہیں لیکن استاد اور شاگرد کے تصورات نقل میں انتہائی بُعد ہے جتنا ان کے نظام فکر میں پایا جاتا ہے۔ افلاطون حسن مجرد کا قائل تھا اور اس کائنات رنگ و بو کو حسن مطلق کا پرتو یا نقل تصور کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ آرٹ کے موضوع جو اسی کائنات سے وابستہ ہوتے ہیں نقل کی نقل ہوئے لیکن "ریاست" کے علاوہ دوسرے مکالمات میں افلاطون نے شعر و ادب کو نقالی کہکر نظر انداز نہیں کیا بلکہ ان کی عظمت و سربلندی کا اعتراف کیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ جذبۂ شعری ایک طرح کا جنون ہے جس کا محرک ایک جذبۂ قدسی ہے اور یہ جذبۂ قدسی منجر بہ تخلیق ہوتا ہے۔ شاعری کے ذریعے دیوتا اپنا الہام عوام تک پہونچاتے ہیں اس لئے شاعر کی نظریں حق و حقیقت پر مبذول رہنی چاہئیں۔

افلاطون کے برخلاف ارسطو نے شاعری کو انسان کے اعمال، افعال، [illegible] اور جذبات کی نقل کہا ہے۔ اور اسے سیاست اخلاق اور مذہب کے جو [illegible] سے آزاد رکھنے کی کوشش کی ہے

اس کے باوجود [illegible] آرٹ کی تعلیمی [illegible]
نقل و واقعیت سے [illegible]

[illegible]

[illegible]

کے مقصد [illegible] محدود [illegible] اشارے موجود ہیں۔ اس لئے [illegible] نقال نہیں [illegible] اسے [illegible] زمانے میں پیش [illegible] کی نظر ماضی [illegible] رہتی ہے اور وہ زندگی کے معمولی [illegible] اجتناب نہیں کرتا۔

ارسطو نے اس طرح افلاطون کے تصور [illegible] پر ایک کاری ضرب لگائی [illegible] شعر و ادب بالواسطہ یا بلاواسطہ [illegible] سمجھا جائے [illegible] یونانی [illegible] کچھ سوچنے کی [illegible] کی شکل میں یونانی ادب [illegible] اور آرٹ ایک قوت [illegible]

آج کا ادیب عدم مقصدیت [illegible] تصوریت اور جمالیاتی ہونے کا شکار ہے اور [illegible] کا شہید ناز۔ اگرچہ ارسطو کی صدائے بازگشت کبھی [illegible] میں آج بھی سنائی دیتی ہے کہ "خیالات و [illegible] کو اس طرح پیش کیا جائے کہ قاری کو مسرت حاصل ہو اور [illegible] معلومات میں اضافہ [illegible] نہ ہو کہ پیرایۂ بیان و اسلوب اس قدر دلچسپ ہو کہ ذوق جمال کو تسکین ہو جائے [illegible] ادب خارجی صداقت کا حامل نہیں بلکہ داخلی صداقت کا حامل ہے" لیکن یہ تصوری نظریے واقعیت پرست اور حقیقت شناس [illegible] کرتے جا رہے ہیں [illegible] بے کرانی کو داخلیت تک محدود کرنا [illegible] کی اہمیت و عظمت کو گھٹانا اور اس [illegible] محدود [illegible] اس لئے کہ [illegible] ادب میں [illegible]

زندگی کا تمام سرمایہ موجود ہوتا ہے جنہیں تصرف میں لایا جاتا ہے، اور جن سے انسانیت کے لئے ایک طلسم بنایا جاتا ہے۔ ادب میں حسن اس قوت سے عبارت ہے جو دل و دماغ کے واسطے سے انسان کو مسحور کرتا ہے اور محاورۂ حیات کے ذریعہ تکمیل بخشتا ہے۔"

اسی لئے عہد حاضر کے ادیب، ادب اور آرٹ کو زندگی کا ترجمان، معاشرت کا عنصر، حال کا ناقد اور مستقبل کا خالق تصور کرتے ہیں۔ اس لئے بقول ایمرسن "ادب انسان کی وہ کوشش ہے جس میں وہ اپنی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔" کائنات کی بہتری اور انسانیت کی بہتری کے لئے وہ پیکر حسین تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ وہ زندگی کے ugly face کو بھی اجاگر کرنے لگا ہے کہ فطرت کائنات اور نظام عالم کے نقص اور ناتمامی کو سربلندی کے نقطۂ کمال تک پہونچا دے۔ وہ مظاہر فطرت، خیالات، تفکرات، جذبات و تجربات اور نظام حیات کو تحلیل کر کے ایک نئی دنیا اور نئے آدم کی تخلیق کا نقشہ تیار کر رہا ہے۔

ادب جذبہ، احساس، تخیل، تجربہ اور تجزیہ کی پیداوار ہوتا ہے۔ اس میں انفرادیت، شخصیت اور [illegible] کے ساتھ وہ بشری اور عصری خد و خال بھی نظر آتے ہیں۔ کوئی ادبی شہ پارہ ماضی کی درخشانیوں کا جائزہ نہیں ہوتا بلکہ حال کے دل کی دھڑکنوں کا امین اور مستقبل کی روحانی، مادی، معاشری اور معاشی ترقیوں کی نوید ہوتا ہے۔ اس میں مفض شعور سے وہ بھی اور ہمہ گیر اقدار ہم آہنگ ہو کر اعجاز بن جاتے ہیں۔ ادبی تخلیق ہمیشہ تازہ، زندہ اور بیدار رہتی ہے۔ اس لئے کہ ہر حسن کارانہ تخلیق زندگی کے ایک نئے شعور کا انکشاف ہے (ان قوانین کے تحت جو ہمارے دسترس سے باہر ہیں) جو حسن کار کی روح میں انگڑائی لیتا ہے اور ابھر ہو چکنے پر ان راہوں کو روشن کر دیتا ہے جن پر سے ہو کر انسانیت ترقی اور کمال کی منزل کو پہونچتی ہے۔" وہی ادب اپنے عصر کا سب سے بلند حسن کار ہے جس کی نظریں ماضی کی پرچھائیوں کو ڈھونڈنے کی بجائے مستقبل کے نقشے ڈالنے میں معروف ہوں۔ اس لئے کہ:-

وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہر فردا

ماضی مورخ کی جولانگاہ ہے اور تاریخ ادب سے کم پایہ چیز ہے۔ شاعر اور مورخ محض نظم اور نثر لکھنے کی وجہ سے ایک دوسرے سے ممیز نہیں ہیں بلکہ ——— ایک تو (مورخ) یہ بیان کرتا ہے کہ کیا پیش آ چکا اور دوسرا (شاعر) یہ بیان کرتا ہے کہ کیا پیش آ سکتا ہے۔ اسی وجہ سے شاعری تاریخ کے مقابلے میں زیادہ فلسفیانہ اور زیادہ بہتر چیز ہے۔ کیونکہ شاعری عام حقیقت سے آگاہ کرتی ہے اور تاریخ خاص سے۔"

فلسفہ اور ادب کا تعلق بھی عجیب دلچسپ اور پر پیچ ہے۔ ہر بڑا شاعر فلسفی ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر بڑا مفکر شاعر بھی ہو۔ جب فلسفہ اور شعر اپنی پوری صوری و معنوی محاسن و مکائف کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتے ہیں تو شعر نہ صرف جادو جگانے لگتا ہے بلکہ اس میں وہ الہامی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو جذب پیغمبری سے بلند ہو کر انسان کو یہ کہنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ:-

خالق کے نام سے متصف ہونے کا کسی کو حق نہیں پہونچتا
سوائے خدا اور شاعر کے"

یہ بتلانا مشکل ہے کہ فلسفے کے حدود کہاں ختم ہوتے ہیں اور حسن کارانہ فضا کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ ہاں اگر فلسفے کی تعریف یہی ہے کہ ——— "فلسفہ تلاش حق کا بابِ نمبر ہے" یا "عقلیت کی حد بندی کا ایک علم ہے" تو یقیناً ادب اور آرٹ میں یہ خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں۔ اور ادب ادب ہوتے ہوئے بھی فلسفے کے اس نقطۂ کمال پر پہونچ جاتا ہے، جہاں فکر دماغ نشیں ہی نہیں دل نشین بھی ہو جاتی ہے۔ اور استدلال چراغ چراغ رہ گذر بنا سیاست و رہبان کا شکار رہتا ہے۔

دیکھا آپ نے ادب ایک ایسا مرکز ہے جہاں مختلف مختلف شعبہ جات علم و جہات کے دھارے خود بخود سمٹ آتے ہیں اور انسانیت کے تہذیبی دھارے کو بے مثال بنا دیتے ہیں۔

(نشتر)

ناظرین قوم کی خدمت میں عرض ہے کہ وہ خط و کتابت میں چندے نمبر کا حوالہ ضرور دیں

وجاہت سندیلوی بی، اے، ایل، ایل، بی

چھمی خالہ

چھمی خالہ کی عصمت مآبی سارے گھر کے لئے ایک وبال جان تھی مجھے بھی ایک عجیب و غریب طریقے سے اس سے دوچار ہونا پڑا۔

میرا ماموں زاد بھائی اصغر میرے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا اس کا بہت دنوں سے اصرار تھا کہ میں اس کے ساتھ اس کے گھر چلوں جو لکھنؤ سے چار گھنٹے کی مسافت پر واقع تھا۔ اور بالآخر ایک دفعہ ڈ مبر کی چھٹیوں میں وہ مجھے اپنے ساتھ گھسیٹ ہی لے گیا۔ ماموں دورہ پر گئے ہوئے تھے۔ اصغر مجھے باہر کے کمرے میں بٹھا کر اندر ممانی جان سے میری آمد کی اطلاع کرنے چلا گیا۔ میں تھکا ہوا تھا ذرا کمر سیدھی کرنے کے لئے ایک طرف صوفے پر لیٹ گیا۔ دفعتاً کمرے کا پچھلا دروازہ جو زنان خانہ میں کھلتا تھا کھلا۔ اور ایک خوش اندام لڑکی سفید ساری پہنے گنگناتی ہوئی آئی۔ اور بغیر مجھے دیکھے ہوئے اس نے بائیں جانب شیشے کی الماری کھول کر اس میں سے ایک کتاب نکالی اور پھر پچھلے دروازہ کی طرف چلی — دفعتاً اس نے اس نے میری طرف آنکھیں اٹھائیں — اس کے منہ سے ایک سہمی ہوئی سی چیخ نکلی اور وہ بے تحاشا قالین پر گر کر بے ہوش ہوگئی۔

یہ کیا؟ میں دوڑ پڑا۔ میں نے دیکھا کہ بے ہوش ہونے والی لڑکی نہیں بلکہ اٹھائیس تیس سال کی ایک نازک خدوخال والی عورت تھی جو آنکھیں بند کئے سسکیاں لے رہی ہے۔ مجھے پہلا خیال یہ گزرا کہ میں بے ہوش ہونے والی کو اٹھا کر صوفے پر لٹا دوں لیکن پھر مجھے اپنا ہندوستانی طرز معاشرت یاد آگیا جس میں ایک مرد کا کسی نامحرم عورت کے جسم پر ہاتھ لگانا انتہائی معیوب تصور کیا جاتا ہے مجھے یاد تھا کہ میری ایک رشتہ کی چچی کے سینے میں پھوڑا تھا لیکن اس کے متعلق انھوں نے مرجانا قبول کر لیا تھا لیکن یہ منظور نہیں کیا تھا کہ وہ اس کو کسی حکیم یا ڈاکٹر کو دکھائیں — میں عجیب مخمصہ میں تھا میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں — کہ اتنے میں اصغر آگیا

"ارے چھمی خالہ بے ہوش ہوگئیں! یہ کیسے؟"

"وہ آئیں اور مجھے دیکھتے ہی چیخ مار کر گر پڑیں!"

اصغر جلدی سے پانی لایا اور چھمی خالہ کے چہرہ پر چھینٹے دینے لگا چند ساعتوں میں ان کو ہوش آگیا اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ میں اصغر کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس نے مجھے اشارہ کیا کہ میں کمرے کے باہر چلا جاؤں تاکہ چھمی خالہ کے پھر بے ہوش ہوجانے کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اصغر نے مجھے کمرے میں بلایا تو وہ جا چکی تھیں

میں ممانی جان سے ملنے اندر گیا تو پہلے تو چھمی خالہ نے مجھ سے پردہ کیا اور ایک کوٹھری میں جا چھپیں۔ لیکن جب ممانی جان نے ان سے پکار کر کہا "دیوانی ہوگئی ہے چھمی! آخر شبو سے کیا پردہ! جیسا اصغر ویسا شبو۔ آخر ان کی ماں اور بہنیں معراج کے سامنے کیسے آتی ہیں؟" تو چھمی خالہ بہت سہمی اور شرمائی ہوئی کوٹھری سے نکلیں۔ اور میری جانب سے گھونگھٹ نکال کر ایک کونے میں بیٹھ گئیں۔ میں نے سلام کیا تو انتہائی دھیمی آواز سے کہا "جیتے رہو"

انھیں دیکھ کر نہیں معلوم کیوں مجھے ہنسی آگئی اور اس کو ضبط کرنے کے لئے میں نے پوچھ بیٹھا۔ "کیسا مزاج ہے آپ کا؟"

اس کا جواب انھوں نے یہ دیا کہ فوراً بھاگ کر پھر کوٹھری میں جا چھپیں۔ ممانی جان پکارتی ہی رہ گئیں اور بالآخر یہ کہکر چپ ہو رہیں "دیوانی تو ہے ہی!"

کئی گھنٹوں تک ممانی جان اور اپنی ماموں زاد بہنوں سے باتیں کرنے

اور انھیں مانتے کے دن تک ... لائبریری میں ... اور اصغر سنا ہوتے تو میں نے بھی خالہ کا تذکرہ چھیڑا۔ مجھے ایک عجیب سی بات معلوم ہوئی تھی ان کی ... تک میں نے کسی عورت کو ... ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ اور خصوصاً اس طور سے لیٹ کر بکنا ... مجھ سے متاثر ہو گئی تھیں یا ڈر گئی تھیں ... نہ تو آنا خوبصورت تھا ... تیا ... لیٹے لیٹے بے ہوش رہا میں ... شہزادی ... پر عاشق ہو گئی ... ہوش پورا ... شہزادیوں کی جانب نہیں بلکہ شہزادہ ... کے لئے کیا صرف چیخ کافی نہ تھی؟ بے ہوش ہو جانا کیا ضروری تھا؟ لیکن بے ہوش ہو جانا تو شاید ایک غیر اختیاری فعل ہے۔

اصغر کہنے لگا "بھئی عجیب چیز ہیں یہ بھی خالہ بھی! ایک مہینہ میں یہ تین چار دفعہ بے ہوش ضرور ہو جاتی ہیں۔ ان کو اپنے اوپر حالات اور سانحات طاری کرنے کا شوق ہے۔ شروع شروع میں جب یہ ہمارے گھر آئی تھیں تو میں ان سے بہت ڈرتا اور اب بھی میرے اور اماں کے علاوہ گھر کے سب لوگ ان کی عجیب و غریب حرکتوں کے باعث ان سے خائف ہی رہتے ہیں۔ ان کی والدہ ان کی پیدائش ہی کے وقت انتقال کر گئی تھیں اور ان کے والد ہمیشہ بسلسلۂ ملازمت ان سے دور رہے۔ حتیٰ کہ ان کو ان کی صورت تک یاد نہیں۔ ان کی تمام تر پرورش ان کی ایک بڈھی کھوسٹ اور حد درجہ جاہل اور توہم پرست نانی نے کی۔ اس بڑھیا نے ایک بڑے سے سنسان گھر میں ان کے لئے انتہائی سخت گیر اور غیر معصومی ماحول قائم کر رکھا تھا۔ اور چوبیس گھنٹہ میں ایک لمحہ کے لیے بھی وہ ان کو اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتی۔ یہاں تک کہ ان کو اپنے بہت قریبی خاندان والوں تک سے ملنے کی ممانعت تھی۔ ان کی عمر ... سال کی ہوئی تو اس بڑھیا نے اپنے پیرزادے ایک بڈھے مولوی سے ان کی شادی کر دی۔ مولوی بالکل ہی از کار رفتہ اور قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے بڑھاپے کا انتقام بھی خالہ کی جوانی سے خوب ہی لیا۔ وہ خواہ مخواہ ان کو ہمیشہ مشتبہ نظروں سے دیکھتا۔ اور ان کی انتہائی ظالمانہ حد تک کڑی نگرانی کرتا۔ اس کے تب و ستم سے بیچاری خالہ کا مختل زندگی بالکل تباہ ہو کر رہ گیا۔ اور ان میں بڑھنے اور ابھرنے کی رہی سہی صلاحیت بھی ختم ہو گئی۔ دس سال تک یہ اس کی قید میں رہیں پانچ سال ہوئے جب وہ مولوی مر گیا اور اس وقت سے خالہ کو آزادی

نصیب ہوئی ہے۔ لیکن اب یہ آزادی کس کام کی؟ خالہ کی روح کب کی مردہ ہو چکی ہے اور وہ غلامی کی اس قدر عادی ہو چکی ہیں کہ ان کو اپنی یہ آزادی غلامی سے بھی بدتر معلوم ہوتی ہے۔ آج دوپہر ہی میں وہ اپنے شوہر مولوی کو یاد کر کے آنسو بہا رہی تھیں۔ اب وہ ادھر ادھر بھرے ... کے ساتھ رہتی پھرتی ہیں۔ ایک سال سے اماں نے بلا کر رکھ لیا ہے ... ان کا ... اپنی عصمت مآبی کی تشہیر رہ گیا ہے۔"

اصغر کی زبانی بیچاری خالہ کی کہانی سنتے سنتے میں ایک عجیب سوچ میں پڑ گیا۔ یہ آخر عورت کی عصمت مآبی ہے کیا بلا؟ اس کے متعلق نہیں معلوم ہم لوگوں کے اس قدر وحشیانہ اور منفی جذبات کیوں ہوتے ہیں! مانا کہ یہ بڑی اچھی بات ہے۔ مذہب نے بھی بتایا ہے۔ اخلاق بھی یہی کہتا ہے عقل سلیم بھی اسی کی طرف مائل ہوتی ہے لیکن تب بھی اس کی اس قدر بے دردی اہمیت کیوں ہے؟ آج ہر متوسط طبقے کے گھر میں جیسی خالہ کے جیسے اور خاکے نظر آتے ہیں۔ لڑکیاں کیا ہیں کچلی ہوئی، ادھوری اور سہمی ہوئی جذبات کی زندہ نعشیں ہیں۔ زندگی کی تازگی، نشاط کی تابندگی حتیٰ کہ دل و دماغ کی پاکیزگی یہ سب کچھ مذہبی ناموں، مزاج مجبوریوں، جاہل ماؤں اور نکتہ چیں بھاوجوں کے ہاتھوں حماقت اور جہالت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ اور پھر اس عظیم الشان قربانی کے بعد غریب لڑکیوں کو کیا ملتا ہے؟ —— عصمت مآبی ——

کیسی چیز؟ کاش کہ کوئی ان نابینوں، رحمیوں، ماؤں اور بھاوجوں کو سمجھا سکتا کہ عصمت مآبی کا یہ جابرانہ ڈھونگ جو تمہاری غیر عصمت مآبی کی حمایت کرتا ہے تمہارے خیالات گندے اور تمہارا ذہن مسموم ہے تم جس چیز کو لڑکیوں کے معصوم قہقہوں، والہانہ ڈھلکے ہوئے آنچلوں اور الھڑپن کی نئی چال اور تاک جھانک میں ڈھونڈھتی پھرتی ہو وہ درحقیقت خود تمہارے دماغوں میں چھپا بیٹھا ہے —— لیکن یہ ... نیاں وغیرہ خود بھی تو کبھی لڑکیاں تھیں —— تو گویا ایک نسل اپنے سے پہلے والی نسل کے ہاتھوں اپنے قتل کا اپنے سے بعد میں آنے والی نسل سے قصاص لیتی ہے —— اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری ہے کب سے جاری ہے —— لیکن یہ کب تک جاری رہے گا؟ اس کا کوئی پتہ نہیں

مگر خاموش ... اصغر بولا "بھئی خالہ دوسرے دن سے بے حد خائف ہیں ... دل میں سما گیا ہے کہ ... آنکھ اٹھاتا ہے تو ہمیشہ بڑی ہیبت سے ... دوسرا ... کوئی دوسرا ...

ہیں یہ اور بھی زیادہ برائی ہے۔ یہ بچیوں کو ورغلایا اور بگاڑا کرتے ہیں۔

"شیر تھی خالہ کی تو ایک غیر معمولی نوعیت ہے ورنہ سچ پوچھو تو متوسط طبقے کی اسی فیصدی لڑکیوں کے یہی خیالات ہوتے ہیں ہماری معاشرت میں لڑکے اور لڑکی کے درمیان ایسا مصنوعی اور غیر فطری حول قائم کیا جاتا ہے کہ لڑکی لڑکے کو ہمیشہ چور اور لڑکا لڑکی کو ہمیشہ چرانے والی چیز تصور کرتا ہے۔ یہ ماحول قائم اس لئے کیا جاتا ہے کہ چوری نہ ہو سکے لیکن درحقیقت چوری روکنا تو درکنار یہ تو چوری کرنے اور چور کی ہو جانے کے لئے اور بھی زیادہ ورغلاتا ہے۔" میں نے کہا۔

"سچ ہے" اصغر کہنے لگا "یہ تیدی جیل خانے کی چار دیواری کو ہمیشہ اس نظر سے دیکھتا ہے کہ یہ اس کی آزادی میں حائل ہے۔ اس کی دلی خواہش یہی رہتی ہے کہ وہ کسی طرح اس کو پھاند جائے۔ وہ کبھی یہ سوچ ہی نہیں سکتا کہ اس دیوار کا ایک مقصد اس کی حفاظت اور اس کو موسم کی دست درازیوں سے بچانا بھی ہے۔"

ہم لوگ اسی طرح کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کھانے کی طلب ہوئی تو ہم لوگ اٹھ کر اندر چلے گئے۔ سارے بچے کھا چکے تھے۔ معلوم ہوا کہ آج لڑکے سرمیں درد ہے۔

مامی جان میرا ضرورت سے زیادہ خیال رکھتی تھیں۔ شاید وہ ان کے سامنے منا ان کا واسطہ ہے کہ اور کوئی کام ہی نہ تھا کہ وہ میری خاطر داری کرتی رہتی ہیں۔ ان کی بنا ہیں اور شفقت کے اس سیلاب سے مجھے عجب سا ہو جاتا۔ باورچی سے کہتیں "دیکھو شبو میاں کے لئے پلاؤ پکانا ہے۔ یہی تو ایک چیز ہے جسے یہ شوق سے کھاتے ہیں۔ ذرا محنت سے دیکھ بھال کر بنانا۔" گھر کے ملازم کو حکم دیتیں "دیکھو شبو میاں کے لئے غسل خانہ میں گرم پانی رکھ آؤ۔" عابدہ پر جھنجھلاتیں "صبح سے بھائی میاں کے لئے پان نہیں بنائے۔ تم دیکھتی نہیں کتنی دیر سے منہ خشک ہے۔" ملازمہ کو دوڑاتیں "ذرا فاروق کے یہاں سے انڈے تو لے آ۔ حلوہ میں پیتی آنا۔ شبو میاں کے لئے حلوا بنے گا۔" شاکرہ کو سمجھاتیں "وہ تو اس کے خلاف تم نے اپنے ابا میاں کے لئے بنائے ہیں وہ اپنے بھائی جان کو دیدو۔ میں پھر منگا دونگی ان کے لئے اور بنا دینا۔" غرض یہ کہ صرف ایک لئے نہیں سارے گھر کے لئے مامی جان مجھے زبردستی مرکز توجہ بنا رہی تھیں۔ میں جانتا کہ وہ ایسا کیوں کرتیں۔ ہندوستانی

لڑکی کی ماں بیچاری بڑی ہی غرض مند ہوتی ہے۔ مامی جان ایک طرف مجھے سارے گھر کا مرکز توجہ بنانے کی کوشش کرتیں اور دوسری طرف ان کی یہ بھی کوشش ہوتی کہ میری مرکز توجہ شاکرہ بن جائے۔ وہ مجھ سے جو کوئی بھی بات کرتیں اس میں شاکرہ کی مدح سرائی کا پہلو ضرور ہوتا۔ شاکرہ اس کی اپنے درجہ میں اول آتی ہے۔ اس کے کالج کی ہیڈ مسٹریس تعریف کرتی تھیں کہتی تھیں کہ میں نے اتنی سمجھ دار اور محنتی لڑکی تو کبھی دیکھی ہی نہیں۔ یہی محنت کا تو نتیجہ ہے کہ بالکل زرد ہو گئی ہے۔" میں نے کھڑکیوں کے نئے خوبصورت پردوں کی تعریف کر دی تو فوراً خوش ہو کر کہنے لگیں "ارے یہ تو تمہاری بہن شاکرہ ہی کی کاریگری ہے۔ اور یہ پردے کیا؟ یہ تو تمہارے ماموں نے تو بس محبت سے منوائے تھے۔ بنانے ہی نہیں دیا غریب کو ورنہ وہ تو ایسی کاریگر ہے ماشاء اللہ تصویر کھینچ دیتی ہے۔ کاڑھنے میں بھی تو اس کو اسکول میں انعام مل چکا۔" کھانے میں ذرا دیر ہوتی تو مامی جان نے کہنا شروع کیا "یہ باورچی تو دیکھو اونگھ اونگھ کر کام کرتا ہے۔ ہاتھ ہی نہیں چلتا اس کا۔ ابھی پچھلے اتوار کو تمہارے ماموں جان رات میں نو بجے شکار سے لوٹے تو ان کے ساتھ میجر صاحب۔ ان کا لڑکا ایک راؤ بہادر صاحب اور ایک وکیل صاحب کو بھی لیتے آئے اور آتے ہی شور مچایا کہ کھانا لاؤ ہم لوگ دن بھر کے بھوکے ہیں۔ میرے تو ہاتھ پیر پھول گئے۔ باورچی گھر جا چکا تھا۔ اور رکھا رکھا بھی نہیں تھا۔ لیکن تمہاری بہن شاکرہ اور عابدہ ہی کے دم تھے کہ جتنی دیر میں ان لوگوں نے منہ ہاتھ دھوئے اور چائے پی۔ ان لوگوں نے پراٹھے شکار کا قورمہ انڈوں کا خاگینہ آلو کا بھرتہ اور سویوں کا مزعفر تیار کر کے رکھ دیا۔ تمہارے ماموں کو تو یقین نہیں آتا کہ اتنی ہی دیر میں یہ سب کچھ ہو گیا۔

شاکرہ سولہ سترہ سال کی موٹی سی لڑکی تھی لیکن اس کا معصوم چہرہ بڑا دلکش تھا۔ اس سے کام کے لئے کہا جاتا لیکن وہ گھوم پھر کر میرے ہی سامنے آکر بیٹھ جاتی۔ وہ مجھے کچھ عجیب دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتی۔ میں نے اس سے بات کرنا چاہی لیکن جتنی دفعہ میں نے یہ کوشش کی ہر دفعہ مامی یہاں آکر بیچ میں حائل ہو جاتیں ہر بات کا جواب وہ خود دیتیں۔ [illegible] لیکن قبل اس کے کہ شاکرہ [illegible] تاریخ - جغرافیہ - فارسی اور انگریزی" میں تھی۔ "لیکن اصغر تو مجھ سے کہتا تھا کہ یہ معاشیات لیں گی۔" مامی جان

نے پھر سلسلۂ کلام اپنے ہی ہاتھ میں رکھا۔ ماموں جان نے کہا کہ بس تم یہی مضامین لو۔ ان میں تمہیں بہت زیادہ نمبر ملیں گے"
اسی طرح کئی مرتبہ میں نے شاکرہ سے بالواسطہ گفتگو کرنا چاہی لیکن ممانی جان نے شاید اس خیال سے کہ وہ ان سے بہتر بات نہیں کر سکتی اس کو بولنے ہی نہیں دیا۔ عابدہ صورت اور عمر میں شاکرہ ہی کی چھوٹی بہن تھی لیکن وہ مجھ سے زیادہ بے تکلف تھی اور خوب باتیں کرتی تھی۔

شام کو ہم سب برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ممانی جان کسی کام سے اندر چلی گئیں تو میں شاکرہ سے باتیں کرنے لگا۔ وہ میری باتوں کا جواب خوش ہو کر دے رہی تھی۔ اتنے میں چھمی خالہ دوپٹے سے سوائے آنکھوں اور ناک کے سارا چہرہ چھپائے آ گئیں اور شاکرہ کے پاس ایک کنارے پر بیٹھ گئیں۔ میں نے سلام کیا۔ انھوں نے دوپٹہ کے اندر سے ہونٹ ہلائے لیکن میں کچھ سن نہ سکا۔ میں نے شاکرہ سے پوچھا "ایسے عمدہ کڑھے ہوئے تکیہ کے غلاف تو میں نے آج تک دیکھے ہی نہیں۔ بتاؤ اب میں تمہیں ان کا انعام کیا دوں؟"
عابدہ بیچ میں بول اٹھی "وہ سرخ بیل والا میرا بنایا ہوا ہے اور وہ آسمانی پھول بھی تو میں ہی نے کاڑھے ہیں"۔ شاکرہ تیز ہو کر کچھ بولنے ہی والی تھی کہ چھمی خالہ نے اُسے کہنی ماری اور وہ چپ رہی۔ چھمی خالہ نے انکھیوں سے مجھے کچھ ایسے دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں "ایک بھولی لڑکی کو بہکانا چاہتے ہو؟ خبردار!"
اتنے میں زاہدہ میری سب سے چھوٹی سات برس کی ماموں زاد بہن آ گئی اور اصغر سے کہنے لگی "بھائی جان میری بلّی نے بچے دیئے ہیں لیکن سب کالے ہی کالے ہیں"۔
"لیکن تمہاری بلی تو سفید ہے نا؟" اصغر نے کہا
"کلو کہتا ہے کہ یہ پڑوسن کے کالے بلے کے بچے ہیں"
زاہدہ نے ٹھنک کر کہا "بھائی جان بتائیے بچے میری سفید کے ہیں یا پڑوسن کے کالے بلے کے؟"
"دونوں کے" عابدہ بولی۔
ایک قہقہہ کے ساتھ چھمی خالہ کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹ پڑی اور میز پر گر کے چکنا چور ہو گئی۔ چھمی خالہ بے تحاشہ اپنے کمرہ کی طرف بھاگیں۔

دوسرے روز کوئی نو بجے ہوں گے میں اور اصغر باہر دھوپ میں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے کہ دفعتاً اندر مکان سے ایک دلدوز چیخ کی آواز سنائی دی۔ اور اس کے بعد ہی کسی کے گرنے سے دھماکا ہوا۔ اصغر بھاگا اور اس کے پیچھے میں بھی ہو لیا۔ اندر پہونچ کر معلوم ہوا کہ چھمی خالہ اپنے کمرے میں کپڑے بدل رہی تھیں اور دفعتاً کپڑے بدلتے ہی بدلتے چیخ مار کر گر پڑی ہیں۔ بڑی مشکل سے انکی طبیعت ٹھکانے پر آئی۔ اور ممانی جان نے بہت ڈانٹ کر پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ ان کے کمرہ کا پردہ ہوا سے ہلا تو انھوں نے دیکھا کہ کوئی آدمی سڑک پر عین انکی کھڑکی کے نیچے کھڑا ہے اور ان کو اشارے کر رہا ہے۔ یہ سن کر شاکرہ اور عابدہ خوب ہنسیں اور ممانی جان ان پر دانت پیستی ہی رہ گئیں۔
تھوڑی دیر بعد ہم لوگ پھر باہر آکر بیٹھ گئے۔ سامنے سے کلّو گزرا میں نے اس سے کہا "دیکھو اندر برآمدے میں میں اپنی عینک بھول آیا ہوں لے آؤ"۔ اصغر نے بتایا کہ "چھمی خالہ کی وجہ سے کلو کو بھی اندر جانے کی ممانعت ہے۔ اس لڑکے کو شام سے سو جانے کی عادت ہے لہذا روزانہ شام ہوتے ہی یہ کہیں چھپ کر سو جاتا ہے تاکہ جگایا نہ جا سکے۔ ایک روز شامت کا مارا یہ چھمی خالہ کے پلنگ کے نیچے گھس کر سو رہا۔ صبح کو انھیں معلوم ہوا تو ان کی دیکھنے والی کیفیت تھی۔ سارے گھر میں قیامت برپا کر دی اور چیلنج دیدیا کہ اگر کلو گھر میں آئے گا تو میں نہیں رہونگی"
دفعتاً میری آنکھ اوپر کی طرف اٹھ گئی۔ چھمی خالہ پردہ کی آڑ سے جھانک رہی تھیں۔ میرے دیکھتے ہی انھوں نے بڑے زور سے کھڑکی بند کر دی ـــــ واقعی چھمی خالہ معمہ ہی تھیں۔

شام کو کوٹھی کا مالی گردین کئی روز کی غیر حاضری کے بعد اپنی دلہن کو رخصت کرا کر واپس آیا تھا۔ چونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ اس کی دلہن اس کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ لہذا وہ اس کو سلام کرانے ممانی جان کے پاس لے آیا۔ میں گھونگھٹ کی آڑ کی وجہ سے دلہن کا پورا چہرا تو دیکھ نہیں پایا لیکن اس کی جسامت سے پتہ چل گیا کہ وہ چودہ پندرہ سال کی ایک بہت دبلی لڑکی ہے۔ گردین خود ایک بہت بڑا چوڑا چکلا قدآور جوان تھا۔ میں نے رات کو اصغر سے کہا "یہ تم نے گردین کی بے جوڑ بیوی دیکھی

معلوم ہوتا ہے اپنی لڑکی کو بیاہ لایا ہے"

اصغر بولا "اس قسم کی بچپن کی شادیاں بھی عصمت نانی ہی کے تحت کر دی جاتی ہیں"

میں رات کو بہت دیر سے سونے کا عادی ہوں۔ اصغر سو گیا لیکن مجھ کو نیند نہیں آئی۔ کچھ گرمی معلوم ہونے لگی تو میں نے اپنی مسہری کے پاس والی کھڑکی کھول دی۔ کوٹھی کا چمن چاندنی میں نہایا ہوا بڑا دلفریب معلوم ہوتا۔ فضا خاموش تھی بیحد خاموش۔ اور انتہائی رومان انگیز ہوا خوشبوؤں سے بوجھل تھی۔ سبزہ کے وسط میں کھجور کا نوخیز درخت ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی رقاصہ ناچتے ناچتے محفل کے درمیان جھک کر کھڑی ہو گئی ہو۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور دروازہ کھول کر چمن میں نکل گیا آسمان چاند اور تاروں کی تمام سحر پاشیاں لئے رندمسرشار کی طرح جھکا پڑتا۔ باغیچہ کے کونے پر کھجور کے دو اونچے درخت اس کو چھونے کی کوشش کر رہے تھے۔ رات پرکیف اور سنسان تھی اور چمن کا پتہ پتہ اس سے مسحور دم بخود تھا۔

"یہ بھی کوئی سونے کا وقت ہے" میں نے سوچا —— اچانک میں نے تھوڑے فاصلہ پر ایک سیاہی کا ٹکڑا دیکھا۔ کوئی چھوٹا درخت ہوگا! لیکن وہ چل رہا تھا اور سامنے سے دائیں طرف مڑ گیا تھا —— وہ اب بھی چل رہا تھا لیکن آہستہ آہستہ۔ میں انتہائی خاموشی سے اس کے پیچھے ہولیا۔ وہ سایہ گردیں کے جھونپڑے سے لگ کر کھڑا ہو گیا —— اور میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس سے صرف دس گز کے فاصلہ پر پہونچ گیا۔ اب میں اس کو صاف دیکھ سکتا تھا لیکن اس کا منہ دوسری طرف تھا اور وہ جھونپڑے کے اندر جھانک رہا تھا۔ میں اور آگے بڑھ گیا —— اب میں اس کو ہاتھ بڑھا کر چھو سکتا تھا۔

"کون؟" میں نے کہا

سایہ سہم کر پلٹ پڑا۔ چھمی خالہ اپنے سفید کپڑوں پر سیاہ چادر اوڑھے کھڑی تھیں۔ ایک لمحہ کے لئے انھوں نے مجھ سے آنکھیں ملائیں اور اس کے بعد وہ ہاتھ پھیلا کر میرے آغوش میں گر گئیں۔ اس وقت وہ بالکل بیہوش نہیں ہوئی تھیں۔

—— قریب ہی کوئی بڑا سا پرند اپنے پر پھڑپھڑاتا۔ قیں قیں چیختا اڑ گیا مجھ کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے چھمی خالہ کی بدھی نانی اپنے بال کھسوٹ کر بین کر رہی ہو +

پنکھڑیاں

اختر ہوشیارپوری
بی۔اے، ایل ایل بی

(۱)

ازسرِنو یہ چراغاں تو ہوا ہے لیکن — کیا خبر پھر کوئی طوفان چلا آتا ہو
یہ بہاریں یہ گل و سبزہ کا شاداب ہجوم — بادِ صرصر سے کوئی بڑھ کے بچالے ان کو

(۲)

گل و غنچہ کے حسیں سینے پہ بوندوں کا یہ رقص — دور افق پار گھٹاؤں کا وہ آوارہ خرام
دل میں نشتر سے چبھوتے ہوئے افکارِ معاش — ہائے نادار غلاموں کے الٰہی ایام

(۳)

مسکرانے دے شامِ غم اے دل — عشق پر ورنہ حرف آئے گا
یہی لمحہ ہے آبرو رکھ لوں — کون پھر صبح گنگنائے گا

(۴)

تجھ کو یہ غم کہ اٹھا لے تو بطِ ہستی — مجھ کو یہ فکر کہ سینے میں چراغاں کر لوں
اک ذرا صبر کہ آتا ہوں ابھی آتا ہوں — اپنے خود ساختہ ناسوروں سے تو دامن بھر لوں

(۵)

مجھ کو تاروں کی گزرگاہ دکھانے والے — داغ کے ہر داغ سے میں لطفِ درود لیتا ہوں
ہم کو پھولوں کے نظارے نہیں بھاتے ہرگز — اور ہر خار سے میں رسِ جنوں لیتا ہوں

(۶)

پھر مرے دل پہ لگی چوٹ کوئی — بھولے افسانے یاد آنے لگے
ہو گئے تازہ سب پرانے زخم — اور مرے ہونٹ تھرتھرانے لگے

عزیز اثری

اسکی اپنی

گھڑر۔ گھڑر۔ کلاک کی آواز کمرے میں گونجی اور فضا میں تحلیل ہو گئی پیروتی ابدی طلسم ٹک ٹک ٹک۔ اسکی نگاہیں کلاک پر جم گئیں ابھی دو بجے تھے اور اسکے آنے میں دو گھنٹے باقی تھے۔ دو گھنٹے اور انتظار اور کلاک آہستہ آہستہ سسکتے ہوئے طوطے کی طرح متواتر رٹے جا رہا تھا۔ ٹک ٹک ٹک۔ ٹھہر ٹھہر کر چار بجے وہ آئیگی اور ابھی دو بجے تھے۔ دو گھنٹے۔ ساٹھ جمع ساٹھ ایک سو بیس منٹ باقی تھے اور وہ انتظار کے جان لیوا اضطراب سے بھاگ کر اسکے حسین تصور سے لپٹ گیا۔

کسقدر حسین ہے وہ۔ حسین عورت دنیا میں بہترین نعمت ہے اور جنت میں بھی۔۔۔۔ عورت شعریت۔ موسیقی۔ شراب سب نعمتوں کا جمیل ترین نازک مرقع ہوتی ہے۔ اور عظمہ میں یہ ـــــ کچھ موجود ہے۔ اس کی جوانی کی معصوم اداؤں میں شعریت ہے اسکی آواز میں سُریلی اور میٹھی نغمگی اور اسکے نیلے گلابی سے ہونٹوں سے شراب چھلکتی ہے۔ اُس کی دلآویز صورت، سیاہ لمبی زلفیں جنہیں وہ چھو سکتا ہے۔ گھنگھور گھٹاؤں کی طرح آوارہ کر سکتا ہے۔ چوم سکتا ہے وغیرہ وغیرہ اور وہ خوشی کے جذبے سے مسحور ہو کر صوفے پر سے اُٹھ کھڑا ہوا اور ایک سگریٹ جلا کر کچھ دیر ٹہلنے کے بعد پھر وہیں آ کر نیم دراز ہو گیا۔ اور سگریٹ کے دھوئیں کے ساتھ ساتھ خود بھی خیال کی فضاؤں میں پرواز کرنے لگا۔

تین سال سے وہ اس کوٹھی میں "نظر بند" تھا یعنی اُسکی نظر وں پر قدرت نے بندش عائد کر دی تھی۔ کیونکہ وہ اکیلا تھا ـــــ اس کو کوئی اُسے پوچھنے والا نہ تھا عرصہ ہوا اُسکی بیوی مر چکی تھی اور اسکی موت کے بعد اسکی زندگی اس صحرا کی طرح ویران خشک ہو گئی تھی جہاں صدیوں سے سبزے کا نشان تک دکھائی نہ دے۔ وہ غمناک تنہائی کی اُجڑی ہوئی زندگی بسر کر رہا تھا کہ اتفاقاً ایک دن اُس کی نگاہ عظمہ پر پڑ گئی۔ عظمہ کی اُسکی مرحوم بیوی سے قدرے مشابہ صورت اسکے دل میں اُتر گئی۔ لیکن اُس نے اس خواہ مخواہ کے خیال کو دل سے نکال کر باہر پھینک دینا چاہا کیونکہ یہ اُسکی مرحوم محبوبہ کی محبت سے غداری تھی ـــــ پھر کچھ روز تک وہ یونہی اُسی طرح غمگین اُداس پڑا رہا اور ایک دن اچانک عظمہ سے اسکی ملاقات ہو گئی۔ وہ اُسکی کوٹھی کے قریب ہی رہتی تھی۔ اور دوسری ملاقات میں وہ اجتناب جاتا رہا مرحومہ بیوی سے غداری کا احساس ساتھ چھوڑنے لگا "آخر زندہ رہنے کا کوئی سہارا تو ہونا ہی چاہیئے" ـــــ تیسری ملاقات کے بعد اسکی بوجھل ویران اُداسی دُور ہوتی گئی اور عظمہ بہار بن کر اُسکے دل و دماغ پر چھا گئی۔

اُس نے بل کھا کر راکھ ہوتے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑے میں سے آخری کش لیکر اُسے پھینک دیا۔ اور پھر کلاک پر نظر ڈالی۔ ٹک ٹک ٹک ٹھہر ٹھہر ابھی تو بیس منٹ گذرے تھے۔ سو منٹ باقی تھے۔ سو منٹ سو سال ایک صدی کب گزرے گا یہ وقت؟ یہ جان لیوا اضطراب سے بھرپور وقت! اُس نے کلاک سے نظریں ہٹا کر نیچے صوفے کے پرے جلتے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑے پر گاڑ دیں۔ یہ چھوٹا سا ٹکڑا دھواں فضا میں چھوڑ کر خود راکھ ہوتا جا رہا تھا۔ اُس نے سوچا کہ یہ سگریٹ بھی عجیب ہے۔ سارے کا سارا جل کر خاک ہو جاتا ہے لیکن بُجھتا نہیں ایک عاشق کی سی ہی پہچان ہے وہ ہر لمحہ غم اور ہجر اں نہیں تو کم از کم انتظار کی آگ میں جلتا رہتا ہے لیکن اُف تک نہیں کرتا اور اسی وقت ایک ٹھنڈی آہ اُسکے سینے سے ابھری اور ہونٹوں سے نکل کر دھوئیں کی طرح فضا میں بکھر گئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ قدیم زمانے کے شاعر بھی تو اسی طرح آہیں بھرتے بھرتے اور شعر کہتے کہتے ختم ہو جاتے تھے ـــــ اور تین سال تک وہ خود بھی تو آہیں بھرتا اور جیتا رہا۔

لیکن اب وہ اور اُسکے ذہن میں پھر اُسکی محبوبہ گھوم گئی۔ دو دن چار بجے آئیگی۔ اُس نے کہا تھا۔ سفید یا ہلکی سبز ساڑھی پہنے۔ جس میں وہ بہار کی معصوم تیتری دکھائی دیتی ہے۔ اُسکے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ مسکراتا ہوا اُسکی طرف بڑھیگا۔ وہ اپنا ... ملائم سی ہتھیلی کے ساتھ بیٹھ جائیگا ... اور وہ ... کتنا حسین زندگی گزر جاتا ہے ... پھر وہ کہیگی ...

—— لاؤ اپنا ہاتھ۔ تمہاری قسمت دیکھوں۔ اور وہ ... آپ کی اپنی پتلی سی نرم سی ... کے ساتھ اپنا نرم سا ہاتھ اُسکی طرف بڑھا دیگی۔ وہ ایک ہاتھ سے اُس کی نازک سی خوبصورت انگلیوں اور دوسرے ہاتھ سے اُسکی کلائی تھام کر کہیگا ۔۔ تمہارے ہاتھ کی لکیریں تمہارے سراپا کی طرح بے حد حسین ہیں۔ ... اور دل کی ... تمہاری صورت کی طرح تمہارا دل بھی بہت معصوم ہے ... اور اُس کے دونوں ہاتھوں کا دباؤ بڑھتا جائیگا آہستہ آہستہ دونوں کی محبت کی طرح اُس کا سانس تیز ہونے لگیگا۔ اور اُسکے شباب کی دلکش پہاڑیوں پر زلزلہ سا ...

پھر ...... پھر ...... اور اُسکے جسم میں پھریریاں سی تیرنے لگیں اور دل کی دھڑکنیں قدرے تیز ہو گئیں۔ دھک — دھک دھک ... جیسے اُسکا دل بھی ایک کلاک بن گیا ہو۔ کلاک جو ابھی تک کہہ رہا تھا ٹک ٹک ٹک۔ ٹھہر ٹھہر ٹھہر اور اسی وقت اُسے انگریزی کا ایک شعر یاد آ گیا۔ "ہمیں وقت کا شمار دل کی دھڑکنوں سے کرنا چاہیئے نہ ٹک ٹک سے" — دھک۔ دھک۔ دھک۔ دھک۔

اُس نے ایک اور سگریٹ سلگایا اور صوفے پر سے اُٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے قریب جا کر اپنا عکس دیکھنے لگا ... کتنے خوش قسمت ہو کہ ایسی حسین عورت کی محبت تمہیں مل گئی ہے۔ محبت۔ مکمل محبت ... پھر وہ کوئی گیت آہستہ آہستہ گنگنانے لگا۔ اور گاتے گاتے اُس نے میز کی دراز کھینچ کر اس میں پڑی ہوئی سونے کی انگوٹھی کو تھیلے سے سبز کاغذ میں سے نکالا اور گھورنے لگا۔ یہ انگوٹھی جسے وہ آج عظمہ کیلئے بنوا کر لایا تھا۔ اُسکے اوپر دل کی شکل بنی ہوئی تھی جہاں اُسکا نام کھدا ہوا تھا۔ یہ انگوٹھی آج وہ اُسکا ہاتھ دیکھتے دیکھتے اُسکی انگلی میں پہنا دیگا۔ دل کی شکل کی یہ انگوٹھی جو زبان حال سے اسکے جذبات کی ترجمانی کرے گی — "میرے پاس یہی ایک دل کی دولت تھی جو تمہیں نذر کر دی۔ پھر پیمانِ وفا و محبت اور ... اور کبھی مکمل ہو جائیگا ایک ابدی کبھی نہ ٹوٹنے والا عہد اور ... مسکراتے ہوئے انگوٹھی پھر سبز

بار بار سے کاغذ کا جامہ پہنا کر شیشے میں خود کو گھورنے لگا۔

کلاک گنگنا رہا تھا۔ گھنٹے کلاک میں باریک گراں سی پُراسرار طریق سے سارنا سے ہو سے انداز میں لڑہنے لگا۔ ٹک ٹک ٹک۔ ایک خیال اُسکے ... بجلی کی طرح لپک گیا۔ اُسکے آنے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی ہے ایک طویل عرصہ۔ کیوں نہ وہ خود ہی اُس کی کوٹھی پر جا کر اُسے ساتھ لے آئے ... اُس نے کاغذ میں لپٹی ہوئی انگوٹھی کو دراز سے باہر نکال کر مٹھی میں دبا لیا۔ اور جاتے جاتے جیسے ٹک ٹک ٹک ٹھہر ٹھہر ٹھہر الاپتے ہوئے کلاک پر اس انداز سے تیز نگاہ ڈالی جیسے کہہ رہا ہو۔ "کیوں ٹھہروں؟ کیوں ٹھہروں؟ کس لئے ٹھہروں؟" —— اور باہر نکل گیا۔

مٹھی میں دبی ہوئی انگوٹھی کو ہتھیلی سے محسوس کرتے کرتے جب وہ عظمہ کی کوٹھی پر پہنچا تو وہاں باہر کوئی ملازم وغیرہ نظر نہ آیا۔ صرف دو تین بچے باہر بغیچے میں ادھر ادھر کھیل رہے تھے۔ اِدھر دوسری جگہ پر پھدکتی ہوئی تیتری کو پکڑنے میں مصروف تھے۔ یہ اُسکی محبوبہ کے بھائی بہن تھے۔ اُس نے ایک لمحہ رک کر اُسے پوچھنا چاہا لیکن وہ آگے بڑھ گیا۔ سامنے ہی عظمہ کا کمرہ تھا۔ جسکے دروازے اندر سے بند تھے۔ دھک دھک دھک دھک بے قابو دھڑکتے دل کو لئے وہ اور آگے بڑھا۔ دھک دھک دھک دھک —— اور آگے اور دروازے پر پڑے ہوئے کچھ کھسکے ہوئے پردے میں سے اندر جھانکنے لگا۔ دھک دھک دھک۔ وہ اُسکی محبوبہ کسی نوجوان سے ہسٹیریا زدہ انداز میں لپٹی ہوئی تھی۔ اُسکے دل کی دھڑکنیں تھمیں ... تھمیں ... ہاتھ کی مٹھی خود بخود ڈھیلی ہو گئی۔

باغیچے میں تیتری پکڑنے کی کوشش میں ناکام ہو کر بچے اب تھک کر واپس آ رہے تھے۔ اُن میں کسی نے اُسے بلایا بھی لیکن وہ چپ چاپ گیا۔ یوں چلتا گیا جیسے خالی ہاتھ ہی آیا تھا —— یا جیسے اس کی اپنی کوئی محبوبہ ہی نہیں تھی ——

تلخیاں

غلام ربانی تاباں بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

اب بھی غمخانوں میں جلتے ہیں وفاؤں کے کنول
فطرت حسن جفا پیشہ و سفاک سہی
زندگی لالہ و گل ہی تو نہیں خار بھی ہے
لب خنداں نہ سہی دیدۂ نمناک سہی

بزم میں جام مئے ناب نہ آیا مجھ تک
تشنگی بڑھتی گئی بڑھتی گئی بڑھتی گئی
میں نے کی ساحل عشرت کی تمنا جتنی
اور بھی غم کی ندی چڑھتی گئی چڑھتی گئی

میں نے جو گیت بھی چھیڑا وہ فغاں بن کے رہا
پردۂ ساز سے فولاد کی جھنکار اٹھی
اور جو پھول چنا خار بداماں نکلا
ہر طرف باغ میں میرے لئے تلوار اٹھی

میں نے جو راہ نکالی وہی مسدود ہوئی
کارواں بڑھتے رہے منزلیں طے ہوتی رہیں
میں تو الجھا رہا زنجیروں میں سنگینوں میں
رقص کرتی رہی بے پایاں خلاؤں میں زمیں

یہ عفونت زدہ تاریکیاں عفریت کا گھر
زیر افلاک کوئی اختر لرزاں بھی نہیں
جانے یہ کونسا عالم ہے کہ دل میں تاباں
زیست تو زیست ہے اب موت کا ارماں بھی نہیں

پریم ناتھ پردیسی

سخی!

سد

ایک بوڑھا، ایک جوان، ایک عورت اور چار بچے ——

یہ تھا خانہ بدوش ماہی گیر کا کنبہ جو چار سیدھے ٹیڑھے بانسوں کے اوپر پھیلائی ہوئی گھاس پھوس کے نیچے رہتا تھا۔ کبھی اِن بانسوں پر گیلے جال دھوپ میں پھیلائے جاتے تھے اور کبھی بے حد میلے کپڑے، جنھوں نے شائد عمر بھر صابون کی شکل تک نہ دیکھی تھی۔

پہلے دن جب میری کشتی اس جگہ لنگر انداز ہوئی، میں نے نالے کی دوسری طرف دیکھنا ضروری نہیں سمجھا۔ کیونکہ چناروں کے نیچے میرے ٹھہرنے کی جگہ بے حد حسین تھی۔ لیکن دوسرے دن جب میں نے اپنے اردگرد کے ماحول پر نظر ڈالی۔ تو میں اُنھیں دیکھکر حیران رہ گیا۔ یہ کون لوگ ہیں؟ کب آئے ہیں؟ کیوں آئے ہیں؟

میرے مانجی نے کہا۔ "یہ ماہی گیر ہیں صاحب — نالے میں مچھلیاں پکڑتے ہیں۔"

ماہی گیر ——؟ مگر یہ آئے کب؟ کل شام کو تو نہیں تھے؟"

مانجی نے مسکرا کر کہا۔ "کل شام کو بھی یہ لوگ یہیں تھے۔ یہ خانہ بدوش ہوتے ہیں حضور، جن کا کہیں ٹھور ٹھکانا نہیں ہوتا ——"

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے پھر پوچھا۔ "اب یہیں رہینگے کیا؟"

مانجی نے کہا۔ "شاید اس سیزن کو یہیں رہینگے۔

مانجی کا یہ جواب میرے لئے کچھ حوصلہ افزا نہ تھا اگر یہ لوگ یہیں رہینگے۔ تو میں کیسے رہ سکوں گا۔ میں جس کے پھیپھڑوں میں زخم ہیں۔ جسے خاموشی کی ضرورت ہے۔ تنہائی اور مکمل آرام کی ضرورت ہے۔"

میں بوڑھے ماہی گیر کو دیکھنے لگا جس کے بدن پر پیوند لگی ہوئی شلوار تھی۔ اور وہ بھی دھوبی کی طرح کثیف اور میلی بید کے ایک سوکھے کندے سے پیٹھ ٹکائے وہ نہایت اطمینان سے حقہ پی رہا تھا۔ اور کبھی کبھی تھوکتا بھی جاتا تھا۔ اُسکی جوان بہو —— جس نے اس وقت تک دنیا کو چار بچے دئے تھے —— اس سے ذرا پرے صاف آسمان کے نیچے چولہا جلانے کی ناکام سی کوشش کرتی تھی شاید لکڑیاں گیلی تھیں۔ جبھی اُس کی آنکھیں پھونکیں مار مار کر، وردھواں نکل نکل کر سرخ ہوگئی تھیں۔ وہ بار بار اُنھیں اپنے پیرہن سے پونچھتی۔ اُس کے تین بچے چار بانسوں کے احاطے میں ایک پھٹی رضائی کے نیچے سو رہے تھے۔ جو کہیں کہیں ململ کی طرح باریک تھی۔ اور کہیں اسقدر موٹی جیسے اُس کے اندر نیم دائرے بنا کر کتے سو رہے ہوں۔ چوتھا بچہ" جو مشکل سے ایک برس کا تھا، شبنم سے گیلی مٹی اپنی انگلیوں سے کُرید کُرید کر چاٹ رہا تھا۔ اُس کے دونوں ہونٹوں کے گرد کیچڑ کے داغ لگ گئے تھے۔ اور حقہ پیتے ہوئے دادا کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔

بہت غریب لوگ نظر آتے ہیں۔" میں نے مانجی سے پوچھا

اُس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کہا۔ "غریب تو ہوتے ہیں مگر بدمعاش بھی ہوتے ہیں۔"

میں بھونچکا سا رہ گیا۔ "بدمعاش؟"

"ہاں صاحب چوریاں کرتے ہیں۔ لائسنس کے بغیر مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ کسی کے ساتھ عداوت ہو جائے تو اُس کا گھر جلا دیتے ہیں۔ خدا غارت کرے اِس ذات کو ——"

میری پریشانی اور بڑھ گئیں۔ شادی پور میں رہنے کا مشورہ اگرچہ میرے ایک کشمیری دوست نے مجھے دیا تھا لیکن کیا وہ ان بدمعاشوں سے واقف نہ تھا۔ میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا جیسے لوگوں کی آنکھوں میں ہمیشہ ایک مجرمانہ چمک ہوتی ہے جو چھپائے نہیں چھپتی۔ لیکن بوڑھے یا اس کی بہو کی آنکھوں میں مجھے یہ چمک کہیں نظر نہ آئی۔ البتہ اُن کی میلی میلی سی زندگی میں مجھے ایک خاص قسم کا صبر، تحمل اور ضبط دکھائی دیا جسے وہ نہ چھپانے کی کوشش کرتے تھے نہ دکھانے کی۔ البتہ جو خود بخود کہہ رہا تھا۔ مجھے نہ چھیڑو، میں بارود کی طرح بھڑک اٹھوں گا ـــ"

مانجی کچن بوٹ میں چلا گیا۔ بیرے نے میز پر سے چائے کا سامان سمیٹ لیا۔ اور میں آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر انھیں کو دیکھتا رہا۔ مانجی کی باتیں میرے دماغ کے باریک سے باریک پردوں سے ٹکرا ٹکرا کر گونج رہی تھیں "غریب تو ہوتے ہیں مگر بدمعاش بھی ہوتے ہیں۔ چوریاں کرتے ہیں۔ لائسنس کے بغیر مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ گھر جلا دیتے ہیں سـ"

چلم میں آگ بجھ چکی تھی۔ لیکن بوڑھا ماہی گیر پھر بھی بے مطلب سے کش کھینچ رہا تھا۔ اس کی پیٹھ پر سوکھی لکڑی کے نشان لگ چکے تھے لیکن وہ اُن سے بھی بے نیاز تھا۔ دفعتاً وہ لپک کر اٹھا۔ اور بچوں کے اوپر پڑی ہوئی رضائی کو اپنی پوری قوت سے کھینچ کر انھیں گالیاں دینے لگا "سورج سر پر آ گیا اور نواب زادے ابھی اُٹھتے نہیں۔ اتنی بھی کیا ستی ہے؟"

بچے ننگے ہو گئے۔ وہ ریت پر پھینکی ہوئی زندہ مچھلیوں کی طرح تڑپنے لگے۔ اُن کے نیچے صرف ایک کپڑا تھا۔ جو شبنم سے بھیگ کر زمین کے ساتھ چمٹ گیا تھا۔ سہم کر آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھے۔ اور دادا کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھنے لگے جیسے کہہ رہے ہوں۔ یہ تم نے کیا کیا۔ تھوڑی دیر ہمیں اور سونے دیتے ـــ، اُن کی ماں نے اپنی آنکھیں پونچھ کر اُن کی طرف دیکھا۔ اور چپ ہو گئی کیا بوڑھا اُن کے اوپر سے رضائی کھینچنے میں حق بجانب تھا؟ یا یہ خاموش نظریں بھی جبر ہی کی ایک تصویر تھیں۔ پُر شکوہ اور پُر تاثیر۔ کیا بوڑھے ماہی گیر نے اُس کی ماتا کو بھی روند ڈالا تھا؟ ایک ماں کی ماتا کو جو سمندر کے طوفان کی طرح ہر چیز کو بہالے جاتی ہے۔

میں سوچتے سوچتے تھک گیا۔ اور مجھے یاد آ گیا کہ تپ دق کے مریض کو زیادہ سوچنا نہیں چاہیئے کیونکہ زخموں سے خون رسنے لگتا ہے۔ میں کوچ پر لیٹ گیا۔ لیکن انتہائی کوشش کے باوجود بھی نیند کو نہ پھانس سکا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر بھی میں اپنی کوششوں میں ناکام رہا۔ چنانچہ دوبارہ کھڑکی کے ساتھ لگی ہوئی آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔

بوڑھے ماہی گیر نے دھوپ سے بچنے کے لئے اپنے پیچھے کپڑا بالس پر لٹکا دیا تھا جس پر تین بچے رات کو سوتے تھے۔ اور اب وہ آسمان کی طرف مُنہ کئے لمبا لمبا لیٹا تھا۔ اس کے تانبے جیسے سیاہی مائل سُرخ پیٹ پر بڑے بڑے لال داغ تھے۔ جن میں سے اکثر پکے ہوئے آلو بخارے کی طرح سیاہ ہو چکے تھے اُس کا جوان بیٹا ایک چھوٹی سی کشتی میں نہ جانے کہاں سے آ گیا تھا اور مٹی کے برتن میں باسی بھات کھا رہا تھا۔ چاروں بچے اُس کے ارد گرد للچائی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھ رہے تھے اور اُن کی ماں بانسوں پر گیلا جال پھیلا رہی تھی جال آج بھی خالی آ گیا تھا۔ اور بوڑھے کو اس کا سخت افسوس تھا۔ وہ کروٹ پر کروٹ بدلنے لگا۔ جیسے اُس کی پسلیوں کے نیچے انگارے رکھے ہوں۔

"انھیں یہاں سے ہٹا دو۔ یہ ایک لقمہ بھی نہ کھانے دینگے" شوہر نے بچوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی بیوی سے کہا۔ دو بچے یہ احتجاج سُنتے ہی بھاگ گئے۔ البتہ دو وہیں رہے۔ اُس کی بیوی نے جال کو اپنے حال پر چھوڑا۔ اور شوہر کے نزدیک آکر بچوں کو گھسیٹنے لگی۔ "خدا کی قسم! ابھی چائے اور ستو کا آٹا کھا چکے ہیں" اُس نے شوہر سے کہا۔

"انھیں تم ہی نے تباہ کر ڈالا۔ کوئی تمیز نہیں سکھائی"

بوڑھا ماہی گیر تڑپ کر اُٹھا "سچ ہے۔ آپ ہی نے انھیں تباہ کر ڈالا۔ میں کہتا ہوں۔ یہ بچے ہیں یا کسی کُتیا کے پلّے"

اُس کا بیٹا اپنی بیوی کی طرف نفرت آمیز نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ لیکن عورت کے چہرے پر سُرخی سی دوڑ گئی۔ "کچھ شرم کیا کرو۔ آخر مرنا ہے تمہیں" اُس نے بوڑھے سے کہا۔

بوڑھا جیسے بھرا بیٹھا تھا۔ ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر کہنے لگا "میں نے کیا بے شرمی کی ہے؟ میں جانتا ہوں۔ میں جانتا ہوں جال خالی آ گیا ہے تم ضرور....."

عورت نے پوری شدت کے ساتھ کہا "کیا جانتے ہو؟ یہی نہ کہ بچے بھوکے ہیں۔ اور تم لاٹ صاحب کی طرح تکیہ لگائے بیٹھے ہو۔ جیسے گھر میں سارا سامان موجود ہے تھوڑے سے ستو تھے وہ بھی آج ختم ہو گئے ہیں۔ اب اللہ اللہ کرو"

بوڑھے نے کہا "ختم ہو گئے۔ تو مجھے کیا؟ پانی پی کر پڑ رہوں گا۔ جسے بچے چاہئیں۔ اُسے روزی بھی کمانی چاہئے ـ"

اُس کے بیٹے نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "خدا کے لئے لالہ۔ اب چُپ ہی ہو جاؤ۔ پاس پڑوس کے لوگ ہیں۔ سُنیں گے تو کیا کہیں گے"

کیا کہینگے ——؟ بوڑھے نے گرج کر پوچھا۔" میں کسی سے ڈرتا ہوں۔ کون "بجز خدا" ہے میرا جس سے مجھے ڈرنا چاہئے۔ ایسے —— لوگ سینگے۔"

بیٹے نے کہا "تم نہیں۔ مگر میں تو ڈرتا ہوں۔ میرے بچے ہیں۔ دُنیا داریاں ہیں۔"

بوڑھے ماہی گیر نے زہر خندہ کرکے کہا "ہوں۔ دنیا داریاں —— پیٹ کے لئے لقمہ نہیں اور مر رہا ہے دنیا داریوں پر —— کیسی دنیا داریاں؟ کس کی دُنیا داریاں؟ کون ہے جسے ہمارے مرنے کا غم ہے۔ ہمارے پیٹ کا غم ہے ہمارے بچوں کا غم ہے ——"

"تو کیا ہمیں کچھ بھی نہ کرنا چاہیئے؟ کیا تو کہتا ہے کہ اب جال بھی نہ پھینکوں؟" بیٹے نے پوچھا۔

بوڑھے نے کہا "کیوں نہیں کیوں نہیں۔ مگر پھینک کر پکڑ لوگے کیا؟ پانی کہاں ہے؟"

"تو پھر کیا کھائینگے کیا؟" بیٹے نے حیرانی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

بوڑھے ماہی گیر کے چہرے پر خود اعتمادی کے جذبات ابھر آئے اس نے نہایت سنجیدگی سے اپنی ننگی چھاتی کی طرف اشارہ کرکے کہا "یہ —— بڑا میٹھا گوشت ہے، ہماری چھاتی کا۔"

بیٹا کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔ اُسکی بیوی بھی ہنسنے لگی "تم بڑے مسخرے ہو لالہ" اُس نے بوڑھے سے کہا۔

میں انہیں دیکھتا رہا۔ بوڑھے کے چہرے پر کسی قسم کا تغیر نہیں آیا خود اعتمادی کے جذبات جھیل کے پانی کی طرح ساکت و بے حرکت تھے شاید بوڑھے کے دل میں نیا طوفان آنے والا تھا۔ اور یہ جمود، یہ ضبط یہ خاموشی اُس کا پیش خیمہ تھی۔ وہ اب آسمان کی نیلاہٹ کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کی نگاہیں دھوپ کے سفید جال کو چیر کر وسعتوں کو کرید رہی تھیں مجھے محسوس ہوا جیسے آسمان ابھی پھٹ جائیگا۔ انسان کا گوشت میٹھا سہی، مگر اس کی قیمت —— کون ادا کرے گا۔ کون ادا کرسکتا ہے؟ کس نے ادا کی ہے۔

میں کانپنے لگا۔ میں اپنے آپکو ذلیل نظر آنے لگا۔ اناندیل (ANNANDAL) جیسا شاندار ہوسن اب مجھے اپنے بالمقابل چار بانسوں سے بنے ہوئے گھر کے سامنے حقیر نظر آیا۔ میں نے اُٹھکر ہانجی کو آواز دی۔ اپنے بیرے اور خانساماں کو بلایا "جتنے چاول موجود ہیں لے آؤ ——" میں نے اُن سے کہا۔

تینوں مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ جیسے پوچھ رہے ہوں۔ ایسا کیوں حضور! ہانجی اپنی حیرانیوں پر زیادہ دیر تک قابو نہ پا سکا —— بولا۔ "کیا کرینگے صاحب؟"

"انہیں دے آؤ۔ جو پار چار بانسوں کے نیچے ہیں۔ جاؤ جلدی کرو ——"

ہانجی نے ہنسکر کہا "یہ بہروپیے ہیں صاحب۔ یہ کبھی بھوکے نہیں رہتے انہیں سیاحوں کو لوٹنے کے خاصے ڈھنگ آتے ہیں۔ آپ بیٹھئے میں ان سے نبٹ لونگا۔

میں اس کی باتوں پر حیران رہ گیا۔ کیا یہ لوٹنے کے ڈھنگ ہیں۔ نہیں نہیں۔ انسان کبھی اپنی چھاتی کا گوشت پیش نہیں کرتا۔ یہ جبر اور صبر کی آخری تصویر ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد طوفان —— جنگ —— اور ...... چھاتیوں کا گوشت نہ کوئی کھا سکتا ہے۔ نہ دے سکتا ہے۔

ہانجی سچ مچ اُن کی طرف ایسی نظروں سے دیکھنے لگا۔ جیسے وہ انہیں کھا جانا چاہتا ہو میں نے اُسے فوراً روکا۔ اور کہا۔ بوٹ میں جتنے چاول ہیں سب لے آؤ ——"

وہ میرا مطلب تاڑ گیا اور جلدی اپنی چادر میں چاول باندھکر لے آیا۔ میں نے کہا۔ "جاؤ انہیں دے آؤ ——"

وہ شکارے میں بیٹھکر نالے کے پار چلا گیا۔ اور جب واپس آیا تو مجھے محسوس ہوا۔ جیسے مجھے کچھ اطمینان حاصل ہو رہا ہے۔

لیکن بوٹ میں پہنچکر وہ ماہی گیروں کو اپنی زبان میں شاید گالیاں دینے لگا۔ بے شرم کہیں کے۔ سیاحوں کو لوٹتے ہیں۔ بدمعاش کہیں کے ——"

میں خواب گاہ میں قیلولہ کرنے کے لئے اُٹھا۔ لیکن نیند نہ آئی کروٹ پر کروٹ بدلتا رہا۔ جیسے میرے نیچے کوئی آگ جل رہی ہو۔ آسمان پر اب بادل چھا گئے تھے۔ خواب گاہ کی جالی دار کھڑکی سے گدلی سی دھوپ اندر آگئی تھی جس میں نہ چمک تھی نہ گرمی۔ مجھے افسوس تھا۔ کہ میں شادی پور آیا ہی کیوں جہاں مجھ جیسے جذبات پرست آدمی کو ذہنی کوفت پہنچانے کے اسقدر سامان موجود تھے۔

میں تازہ اخبار پڑھنے لگا۔ شیر کشمیر کا تازہ بیان جو اُس نے بغاوت کے مقدمہ میں دیا تھا۔

"بنی نوع انسان کا سماج ناقابل تقسیم ہے یہ حقوق ہر وقت اور ہر جگہ برقرار رہنے چاہئیں .... اگر یہ سرزمین مختلف قوموں اور ملکوں کے لئے باعث دلکشی ہے۔ تو اُن لوگوں کا کیا حال ہوگا۔ جن کی یہ مادرِ وطن ہے

جو اسکی گود میں پلے ہیں اُن کے لیئے یہ وادی مصیبت اور غربت میں مبتلا ہے یہاں کے لوگوں کی روشن آنکھوں میں چمکلم ہے۔ اور "شفۃ پژمردہ" میں سوچنے لگا۔ اگر سماج ناقابل تقسیم ہے تو اس کے حصے بخرے کون کرتا ہے؟ وہ جو زیادہ شور مچاتے ہیں اور سب کچھ ہڑپ کر جاتے ہیں یا وہ جو فاموش ہیں اور وسعتوں کو اس لئے گھورتے رہتے ہیں کہ کہیں سے خدا نظر آئے یا وہ خلائی جو اس تقسیم کو دیکھکر بھی حرکت میں نہیں آتی۔ ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہوتی۔ آگ کی طرح سب کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیتی:

میں اُٹھکر آہستہ سے جالی دار کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ چار بانسوں ملے کئی پژمردہ چہرے کندن کی طرح دمک رہے تھے۔ جالا کی سے بھاگے ہوئے دو بچے واپس آگئے تھے۔ اور سارا کنبہ ایک ہی ناقابل تقسیم سماج بن چکا تھا چولہے پر ہانڈی چڑھی ہوئی تھی۔ بوڑھا ماہی گیر کش پر کش لگا رہا تھا۔ اور سب سے چھوٹے پوتے کے ساتھ کھیلتا بھی جاتا تھا۔ زندگی نے محور کے گرد گاگا کر ناچ رہی تھی۔

اُسی رات جب میں سو رہا تھا۔ میرے بستر کے پاس والی کھڑکی کے ساتھ کوئی چیز آہستہ سے ٹکرائی۔ میں چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ نالے کے پانی میں مجھے محسوس ہوا۔ جیسے کوئی غوطے لگا رہا ہے۔ میں تاب نہ لا سکا بتی جلائی۔ اور کھڑکی کو دھکیل کر کھول دیا۔۔۔ یہ کون؟ بوڑھے ماہی گیر کی جوان بہو؟۔۔۔ مگر کیوں؟

میری طرف! حیران نظروں سے دیکھکر وہ اپنی ٹوٹی پھوٹی کشتی لے کر دوسری طرف چلی گئی۔ میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ چار بانسوں تلے مکمل خاموشی تھی۔ چاند کی کرنوں میں میلی رضائی اور میلے کپڑے صاف نظر آرہے تھے جن پر سارا کنبہ گٹھڑی بنا سو رہا تھا۔

لیکن یہ عورت اتنی رات گئے میری کھڑکی کے پاس اپنا بوٹ لیکر کیوں آئی تھی۔ کیا یہ اپنا جسم میرے حوالے کرنا چاہتی تھی۔۔۔؟ کیا یہ مجھے چاولوں کا معاوضہ دینے آئی تھی؟

میں کھڑکی بند کر کے پھر لیٹ رہا۔ اور سوچتا رہا۔ جبر اور صبر کی انتہا تجارت پر ختم ہو جاتی ہے۔ یا طوفان پر؟ نہیں یہ نہیں ہو سکتا کشمیر کی ہر عورت ہماری ماں ہے۔ بہن ہے۔ بیٹی ہے۔ جن کی مادر وطن ہمارے زخم مندمل کرتی ہے۔ ہمارا غم بھلا دیتی ہے۔ ہمیں آرٹسٹ بنا دیتی ہے ہم اُن کی عزت کرینگے۔ انھیں دیوتاؤں کی طرح پوجیں گے۔

مجھے معلوم نہیں کہ میری آنکھ کس وقت لگی۔ صبح ابھی میں اُٹھا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں باہر نکلا۔ بوڑھے ماہی گیر کا بیٹا گھاس کی رسی میں چند مچھلیاں پرو کر میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"یہ کیا؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

رسی کو اوپر اُٹھا کر اُس نے اُسی طرح مسکرا کر کہا: "چند مچھلیاں ہیں حضور، بڑی مشکل سے آج رات پکڑی گئی ہیں۔"

"کس نے پکڑیں؟" میں نے پوچھا۔

"میری گھر والی نے ۔۔۔" اُس نے اُسی انداز میں کہا۔

"تمہاری گھر والی نے؟"

"ہاں حضور۔ وہ ساری رات اسی نالے کو چھانتی رہی ۔۔۔"

"مگر تم کیا کرو گے؟"

"ہم ۔۔۔؟" اُس نے آسمان کی طرف دیکھکر کہا "خدا بے نیاز ہے حضور ۔۔۔ صرف اس وجہ سے نہیں مارے گا ۔۔۔"

مجھے محسوس ہوا۔ جیسے دنیا کا عظیم ترین سخی میرے سامنے کھڑا ہے اور تمام دنیا کی جاہ طلب سخاوت اپنی سخاوت سے پاتال تک گاڑھ رہا ہے۔ وہ سخی، جس کے متعلق میرا بھائی کہتا ہے۔ بدمعاش ہے لٹیرا ہے۔ اوروں کے گھر جلا دیتا ہے۔

ڈاکٹر شہرت
ایم ۔ بی ۔ بی ۔ ایس

معصوم ضدیں

یہ دکانیں، یہ دکانوں پہ کھلونوں کی قطار
کہیں باجے، کہیں سیٹی، کہیں مٹی کے انار
کہیں بیٹھے ہوئے ہیں ربڑ کے کہیں چینی کے سوار
ان میں سے کچھ بھی نہیں تیرے لئے نورِ نظر
ضد نہ کر، اے مرے معصوم مرے لختِ جگر

اتنا آزردہ نہ ہو ٹین کے تاشوں کے لئے
دل گرفتہ نہ ہو تربوز کی قاشوں کے لئے
صرف آنسو ہیں ترے کھیل تماشوں کے لئے
اے مرے توتلے اب مجھ سے نہ کہہ بارِ دگر
ضد نہ کر اے مرے معصوم مرے لختِ جگر

ان کھلونوں کا خدا کے لئے بیمار نہ بن
جن کو میں لے نہ سکوں ان کا خریدار نہ بن
اک تماشا سا سرِ کوچہ و بازار نہ بن
دیکھ کیا کہتی ہے تجھ سے مری شرمندہ نظر
ضد نہ کر اے مرے معصوم مرے لختِ جگر

کہیں انگور کے خوشے کہیں شربت کے گلاس
مسکراتے ہوئے فاقے کہیں ہنستی ہوئی پیاس
رو رہا ہے تری معصوم ضدوں پر احساس
بھوک اور پیاس ہی تیرے لئے تا حدِ نظر
ضد نہ کر اے مرے معصوم مرے لختِ جگر

تیری انگشت کے معصوم اشاروں کی قسم
تیرے رخسار کے مغموم ستاروں کی قسم
تیری امید کے موہوم نظاروں کی قسم
مجھ سے دیکھے نہیں جاتے یہ ترے دیدۂ تر
ضد نہ کر، اے مرے معصوم مرے لختِ جگر

شہر میں سب ہے ترے گاؤں میں کچھ بھی تو نہیں
مفلسی چھاؤں ہے اس چھاؤں میں کچھ بھی تو نہیں
برہنہ پا کے لئے پاؤں میں کچھ بھی تو نہیں
برہنہ پا ہی ابھی شہر کی سڑکوں سے گذر
ضد نہ کر اے مرے معصوم مرے لختِ جگر!

تیرے مرحوم ارادوں کا جہاں ہے مدفن
تیرے کھیتوں کے لٹیروں کا جہاں ہے مسکن
تیغ اٹھانا تو جواں ہو کے وہیں جانِ وطن
ابھی سینہ میں بھڑکتے دے بغاوت کے شرر
ضد نہ کر اے مرے معصوم مرے لختِ جگر

عاتق شاہ

لمبی ڈور

لمبی لمبی سفید دیواریں، بڑے بڑے ہال۔ جہاں چاروں طرف خاموشی رینگتی نظر آتی ہے اور پھر ایک خاموشی سے سسکتے ہوئے ہونٹوں سے نکلی ہوئی چند آہیں، چند چیخیں اور چند دبی دبی سسکیاں جیسے ایک جوان عورت اپنے آنچل میں منہ چھپائے ہوئے رو رہی ہو اور ان میں بڑے بڑے ہالوں میں تھرکتی ہوئی چند گول گول پتلیاں، جن پر ایک بال بھی نہیں صاف شفاف! کبھی رکتی کبھی بڑھتی اور کبھی نکلنے والی آہوں کی طرف لپکتی ہوئی۔ نرسیں! رحمت کی دیویاں ہسپتال! جہاں، جوانی ٹھٹکتی اور آہیں بھرتی نظر آتی ہے تو وہاں بڑھاپا ایڑیاں رگڑتے نظر آتا ہے۔ ہسپتال! زندہ انسانی لاشوں کا ایک چھوٹا سا شہر، جہاں زندگی اپنی آہوں اور چیخوں پر قہقہہ مارتی نظر آتی ہے۔

اور یہ وہ مقام ہے جہاں تڑپتی اور منہ بسورتی ہوئی زندگی اگر موت کے منہ سے نکلنے کی کوشش کرتی ہے تو کبھی ہار ہوتی ہے تو کبھی جیت۔ پھر بھی کہتے ہیں کہ رحمت کی دیویاں اپنے طلسم سے مرنے والوں کو بچا لیتی ہیں اور اگر یہ رحمت کی دیویاں نہ ہوتیں تو .... تو ....

نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں کہتا ہوں کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ لیکن ایسا جان پڑتا ہے کہ کوئی نہ ہونے والی بات ہونے والی ہے۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا کہ ایسا ہوگا۔ اور نہ اس وقت سوچنے کے لئے تیار ہوں لیکن پھر بھی اصغر کی وہ دو اداس آنکھیں مجھے گھورنے لگتی ہیں۔ میں ان آنکھوں کو دیکھ نہیں سکتا۔ میں ان آنکھوں میں وہ بات پڑھنے کے لئے کبھی بھی تیار نہیں جو غالباً اصغر کہنا چاہتا ہے۔ مجھ میں اتنی تاب نہیں کہ میں ان آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ بولوں۔ حالانکہ میں چاہتا ہوں کہ کچھ کہوں۔ لیکن وہ آنکھیں۔

آج میں نے [illegible] ہوئی آنکھوں کو بجھا سا پایا ہے معلوم نہیں وہ ہوتی [illegible] حسین! ....!

اگر یہ بات سچ ہے کہ جب آنکھوں میں ایک مخصوص اداسی آجاتی ہے ایک مخصوص اداسی! تو شاید زندگی کی قندیل میں تیل ختم ہونے کو ہوتا ہے۔ اگر سنسار والوں کا یہ خیال سچ ہے تو میں سوچتا ہوں کہ سلمہ... سلمہ!

سلمہ! شاید آپ اس سے واقف نہیں۔

وہ سرو کے قد سی، سانولی سی آنکھوں والی جس کو دیکھتے ہی زندگی کی نبضیں چھوٹ جائیں۔ اور ایسا احساس ہو کہ کہیں کوئی چیز کھو گئی ہے۔ گم ہو گئی ہے اور انسان کچھ بھی نہ سوچ سکے سب بھول جائے۔ ہاں سب بھول جائے بھول بھلاوا۔ بھول جانا۔ اور پھر سلمہ آنکھوں میں ناچتی ہی رہے۔ ناچتی ہی رہے۔

اگر کسی چیز کے کھو جانے کے احساس کا نام عشق ہے اگر بھلاوے کو محبت کہتے ہیں تو میں کہوں گا۔ پکار پکار کر کہوں گا کہ سلمہ کو میں چاہتا تھا۔ چاہتا ہوں اور چاہتا رہوں گا۔ بھولنے کی عادت برابر رہے گی اور کسی چیز کے کھو دینے کا احساس ہر گھڑی کام کرتا رہے گا۔

لیکن کوئی کیا جانے یہ ایک پرانی کہانی ہے۔ بہت پرانی!

ابھی کچھ بھی احساس نہ تھا۔ کائنات کی دلفریبیاں اور رنگینیاں بے معنی سی تھیں زندگی سو رہی تھی کہ کسی نے ہلکی سی چٹکی لی اور زندگی انگڑائی لیتی ہوئی بیدار ہوئی۔ معلوم ہوا کہ ہر چیز بدل گئی ہے ہر شے میں ایک نرالا پن اور ہر ذرہ میں ایک نئی بات معلوم ہوئی۔ بہتے ہوئے پانی اور مچلتی ہوئی لہروں کو دیکھ کر خود کو بھی مچلنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ من نے کہا کچھ ہنس بھی، کچھ گا بھی، کچھ ناچ بھی! اتنے میں وہ کالی سی آنکھوں والی سے مڈبھیڑ ہوئی ...... رسوئی گھر میں!

یہی موسم تھا۔ یہی دن تھے۔ اور آسمان پر بادل یوں ہی آوارہ پرندوں کی طرح رہتے تھے۔ کلیاں مسکرا رہی تھیں اور ڈالیاں آپس میں گلے مل رہی

تھیں۔ میں باجی کے یہاں جا رہا تھا۔ باجی کا گھر شہر سے بہت اپل دور ہے اور میں دو میل پر جا رہا تھا۔ شاید آدھے سے زیادہ راستہ طے کر چکا تھا۔ کھیتوں میں کام کرنے والے غریب کسانوں کے چہرے پر آج غیر معمولی رونق تھی جیسے انہیں، یقین تھا کہ اس سال ان کی زمین سونا اگائے گی سونا! بادل امنڈ امنڈ کر آ رہے تھے۔ ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں پر چلتی ہوئی گاؤں کی کنواریاں جل لانے کے لئے جا رہی تھیں ساتھ ساتھ وہ گا بھی رہی تھیں۔ ان کے گلے میں بڑا رس تھا اور وہ جیسے اسی فضا میں گھل رہی تھیں۔

پانی برسنا شروع ہوا گانا ختم ہو گیا اور کنواریاں ان پگڈنڈیوں پر سے ہوتے ہوئے کہیں غائب ہو گئیں اور وہ کسانوں کا کہیں پتہ نہ تھا سڑک تھی اور میں تھا۔ بارش زوروں پر ہو رہی تھی چلتے چلتے میں تھک گیا تھا۔ کچھ دیر آرام لینے کی خاطر میں ایک کچے مٹی کے گھر کے پاس کھڑا ہو گیا کہ اتنے میں آواز آئی۔

او میاں جی! کیوں کھڑے بھیگتے ہو۔ اندر آجاؤ نہ!

میں یہی سوچ رہا تھا کہ یہ کس کی آواز ہے۔ یہ کون ہے کہ اتنے میں پھر آواز آئی۔

او میاں جی! کیوں کھڑے بھیگتے ہو۔ اندر آجاؤ نہ!

باہر کھڑا کیوں بھیگ رہا ہوں۔ انہیں میرا بھیگنا پسند نہیں۔ اتنی ممتا، اتنی دیا۔ کون کہتا ہے کہ انسان کی انسانیت ختم ہو چکی۔ کون کہتا ہے کہ انسان مر گیا ہے!

میں اندر آجاؤں۔۔۔۔۔۔۔ دہلیز پر قدم رکھتے ہوئے میں نے کہا۔

ہاں ہاں۔ آجاؤ۔۔۔۔۔ وہی آواز تھی۔

میں نے دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت مسکراتے ہوئے میرا استقبال کر رہی ہے۔ کمرے کے کونے میں بائیں طرف چارپائی بچھی تھی اور اس سے لگ کر ایک اسٹول۔۔۔ اور وسط میں ایک چھوٹی سی میز۔ تفصیلی طور پر میں کمرے کا جائزہ لے رہا تھا کہ اتنے میں پھر آواز آئی۔

بیٹا جی! تمہارے کپڑے بہت بھیگ گئے ہیں انہیں بدل ڈالو۔

بیٹا جی! بیٹا۔ ماں۔۔ ماں! میں سوچنے لگا۔

بدلتا ہوں ماں! میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

سلمہ! ایک پیالی چائے تو لے آ۔۔۔ ذرا گرم گرم

یہ میری بھانجی ہے ایک مدت ہوئی کہ اس کے ماں باپ کا انتقال ہو چکا تب ہی سے اسے میں نے اپنا تو لیا ہے۔ اس دنیا میں اگر کوئی ہے تو بس یہی اور یہ چند کھیت جس سے کچھ پیٹ چلتا ہے۔

بڑھیا نے دو کھیتوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

جی! میری دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔

اتنے میں پاس والے کمرے سے ایک زندگی ٹمٹماتی ہوئی نکلی۔

وہی کالی سی آنکھوں والی۔۔۔ سلمہ۔۔۔ سلمہ!!

اس کی نگاہیں جھکی جھکی تھیں۔ پلکیں جیسے بہت وزنی تھیں جو اوپر ہی نہیں اٹھ سکتی تھیں۔ اف اس کے چہرے میں کتنی جاذبیت تھی کتنی کشش تھی کتنا نمک تھا جیسے دنیا بھر کے سارے رسوئی گھروں کا نمک سمٹ کر یہاں آگیا ہو۔ ہم ہندوستانی نمک کو کتنا چاہتے ہیں۔ کتنا پیار کرتے ہیں۔ اگر یہ نمک نہ ہوتا تو ہمارے دیس کی سلمائیں، سلمائیں نہ ہوتیں۔ شاید ہمالیہ بھی اپنے سر کو اس لئے بلند کئے رہتا ہے کہ اس دیس کی رہنے والی سلماؤں کے چہرے پر نمک ہے۔ نمک!

میں اس پر مرتا ہوں۔ میں اس پر جان دیتا ہوں۔ بارش تھم چکی تھی میں باجی کے یہاں چلا گیا۔۔۔۔۔ لیکن پھر آتا ہی رہا اور سلمہ سے ملتا ہی رہا۔ اور ایک زمانے تک ملتا رہا۔ کھیتوں کے کنارے بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیوں کے پاس اور پنگھٹ کے قریب، گھنے نیم کے نیچے۔ ان سب کو یہ بات معلوم ہے اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو کتنا چاہتے تھے گھنٹوں ان لوگوں نے ہماری باتیں سنیں اگر یقین نہ آئے تو ان سب سے جا کر پوچھئے۔ پوچھئے کہ چاندنی راتوں میں اور تاروں کی چھاؤں میں یہاں کون آتا تھا۔ وہ آپ کو بتائیں گے۔ مزہ بتائیں گے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ساتھ ساتھ یہ بھی بتائیں گے کہ زمیندار کے بیٹے اصغر نے سلمہ کے ساتھ [illegible] کی اور اس کے کھیتوں کو ہڑپ کر کے اور بے چارہ رشید کچھ بھی نہ کر سکا۔ کچھ بھی نہ کر سکا۔۔۔۔۔۔۔۔

اب بھی کبھی [illegible] یہاں آتا ہے اور [illegible] کروٹ بدلتا ہے۔۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔ وہ آپ کو [illegible] نہ بتا سکے۔

خیر جانے دیجئے یہ بہت دور کی بات ہے۔

اب میں باجی کے یہاں نہیں جاتا۔ باجی [illegible] آج کل امی اور باجی میرے لئے ایک نئی سلمہ تلاش کر رہی ہیں۔ [illegible] میری زندگی میں ایک سلمہ آ کر چلی گئی۔

سلمہ۔۔۔ سلمہ۔۔۔ س۔۔۔! آج اصغر کی ان دو اداس اور بے نور آنکھوں میں بسی ہوئی ہے اور شاید کہیں دور سے سلمہ چیخ رہی ہے اصغر۔ اصغر۔ اصغر!

ہاسپٹل۔ لمبی لمبی سفید دیواریں، بڑے بڑے ہال جہاں چاروں طرف پھیلی ہوئی دواؤں کی بو۔ تھرکتی ہوئی گول گول ہنڈلیاں نرسیں! رحمت کی

دیویاں۔ آپٹیں۔ زندہ انسانی لاشوں کا ایک چھوٹا سا شہر!

آج سلمہ کا چہرہ اترا ہوا تھا وہ بہت غمگین تھی۔ اس کی جھکی جھکی نگاہیں آج بہت حیران تھیں وہ ہر شے کو کچھ عجیب انداز سے دیکھ رہی تھی جیسے وہ کچھ جاننا چاہتی تھی۔ معلوم کرنا چاہتی ہو۔ وہ شاید رو بھی رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے اسے کبھی روتے نہیں دیکھا۔ اس وقت بھی نہیں جبکہ اس کی خالہ مرگئی تھی لیکن آج . . . . آج . . . .

اس نے مجھ سے پوچھا . . . .

کہیئے کیا وہ بچ جائیں گے؟

وہ اپنے سہاگ کے بارے میں مجھ سے پوچھ رہی تھی۔ اصغر کے بارے میں مجھ سے پوچھ رہی تھی لیکن میں کیا کہتا . . . . کیا کہتا۔

آنکھوں میں جب ایک مخصوص اداسی چھا جاتی ہے ایک مخصوص اداسی! تو زندگی کی قندیل میں تیل ختم ہونے کو ہوتا ہے یہ بات دنیا والے کہتے ہیں معلوم نہیں کتنی سچ ہے۔ معلوم نہیں۔

ایک بار صرف ایک بار اس کی اداس آنکھوں نے اٹھ کر مجھ سے کہا۔

میں بڑی بدنصیب ہوں نا۔ ابھی بچی تھی کہ ماں باپ دونوں مر گئے بڑی ہوئی۔ اور چپکے سے آپ میری زندگی میں آ گئے۔ پھر کیا ہوا۔ شادی ہوئی کسی اور کے ساتھ۔

لیکن اب . . . . اب!

آج اصغر کی آنکھیں بے نور سی ہوتی جا رہی ہیں اور سہاگ کی وہ لمبی سی ڈور جو ایک دوسرے کو باندھے ہوئے ہے ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے اور کہیں یہ ڈھیلے پڑتے پڑتے گرہ سی کھل جائے تو؟ . . . . . . نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ میری محبوبہ کا سہاگ۔ اسے اپنا سہاگ پیارا ہے میں بھی اس کے سہاگ سے پیار کرتا ہوں۔ مانا کہ اصغر کی موت میرے لئے ایک نئی راہ کھولتی ہے لیکن وہ اس کا شوہر ہے۔ اس کا دیوتا ہے۔ آخر وہ کچھ تو ہے اس کی موت میری محبوبہ کی موت۔ اور محبوبہ کی موت! نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیئے ہرگز نہیں ہونا چاہیئے میں اسی کے سہارے جی رہا ہوں۔ میں اس کی مسرت کو اپنی مسرت سمجھتا ہوں اگر وہ خوش نہ رہ سکے تو میں کیا کروں گا۔ میں کیا کروں گا . . . . . . تیرا اے مالک تیرا!

آج زندگی میں پہلی بار اور شاید آخری بار میں تجھ سے بھیک مانگتا ہوں کہ میری محبوبہ کے سہاگ کو قائم رکھ۔ اے رحیم اصغر کو بچا لے۔ بچا لے اے اللہ

اگر آپ بھی دعا کے قائل ہیں تو میں آپ سے درخواست کروں گا کہ میری محبوبہ کے سہاگ کے لئے دعا کیجیئے۔ بہت ممکن ہے کہ آپ کی دعا قبول ہو جائے ایسا ہو سکتا ہے ضرور ہو سکتا ہے۔

کون کرے؟

تبسم نظامی

غم سے حیاتِ عشق ہے لیکن غم کا ساماں کون کرے
دل تو ہمت ہار چکا یہ کارِ نمایاں کون کرے

ترکِ ارماں سب کچھ ہے اب دوست کا ارماں کون کرے
اسکی تمنا کر کے دوبارہ دل کو پریشاں کون کرے

میری سیہ بختی کا عالم دیکھنے والا کوئی نہیں
ظلمت ہر سو طاری ہے ظلمت میں چراغاں کون کرے

چارہ گروں کی چارہ سازی میرے کسی مصرف کی نہیں
درد تو ان کا خاص کرم ہے درد کا درماں کون کرے

حسن سراپا آئینہ اور اسکی نظر آئینہ ساز
اس سے نگاہیں کون ملائے اسکو حیراں کون کرے

دستِ جنوں کو داماں سے جو کاوش تھی وہ ختم ہوئی
دیکھ لیا انجامِ جنوں اب داماں داماں کون کرے

گل کی بجائے کانٹے ہیں بستی کی جگہ ہے ویرانی
دل کیا ہے اک صحرا ہے صحرا کو گلستاں کون کرے

اہلِ کشتی دریا کی موجوں کو ساحل کیوں سمجھیں
کشتی جب تک غرق نہ ہو اندازۂ طوفاں کون کرے

سارے چمن کا حسن تبسم آ کے خزاں نے لوٹ لیا
وہ عالمِ رنگ و بو ہی نہیں تو عزمِ گلستاں کون کرے

ایک ایکٹ کا ڈرامہ

ابراہیم یوسف بی اے

ننھا مجاہد

شاعر ۔ جو تباہی دیکھ کر پاگل سا ہو گیا ہے۔
سیٹھ جینی لال ۔ جو درحقیقت فساد کا بانی ہے ۔ مگر اب گھبرا کر حواس باختہ ہو گیا ہے۔
کارندہ ۔ جینی لال کا ہمراز اور منیم۔
بچہ ۔ کارندہ کے لڑکے کا لڑکا۔
پولیس کے سپاہی وغیرہ۔

منظر ۔ ایک فساد زدہ قصبہ۔ جہاں فساد کے بعد ملٹری اور پولیس نے قبضہ کر لیا ہے۔ اس قصبہ کے سب سے بڑے سیٹھ جینی لال کے کارندہ کا مکان ہے مکان کا ایک کمرہ۔ رات کا وقت ہے۔ کمرہ میں ایک معمولی چراغ جل رہا ہے۔ چراغ کی روشنی بمشکل تمام کمرہ میں ہو رہی ہے۔ اور تمام کمرہ میں چراغ کا دھواں پھیل رہا ہے مغربی اور مشرقی جانب دو دروازے ہیں۔ جو دوسری طرف کھلتے ہیں۔ جنوبی جانب بھی ایک دروازہ ہے۔ جو بیرون مکان کھلتا ہے یہ دروازہ اس وقت بند ہے۔ شمالی جانب ایک چھوٹی سی چارپائی بچھی ہے جس پر ایک معمولی بستر بچھا ہے۔ بستر پر ایک چھوٹا سا بچہ جس کی عمر ۸۔۹ سال کی ہے سو رہا ہے۔ اس کے پاس ایک چٹائی پر بوڑھا کارندہ بیٹھا ہے اس کی عمر تقریباً ۵۵ سال کی ہے۔ کمرہ میں سیٹھ جینی لال موجود ہیں موٹا تازہ جسم ہے۔ اور عمر تقریباً ۶۰ سال کے قریب۔ ایک میلی سی دھوتی باندھے اور ایک کالی میلا کھیلا کرتہ پہنے کمرہ میں اس طرح گھوم رہے ہیں جیسے پاگل ہو چکے ہیں۔ کچھ آہستہ آہستہ بڑبڑاتے جاتے ہیں۔ چہرے کے اتار چڑھاؤ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بڑی کشمکش اور پریشانی میں مبتلا ہیں۔ کارندہ برابر خاموش بیٹھا کچھ سوچ رہا ہے۔ بالکل خاموشی ہے۔ سڑکوں پر کبھی دور سے اور کبھی نزدیک سے کتوں کے چیخنے کی آواز آجاتی ہے۔ یا کبھی سڑک پر سے گشت کرنیوالے سپاہی باتیں کرتے گذرتے ہیں تو قصبہ میں زندگی کا احساس ہوتا ہے۔

جینی لال۔ (ٹہلتے ہوئے) منیم جی! میں پاگل ہو جاؤں گا ۔ خوف سے میرا دل لرز رہا ہے۔

کارندہ۔ سیٹھ جی! گھبرانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ آپ خاموشی سے جا کر کمرہ میں آرام کیجئے۔

جینی لال۔ میں اس گاؤں سے جلد از جلد بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ اگر پولیس کو میری موجودگی کا علم ہو گیا تو . . . . .

کارندہ۔ (پریشان ہو کر) رات تو آپ کسی طریقہ سے گذار لیجئے صبح کچھ پولیس کو دینے دلانے ... یا ... کوئی اور تدبیر سوچی جائیگی۔

جینی لال۔ (اب صبح تک میں بالکل پاگل ہو جاؤں گا۔ میرا دماغ کام نہیں کر رہا ہے۔ (پھر ٹہلنے لگتے ہیں۔ کارندہ کسی گہری سوچ میں گردن جھکا کر مبتلا ہو جاتا ہے۔ سیٹھ جی کچھ دیر ٹہلتے رہتے ہیں۔ اور پھر خود ہی بڑبڑاتے ہوئے) میں یقیناً پاگل ہو جاؤں گا..... بالکل پاگل ہو جاؤں گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سب تدبیروں پر پانی پھر گیا۔ سب تدبیریں اُلٹی ہو گئیں۔

(شاعر مغربی دروازہ سے داخل ہو کر زور سے قہقہے لگاتا ہے پھر جینی لال کے پاس جا کر)

شاعر۔ (طنزیہ انداز میں) سب تدبیریں اُلٹی ہو گئیں (پاگلوں کی طرح قہقہے پر قہقہے لگاتا ہے)

کارندہ۔ (سمجھانے کے لہجے میں) شاعر خاموش رہو۔ یہ وقت

شاعر۔ (تیز تیز قدموں سے کارندہ کے پاس جا کر قطع کلام کر کے) کیوں خاموش رہوں؟..... میری رُوح پر ہتھوڑے مارے جائیں اور میں خاموش رہوں۔ ہرگز نہیں۔ (پھر قہقہے لگا کر)..... میں چیخوں گا..... چلاؤں گا..... قہقہے لگاؤں گا..... میں سیٹھ جینی لال کا غلام نہیں ہوں۔ (پھر قہقہے لگاتا ہے)

جینی لال۔ (پریشان ہو کر) شاعر! تم اپنے قہقہوں سے مجھے پاگل بنا دو گے۔

شاعر۔ ہاں۔ میں چاہتا ہوں کہ جن کے دلوں میں احساس نہیں ہے۔ وہ میری طرح پاگل ہو جائیں۔ انہیں دنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔

کارندہ۔ (اُٹھ کر سیٹھ کے پاس جا کر) سیٹھ جی آپ جا کر آرام کیجئے۔ (ہاتھ پکڑ کر مشرقی دروازہ کے پاس لے جاتا ہے۔ اور سیٹھ کو دوسرے کمرے میں چھوڑ کر دروازہ بند کر لیتا ہے۔ شاعر کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے۔ کارندہ پھر آ کر چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے۔ شاعر کچھ دیر ٹہلنے کے بعد)

شاعر۔ سیٹھ جینی لال۔ (قہقہے لگاتا ہے)

کارندہ۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر جیسے خود سے کہہ رہا ہو۔) بیچارہ شاعر! بالکل پاگل ہو گیا ہے۔

شاعر۔ ہاں پاگل ہو گیا ہوں۔ مجھے حق ہے کہ میں پاگل ہو جاؤں۔ مجھے حق ہے کہ میں سب کچھ کر جاؤں۔ (کارندہ کے پاس جا کر) کیا تمہاری روح نہیں کانپ رہی ہے؟ کیا خوفناک تباہی نے تمہارے مردہ احساسات میں اب بھی رُوح نہیں پھونکی؟ (قہقہہ لگا کر)

کارندہ۔ (پریشان ہو کر) شاعر تمام گاؤں میں پولیس اور فوج پھر رہی ہے۔ تمہاری یہ چیخ چلاہٹ کہیں......

شاعر (قطع کلام کر کے) میں پولیس سے نہیں ڈرتا۔ میں فوج سے نہیں ڈرتا۔ ہتھکڑی اور بیڑی کی مجھے پرواہ نہیں۔ (پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ خود سے باتیں کرتے ہوئے) میں نے اس گاؤں میں نغمے گائے۔ میں نے اس گاؤں کے پتھروں اور کنکروں سے محبت کی۔ لیکن آج میں اس جنت نشان میں ایک وحشت پاتا ہوں۔ ایک تاریکی پاتا ہوں۔ ایک خوف و ہراس پاتا ہوں۔ ہرگز نہیں۔ (چیخ چیخ کر) میں چیخوں گا۔ چلاؤں گا۔ جان دے دوں گا۔ میں یہ تباہی برداشت نہیں کر سکتا۔ (قہقہے لگاتا ہے۔ پھر چیخ چیخ کر) آئے پولیس اور فوج گرفتار کرے مجھے۔ میں جیل خانہ کی کوٹھڑی میں ایک خونی نظم لکھوں گا۔ اور اس کی دیواروں کو اپنے خون سے لکھے ہوئے اشعار سے مزین کروں گا۔

(پھر پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتا ہے۔ کارندہ اُٹھ کر اس کے پاس آتا ہے۔ اور کاندھے پر ہاتھ رکھ کر)

کارندہ۔ شاعر! تم بہت تھک گئے ہو۔ جا کر آرام کرو۔

شاعر۔ (قہقہہ لگا کر) تھک گیا ہوں۔؟ میں نہیں تھک سکتا۔ اب موت ہی مجھے تھکائے گی۔

کارندہ۔ تو پھر خاموش رہو۔ تمہاری یہ چیخ چلاہٹ اور تمہارے دل کا یہ درد مجھے بھی پاگل کر دے گا۔

شاعر۔ (قہقہے لگا کر) تم اور پاگل؟ تم پاگل نہیں ہو سکتے۔ تم سیٹھ کے کارندہ ہو۔ اور ایک غلام۔ غلام کبھی پاگل نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کے جذبات ہمیشہ مردہ رہتے ہیں۔ تم نے اپنے جوان لڑکے کی موت دیکھی اور پاگل نہیں ہوئے۔ (قہقہے لگا کر) اور یہ بھی جانتے ہو کہ اس کی موت کا سبب کون ہے۔ تم انتقام تک نہیں لے سکتے تم پاگل کیا ہو گے.....!

کارندہ۔ شاعر! میرے بھی کچھ احساسات ہیں۔ میرے بھی کچھ جذبات ہیں۔ لیکن مجھ میں ضبط کا مادہ زیادہ ہے..... نہیں.....

(شاعر لاپرواہی سے کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے۔ جیسے اسے کارندہ کی باتوں میں دلچسپی نہیں۔ پھر خود ہی بڑبڑاتے ہوئے)

شاعر (آہستہ آہستہ بڑبڑاتے ہوئے) گاؤں کی معصوم دوشیزائیں چلتی ہوئی گھاٹ پر جاتیں تو ان کا اشنان روح میں تازگی۔ اور جذبات میں ایک نئی روح بیدار کرتا تھا۔ ان کے قہقہے ان کی معصوم شرارتیں۔ ان کی آپس کی چھیڑ چھاڑ۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی فردوسی چیزیں ہیں۔ تکلف اور تصنع سے بری۔ وہ محبت اور خلوص کی پریاں معلوم ہوتی تھیں۔ مگر یہ سب چیزیں اب تو خواب ہیں۔

(کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے) اور کمرہ پر کامل خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ کہیں کہیں شاعر کچھ بڑبڑا دیتا ہے۔ یکایک چارپائی پر سوتا ہوا بچہ کسی چیز سے ڈر کر چیخ مارتا ہے۔ بڑھا کارندہ اسے گود میں اٹھا لیتا ہے بچہ کچھ دیر گھبرا کر بڈھے کارندہ کو دیکھتا رہتا ہے)

کارندہ۔ کیا ہوا بیٹا۔

بچہ۔ دادا۔ میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ بہت خوفناک آپ مجھے اپنی آغوش میں چھپاؤ دادا۔

شاعر۔ (کارندہ کے پاس جاکر) بزدل۔ غلام کے آغوش میں پناہ ..... نہیں میرے ننھے مجاہد۔ نہیں۔ میں معصوم مجاہد کو غلام کے آغوش میں پناہ نہیں لینے دوں گا۔ (بچے کو اپنے آغوش میں لے کر) آ میرے ننھے مجاہد آغوش میں آ۔ جس آغوش میں کسی کا خوف نہیں۔ اس کی آغوش میں آ۔ جس کی آغوش میں مجاہدین کی جنت ہے (بچے کو لے کر کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے۔ پھر آہستہ سے بچہ سے) میرے ننھے مجاہد خواب پھر خواب ہے۔ تمہیں حقیقت سے بھی ڈرنا چاہیئے۔ تم ایک بہادر بچے ہو۔

بچہ۔ شاعر چچا۔ میرا خواب بہت خوفناک ہے۔

شاعر۔ مجاہد کا خواب ہمیشہ خوفناک ہوتا ہے۔ کیا خواب تم نے دیکھا ہے ننھے۔

بچہ۔ (کانپتی ہوئی آواز میں) میں نے آسمان پر ایک بہت ہی خوفناک سیاہ بادل دیکھا۔ جو ہمارے تمام گاؤں پر چھا گیا۔ پھر اس نے ننھے ننھے چھوٹے بادلوں کو دیکھا اور ان کی طرف جھپٹا۔ چھوٹے ٹکڑے سہم کر ایک جگہ جمع ہو گئے۔ اس خوفناک سیاہ بادل نے ان چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر ٹکر ماری۔ ایک خوفناک گرج پیدا ہوئی۔ میں ڈر گیا۔ (خوف سے کانپتے ہوئے شاعر سے چمٹ جاتا ہے)

شاعر۔ دیکھو میرے دوست۔ میں تمہیں مجاہد کہتا ہوں۔ اور مجاہد ڈرا نہیں کرتے (بچے کو محبت سے پیار کر کے) پھر کیا ہوا میرے ننھے مجاہد؟

بچہ۔ (خوف زدہ آواز میں) پھر چھوٹے چھوٹے بادلوں کے ٹکڑے سرخ ہو گئے۔ اور آسمان سے خون کی بارش ہونے لگی..... میرے بابا۔ اپنی چھوٹی سی پرانی چھتری لے کر لپکے اور انہوں نے گاؤں کے تمام لوگوں کو ..... نورا۔ کریم۔ بھگوان داس۔ اور رامو کو اپنی اس چھتری میں چھپا لیا۔

..... پھر جانتے ہو کیا ہوا؟

کارندہ (پریشان سا ہو کر) بیٹا۔ خاموش رہو۔ تمہارا خواب خوف ناک ہے۔

شاعر۔ (بچہ کو پیار کر کے) ننھے مجاہد تمہارا خواب ایک حسین خواب ہے۔ بیان کرو پھر کیا ہوا بیٹا۔

بچہ۔ پھر ایک عجیب وغریب قسم کا جانور بابا کی طرف لپکا۔ (پھر خوف سے شاعر سے چمٹ جاتا ہے)

شاعر۔ کیوں ننھے مجاہد پھر ڈر رہے۔ خوف تمہارا غلام ہے۔ اور تم اس کے آقا۔

بچہ۔ اس کا بدن سور کی طرح تھا۔ منہ کتے کی طرح۔ اور پنجے بھیڑیے کی طرح۔ اس کے پنجے خون میں بھرے ہوئے تھے۔ منہ میں انسانوں کی ہڈیاں تھیں۔ میرے بابا نے اس کا مقابلہ کیا۔ مگر اس نے بابا کو گرا دیا اور پھر سب لوگ خون میں لت پت ہو گئے۔ میں اپنی لاٹھی لے کر اس جانور کی طرف لپکا۔ تو وہ مجھ سے ڈر کر بھاگ گیا۔

شاعر۔ شاباش۔ ننھے مجاہد شاباش۔ تیرا عزم و استقلال اس بھیڑیئے کو ضرور ختم کرے گا۔ جو اس تباہی کا سبب ہے۔

(ننھے کو گاتا ہے اور پھر بچے کو محبت سے پیار کرتا ہے)

بچہ۔ (... کے چہرہ کو غور سے دیکھ کر) چچا شاعر! میرا بابا کہاں گیا ہے۔ (بوڑھے کارندہ کو دیکھ کر) دادا کہتا ہے کہ وہ میرے لئے عمدہ عمدہ کھلونے لینے گیا ہے۔ (پھر بڈھے کو دیکھ کر جس کی آنکھوں میں آنسو ہیں) ..... دادا ..... جب میں بابا کا ذکر کرتا ہوں تو تمہاری آنکھوں میں آنسو کیوں آجاتے ہیں؟

کارندہ۔ دیکھو بیٹا۔ تم اپنے بابا کا ذکر بار بار نہ کیا کرو اس سے مجھے دکھ ہوتا ہے۔

(شاعر زور زور سے قہقہے لگاتا ہے۔ اور بچہ کو گود میں لے کر ٹہلنے لگتا ہے۔ قہقہے لگانے کے بعد)

شاعر۔ ننھے مجاہد! تیرے دادا کی آنکھیں بے نور ہو چکی ہیں۔ وہ کھلی ہوئی ہیں مگر دیکھ نہیں سکتیں۔ (بچہ کو چارپائی پر بٹھا کر زمین پر بیٹھ جاتا ہے۔ اور پھر سمجھانے کے لہجہ میں) معصوم مجاہد! (کارندہ کی طرف اشارہ کر کے) یہ ایک غلام کی آنکھیں ہیں۔ جو صرف رو سکتی ہیں۔ ان میں عزم و ارادہ نہیں۔

بچہ۔ (معصومانہ انداز میں) ایسا کیوں ہوتا ہے۔ شاعر چچا۔

شاعر۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ (قہقہہ لگا کر) اس لئے کہ غلام کی آنکھیں فرمانبرداری کے لئے کھلتی ہیں۔ بغاوت کے لئے نہیں۔

بچہ۔ تو کیا میرا دادا ابھی غلام ہے؟

شاعر۔ کیوں نہیں؟

بچہ۔ میں اپنے دادا کو غلام نہیں رہنے دوں گا۔ اسے اپنی طرح مجاہد بناؤں گا۔

شاعر۔ (طنزیہ لہجہ میں) ایسا نہ کہو ننھے مجاہد۔ تیرے دادا کو دکھ ہوتا ہے۔ مجاہد کا نام سن کر اس کی روح کانپ جاتی ہے۔

(کارندہ سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ جاتا ہے۔ سڑک پر سے کچھ سپاہی باتیں کرتے ہوئے گزرتے ہیں۔ جن کی آواز کمرہ میں آتی ہے جینی لال کمرہ میں داخل ہوتے ہیں۔ انہوں نے کرتا اتار رکھا ہے۔ بال بکھرے ہوئے ہیں۔ آنکھوں سے وحشت برس رہی ہے۔ جیسے وہ پاگل ہو چکے ہیں۔ پہلے تو شاعر کو دیکھ کر پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتے ہیں۔ پھر کارندہ کے پاس جا کر رازدارانہ لہجہ میں)

جینی لال۔ منیم جی! پولیس نے اس مکان کے گرد گھیرا ڈال رکھا ہے۔ اب ہم گرفتار ہونے والے ہیں۔

کارندہ۔ گرفتار! سیٹھ جی!.....

جینی لال۔ (قہقہے لگا کر) ہاں۔ گرفتار..... (رازدارانہ لہجہ میں) پولیس کو ہمارے سب راز معلوم ہو گئے ہیں۔ ان کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ فساد ہم نے کرایا ہے۔ میرا مکان بھی ہم نے خود ہی جلایا ہے۔ بیمہ کمپنی سے نا......

کارندہ۔ سیٹھ جی۔ آپ جا کر سو جائیے۔ اس وقت آپ....

جینی لال۔ (ڈرامائی انداز سے قطع کلام کر کے) سو لے اور کھوئے پولیس آ کر گرفتار ہی کرے گی۔ اور ہاں۔ ہم دروازہ مضبوطی سے بند کر لیں۔ (دروازہ کے پاس جاتا ہے اور اسے کھولتا ہے۔ کارندہ دوڑ کر سیٹھ کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہے)

کارندہ۔ سیٹھ جی کیا کرتے ہو۔ (دروازہ بند کر کے چٹائی پہ آ کر بیٹھ جاتا ہے)

جینی لال۔ (رازدارانہ لہجہ میں) اور پولیس کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ تمہارے لڑکے کو میں نے قتل کرایا ہے۔ وہ فساد روکنا چاہتا تھا نا... (قہقہے لگاتا اور پھر اٹھ کر ٹہلنے لگتا ہے) پھر کارندہ کے پاس جا کر مصلحت اس میں تھی کہ اسے قتل کرا دیا جائے۔ (پاگلوں کی طرح قہقہے لگا کر) قتل قتل..... ہاہاہا۔

بچہ۔ (چارپائی سے اٹھ کر سیٹھ کے پاس جا کر) تم نے میرے بابا کو قتل کرایا ہے۔ میں تم سے انتقام لوں گا۔

شاعر۔ (قہقہے لگا کر) شاباش مجاہد۔ شاباش۔ تیرا عزم....

جینی لال۔ (پاگلوں کی طرح قہقہے لگا کر قطع کلام کر کے) انتقام۔ انتقام۔ (قہقہے لگاتا ہے۔ پھر خوفزدہ نظروں سے بچہ کو گھورتا ہے اور اس کے منہ پر ایک طمانچہ رسید کرتا ہے۔ بچہ چیخ کر رونے لگتا ہے کارندہ جینی لال کی طرف گھور کر دیکھتا ہے۔ پھر بچہ کو دیکھتا ہے۔ اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے۔ اور سیٹھ سے مخاطب ہو کر)

کارندہ۔ (غصہ سے) سیٹھ جی! میں اس وقت تک سب کچھ برداشت کرتا رہا۔ لیکن اب برداشت کی حد ہو چکی ہے۔ تم انسان نظر نہیں آتے۔

جینی لال۔ انسان۔ (قہقہے لگاتا ہے) خاموش رہو۔ اب مجھے کسی کا خوف نہیں۔

کارندہ۔ (غصہ سے) میں خاموش رہوں۔ ہرگز نہیں۔ اب میرا جذبہ انتقام جاگا ہے۔

(شاعر زور سے قہقہہ لگاتا ہے سیٹھ ایک اور طمانچہ بچے کے رسید کرتا ہے۔ بچہ زور زور سے رونے لگتا ہے سیٹھ اور کارندہ ایک دوسرے سے چیخ چیخ کر گفتگو کرتے ہیں۔ جو سمجھ میں نہیں آتی۔ شاعر برابر قہقہے لگائے جاتا ہے۔ پولیس دروازہ کھول کر داخل ہوتی ہے)

(بقیہ صفحہ ۶۱ پر)

مقبول حسین احمد پوری
بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی



کیسے قرار و بقایاں ہمدم، ہیں موہوم یہ سارے منظر

کیوں پَودا نکلا مٹی سے ؟
پھولوں کا ارمان لئے
کیوں دم بھر کو پھیلی خوشبو؟
باغِ ارم کی آن لئے

بکھر گئیں آخر پنکھڑیاں کُھلا کر مُرجھا مُرجھا کر۔ کیسے قرار و بقایاں، عدم!!

خاک نے ڈھالا جسم کا ڈھانچا
رعنائی اور شان لئے!
مٹ کے رہا سب حسن و کرشمہ
اپنا نقش و نشان لئے!

کیا یہ جلوے، کیا یہ آنکھیں۔ یہ فانی و خوابی پیکر۔ کیسے قرار و بقایاں ہمدم!!

عشق نے یوں دکھلائے نمونے
صرف تری پہچان لئے!
بجھ گئیں آنکھیں اہلِ نظر کی
دید کا وہم و گمان لئے!

کیوں بازار میں اس ہستی کے دل نے دکھلائے اپنے جوہر۔ کیسے قرار و بقایاں ہمدم!

ابوسعید بزمی ایم۔اے

ہندستان کا آج اور کل

دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ یہ ایک پرانی مثل ہے جس میں نفسیاتی حقیقت چھپی ہوئی ہے کہ جو چیز انسانی احساسات سے بہت دور رہتی ہے انسانی دماغ ایک خاص قسم کا جادو محسوس کرتا ہے۔ دور کا منظر جتنا سحر آفریں ہوتا ہے اتنا قریب سے نہیں ہوتا۔ یہی کیفیت زمانے کی ہے۔ ہمارا ذہن ماضی اور مستقبل سے جتنا متاثر ہوتا ہے اتنا حال سے نہیں ہوتا۔ جنگ کے واقعات سننے میں جو ذہنی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ جنگ کے واقعی میدان میں موجود رہنے سے نہیں ہو سکتی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ تماشا دیکھنے والے اور تماشا دکھانے والے میں جو فرق ہے وہی فرق واقعات سننے والے اور خود ان واقعات میں حصہ لینے والے میں ہے۔

آج کچھ اسی قسم کی کیفیت ہندوستان کی ہو رہی ہے۔ آج ہم اس تماشے سے نہ پوری طرح لطف اندوز ہو سکتے ہیں اور نہ پوری طرح متاثر۔ جس میں ہر ہندوستانی ایک ایکٹر کی حیثیت سے اپنا پارٹ ادا کر رہا ہے۔ ہم جب پچھلے انقلابات کی کہانیاں سنتے ہیں تو مسحور ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح جب آنے والے زمانے کی کوئی تصویر ہمارے سامنے کھینچی جاتی ہے تب بھی ہم خود کو ایک نئی دنیا میں کھویا ہوا پاتے ہیں لیکن ہم میں سے بہت ہی کم ایسے لوگ ہوں گے جو یہ جان سکیں کہ آج ہم جس دور سے گذر رہے ہیں وہ دنیا کی تاریخ کا ایک نہایت ہی اہم انقلابی دور ہے۔ کل کا مورخ جب ہماری داستان دنیا کو سنائے گا تو لوگ حیرت سے اس کا منہ تکیں گے لیکن آج خود ہم کو اس تماشے کا بہت ہی کم احساس ہے جس کو ہم میں سے ہر ایک سر انجام دے رہا ہے۔

ہندوستان پر انگریز نے بڑے دبدبے اور ٹھاٹھ سے کئی سو سال تک حکومت کی اور "غدر" ۱۸۵۷ء کے بعد سے تو گویا انگریز کا آفتاب اقبال عروج پر پہنچ گیا۔ جو لوگ آج اپنی عمر کے پچاس ساٹھ سال پورے کر چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کے بچپن اور جوانی کے زمانے میں انگریز کی شان و شوکت کا کیا عالم تھا لیکن ان لوگوں میں سے اکثر کو آج یہ معلوم نہیں کہ جس دبدبے اور ٹھاٹھ کی داستانیں انہوں نے کل سنی تھیں آج وہ محض تاریخ کے گذرے ہوئے صفحات کی زینت بن کر رہ گئی ہیں۔ ہمارے دماغ ابھی تک پرانی یاد سے مرعوب ہیں لیکن ہماری اس مرعوبیت کے باوجود یہ حقیقت نہیں بدل سکتی کہ کل جس چیز کو ہم ہندوستان میں انگریز کے جاہ و جلال سے تعبیر کرتے تھے وہ آج ختم ہو چکا ہے۔ ہندوستان میں برطانوی شہنشاہیت کے پاؤں اکھڑ چکے ہیں اور ایک بالکل نئی سیاست کا آفتاب ہم پر طلوع ہو چکا ہے۔

لیکن چونکہ ماضی کی یاد بڑی مشکل سے محو ہوتی ہے اور باپ دادا کے زمانے کا بیٹھا ہوا رعب کم ہوتے ہوتے ہی ہوتا ہے اس لئے آج ایسے لوگ یقیناً بہت کم ملیں گے جو یہ سمجھتے ہوں کہ اب ہندوستان میں انگریزی حکومت کا صرف دھوکا ہی دھوکا رہ گیا ہے۔ ایک بے اصل سایہ ہے جو نظر آ رہا ہے۔ اصل چیز غائب ہو چکی ہے۔ صرف رعب ہے جو ہم پر چھایا ہوا ہے۔ رعب ڈالنے والا عرصہ ہوا غائب ہو چکا ہے۔

یہ بات اگرچہ افسوسناک ضرور ہے لیکن حیرتناک یا غیر قدرتی نہیں۔ جب ساتویں صدی ہجری میں چنگیز کی فوجوں نے خلافت عباسیہ کے پایہ تخت بغداد کو تباہ و برباد کر کے دنیا کی اس عظیم الشان سلطنت کے پرخچے اڑا دئے تھے تو دنیا کو اس واقعہ کے رونما ہو جانے کے باوجود کئی سال تک یہ یقین نہ آیا کہ واقعی سلطنت عباسیہ تباہ ہو چکی ہے۔ ہندوستان میں جب نادر شاہ نے مغلیہ خاندان کے جاہ و جبروت کے غبارے میں ٹھوکر مار کر اس کا پول کھولا تب بھی اکبر و اورنگزیب کے زمانے سے مرعوب ہونے والی دنیا مدتوں سلطنت مغلیہ کے اس انجام پر یقین کرنے سے ہچکچاتی رہی۔

آج بھی تاریخ اپنے کو دہرا رہی ہے۔ انگریز کا وجود ہندوستان سے ختم ہو چکا۔ اس کی شان و شوکت کا آخری جہاز یہاں سے اپنا ساز و سامان لاد کر جا چکا ہے۔ اب اگر کچھ باقی ہے تو صرف وہ ذہنی رعب ہے جو ہمارے دلوں پر محیط ہے اور جو کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

لیکن قوموں کی زندگی میں یہ رعب ہی سخت خطرناک چیز ہوا کرتا ہے یہ نتیجہ تبھی سے آج مسلمان اس فریب کا شکار ہندوؤں سے زائد ہیں لیکن جب اس ڈھول میں کوئی نادر شاہ آخری ٹھوکر مارے گا تو ہم اپنے کو بہت ہی نازاں ہیں۔ حالات میں گھرا ہوا پائیں گے جو لوگ طوفان کی ہواؤں کو دیکھنے کے باوجود ان پہ یقین نہیں کرتے اور گذشتہ کے فریب میں مبتلا ہو کر بغیر کسی بچاؤ کے پڑے رہتے ہیں۔ انہی کو تاریخ کے صفحات بدنصیب قوموں کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

آج ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے یہی امتحان درپیش ہے اگر انہوں نے آنے والے انقلاب کے لئے ابھی سے تیاریاں کر لیں تو نہ صرف ہندوستان کا بلکہ پوری دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوگا لیکن اگر وہ یہی سمجھتے رہے کہ ملکہ وکٹوریہ کے جاہ و جلال کا آفتاب آج بھی ویسے ہی چمک رہا ہے جیسے کل تک چمکتا رہا ہے تو پھر کل کا مورخ ہماری داستان بھی ایسے ہی بیان کرے گا۔ جیسے آج بابل بسار کی تاریخ کی بیان کی جاتی ہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

صفحہ ۵۵ کا بقیہ

(نظامِ جابر) سپاہی۔ یہ کیا شور مچا رکھا ہے۔

بچہ۔ (جینی لال کی طرف اشارہ کرکے) یہ ہیں۔ انہوں نے دادکرایا ہے۔ انہوں نے میرے باپ کو قتل کرایا ہے۔ گرفتار کرلو نہیں۔ (رونے لگتا ہے)

جینی لال۔ (دوڑ کر بچہ کو ایک اور طمانچہ مار کر) خاموش رہ۔

بچہ۔ (روتے ہوئے) نہیں رہتا۔ میں مجاہد ہوں۔ انتقام لوں گا۔

سپاہی۔ (جینی لال کو [illegible] ادہ ہو۔ تو آپ سیٹھ جینی لال ہیں۔ آپ تو خود ہی [illegible] دور سے آپ کی تلاش میں تھے۔ (شاعر قہقہہ لگاتا ہے)

جینی لال۔ لیکن

سپاہی۔ لیکن کچھ نہیں۔ (ہتھکڑیاں پہناتا ہے)

(جینی لال پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتا ہے۔ پھر اپنی جگہ پر اس طرح کودتا ہے جیسے ناچ رہا ہوں۔ کارندہ دھیرے دھیرے شرقی دروازہ کی جانب جاتا ہے۔ دوسرا سپاہی اُسے دوڑ کر پکڑتا ہے)

دوسرا سپاہی۔ آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں (ہتھکڑیاں ڈالتے ہوئے) یہ زنجیریں سونے کی ہیں۔

(پولیس دونوں کو لے جاتی ہے۔ شاعر قہقہہ لگاتا ہے۔

اصول

جلیل شہر کوٹی ایم اے
ایل ایل بی

مجھے ناکامیٔ پیہم سے گھبرانا نہیں آتا
مجھے طوفان کی موجوں میں بہہ جانا [redacted]

دلِ ناداں کو باتوں سے بہلا[redacted] یں آتا
تڑپ جاتا ہوں لیکن مجھکو تڑپانا نہیں آتا

تلاطم خیز ہوں موجیں کہ گرداب فنا آئے
مجھے ساحل پہ آ کے لوٹ کر جانا نہیں آتا

میں ہر رد عمل کے واسطے تیار رہتا ہوں
مجھے اپنے کئے پر آپ پچھتانا نہیں آتا

تنا رہتا ہے میرا سر مرے بازو مرا سینہ
کسی طاقت کے آگے مجھکو جھک جانا نہیں آتا

چلا جاتا ہوں بے خوف و خطر اپنی منزل پر
مجھے ہر گام پر ساحل سے ٹکرانا نہیں آتا

رہائی کی کیا کر[illegible] دن رات تدبیریں
قفس میں ہوں [illegible] مرجانا نہیں آتا

بصد [illegible] برداشت کر لیتا ہوں تکلیفیں
مجھے [illegible] ساختہ اک آہ بھر لینا نہیں آتا

میں قانع ہوں جلیل اپنی گلیم پارہ پارہ میں
مجھے اوروں [illegible] کے ہاتھ پھیلانا نہیں آتا

دعا

قتیل شفائی

نقرئی جھانجھنوں کی [illegible] چھنن دودھ سے پاؤں کو گدگداتی رہے
کھنکنائی رہیں کانچ کی چوڑیاں ہر کلائی سے گیت گاتی رہے
ہر جوانی سدا مسکراتی رہے

گاؤں سے دور کھیتوں کے اس پار وہ صاف شفاف چشمہ ابلتا رہے
شوخ پنہاریوں کا حسیں جھمگھٹا گاگریں لے کے راہوں پہ چلتا رہے
حسن منظر کے سانچے میں ڈھلتا رہے

گرمیوں کی کڑکتی ہوئی دھوپ میں بھی ہرے پیڑ سائے لٹاتے رہیں
ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے پالے ہوئے مست جھونکے شرابیں پلاتے رہیں
نیند بن کر نگاہوں پہ چھاتے رہیں

چودھویں رات کے چاند کی چاندنی کھیتوں پہ ہمیشہ نکھرتی رہے
اونگھتے رہگزاروں پہ چھائے ہوئے ہر اجالے کی رنگت نکھرتی رہے
ایک جنت فضا میں ابھرتی رہے

عید کا دن [illegible] آتا رہے تھاپ ڈھولک پہ ہاتھوں کی پڑتی رہے
منچلی لڑکیوں میں ہنسی کھیل پر نت نئے ڈھب سے بنتی بگڑتی رہے
کوئی منانے تو کوئی اکڑتی رہے

شہر سے لوٹ کر آنے والے جواں گاؤں میں جوق در جوق آتے رہیں
اپنی اپنی دلہن کے لئے [illegible] سونے چاندی کی سوغات لاتے رہیں
[illegible] محل جگمگاتے رہیں

پروفیسر وجدی الحسینی

تمدنی بحران

عالم انسانیت جنگ ہشت سالہ سے فارغ ہوکر اسوقت جس نئی دنیا میں قدم رکھ رہی ہے وہ ایک نامعلوم و مجہول الحال دنیا ہے نئے نظام کے بت نئے خاکے ذہنوں میں ضرور بنائے گئے ہیں لیکن ان خاکوں میں عمل کا رنگ بھرنے کا ابھی موقع نہیں مل سکا ہے صرف سادہ بے رنگ نقشے ہیں جو ہماری نظروں میں ہیں انکی عملی شکل یا واقعاتی تصویر نگاہوں سے اوجھل ہے۔ تمام عالم بالخصوص شرق اور اس میں بھی ہمارا ملک زندگی کے دوراہے پر کھڑا ہوا ہے۔ اسوقت ہندوستان کے ملکی ارباب حل و عقد، اور ملکی رہنماؤں کے سامنے اقتصادی تجارتی، تعلیمی و تنظیمی مسائل کے ساتھ ساتھ معاشرتی اصلاح کا مسئلہ بہت زیادہ دعوتِ فکر و نظر کیلئے پیش ہے ہمارے سامنے اس وقت دو راستے ہیں ایک راستہ ہماری بلند روحانی تہذیب اور اعلیٰ اخلاقی تمدن کی طرف لیجانیکے لئے سفارش کر رہا ہے جو شرق کے دور قدیم ایک اعلیٰ مثال (آئیڈیل) زندگی کا معراج کمال ہے۔ اور دوسرا وہ راستہ ہے جسپر سولہویں صدی (نشاۃ الثانیہ) سے ترقی کرتے ہوئے مغربی اقوام موجودہ، مادی ارتقا کے منتہائے عروج پر پہنچنے کے لئے گامزن۔ ایک طرف روحانی و اخلاقی تمدن کا نقشہ بنایا گیا ہے دوسری طرف خالص مادی فلسفہ پر تہذیب کی بنا رکھی گئی ہے۔ ایک طرف عالم انسانیت کے روحانی فطری تقاضوں کو اولیت اور جسمانی و نفسانی ضروریات پر ثانوی حیثیت دی گئی۔ دوسری طرف سراسر نفسانی و شہوانی ضروری خواہشات کو حاصل زندگی قرار دیا گیا ہے ایک طرف حال و مستقبل دونوں کا لحاظ رکھا گیا ہے بلکہ حال سے مستقبل پر نظر ہے دوسری طرف صرف حال ہی حال ہے حال سے بے پروائی ایک طرف روحانی دلپذیر و دلنشیں مقاصد و نتائج ہیں دوسری طرف

عہد حاضر کے ظاہری نظر فریب مناظر و مظاہر غرضیکہ ایک تہذیب میں مذہبی اور روح کی اساس پر معاشرت کو قائم کیا گیا ہے دوسری جانب ملحدانہ لادینی نظریات پر زندگی کا ڈھانچہ تیار کیا گیا ہے اس لحاظ سے اسوقت ہمارا ملک دو تہذیبوں کی چکی کے پاٹ میں آگیا ہے ہم ایسے برزخ میں پہنچ گئے ہیں جسکے ایک جانب جنت ہے دوسری طرف دوزخ اسلئے ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ اپنے سفر زندگی یا منزل حیات کی سمت کو متعین کر لیں ہمیں ہر تہذیبی و تمدنی کشمکشوں میں سے اپنے راہ عمل نکالنا ہے کیونکہ تہذیب و تمدن اور اسکے متعلقہ فنون لطیفہ جامد و ثابت نہیں رہا کرتے انکو تو جمود، ٹھہراؤ سے سخت بیر ہے۔ معاشرت، تہذیب، تمدن، ادب چلتے ہوئے پانی بہتے ہوئے دریا کے مشابہ ہیں۔ جسطرح دو دریا جب کسی مقام پر ملکر سنگم بناتے ہوئے باہم متصادم ہوتے ہیں وہاں پانی میں تکدر اور کناروں میں شکستگی کا پیدا ہو جانا لازمی ہے یا جس طرح جب پانی میں کسی ایک مقام پر ٹھہراؤ پیدا ہو جائے تو اس میں تعفن پیدا ہو جاتا ہے۔ اسیطرح جب دو تہذیبوں کا باہمی تصادم، آپس کا ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے تو قومی معاشرت کی بنیادیں لرز لرز کر ٹوٹ جاتی ہیں علی ہذا جب ایک تہذیب اپنے مخصوص رسم و روایات کی پابندیوں سے منجمد ہو جاتی ہے اس میں تعفن آجاتا ہے تہذیب و معاشرت کو سیال جاندار بنانے کیلئے یا تو غالب تہذیب [illegible] اپنی تہذیب کو بھی بہا دیا جاتا ہے اپنی معاشرت کو مدغم کر دیا جاتا ہے یا پھر دونوں کے میل ملاپ سے ایک تیسری تہذیب منظر عام پر نمودار ہو جاتی ہیں۔

موجودہ دور پر نظر ڈالیئے تو آپکو معلوم ہو جائیگا کہ ہم ہوبہو اسی دور کا

سے پہلے پہلے تمام یورپ میں ایک خاص تہذیب رائج تھی۔

پاپائیت برسر اقتدار تھی کلیسا کا حکم بے چوں وچرا ہرجگہ نافذ تھا۔ مذہبی قید و بند انتہائی شدید طور پر موجود تھی۔ حریت خیالی شہری آزادی کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ فکر و عمل پر سخت پابندیاں عائد تھیں۔

جمود پسند ذہنیت کا دور دورہ تھا۔ عیسائیت کو غلط قسم کے یونانی فلسفہ کا گورکھ دھندا بنا رکھا تھا جو غیر معقول رد و جوں منجمد رسومات اور عقل و فطرت کے خلاف کھلے ہوئے متضاد خیالوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ صدیوں کے ادوار و انحطاط تنزل و پستی نے عوام کو لکاو، نکما، اپاہج بنا ڈالا تھا۔

امراء ملک، اور پیشوایان مذہب نے ملکر خوفناک سازش کر رکھی تھی جس کا مقصد آرام طلبی و تعیش کاری کے اسباب مہیا کرنے تھے۔

ظاہر ہے کہ جمہور رعایا کے حقوق فطری پر دست اندازی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ انکے خلاف ایک تحریک اٹھ کھڑی ہوئی اس کو پورے طور پر دبانے کی کوشش کی گئی لیکن کہاں تک وزنی پتھر رکھے جاتے آخر بغاوت کا سرچشمہ پھوٹ نکلا۔ ابتدا میں صورت حال کی اصلاح کے لئے ہلکا طریقہ یعنے اصلاح سے کام لیاگیا، لیکن کوشش کی ہر لہر جو اصلاح کے لئے اختیار کی جاتی برسر اقتدار طبقوں کی خود غرضی و جہالت کی چٹانوں سے ٹکرا کر رہجاتی بنا بریں اصلاح پسند رہنماؤں میں اصلاح کی بجائے انقلابی جوش سرایت کرگیا یہاں تک نہ صرف اصلاح طلب مسائل ہی تک تحریک کے حدود باقی رہے بلکہ اس پورے اجتماعی نظام اور اسکے ہر ہر شعبہ کے برخلاف بغاوت کا سیلاب پھوٹا جس میں امراء و پیشوایان ہی نہیں بہے بلکہ پوری تہذیب خس و خاشاک کی طرح بہہ گئی۔

ہر وہ نظریہ، ہر وہ مسئلہ، ہر وہ قول و عمل جو انسانی تہذیب میں رائج تھا اسکی مخالفت انقلاب پسندوں کا شکار بن گیا۔ مذہب کے روحانی مقاصد سے لیکر زندگی کے جزوی مسائل تک مخالفانہ نگاہوں کے آماجگاہ بنگئے

ان سخت جکڑ بندیوں کے ردعمل کے طور پر انفرادی آزادی شخصی آزادی پر اسقدر زور دیاگیا کہ اجتماعیت یا سوسائٹی کی کوئی حیثیت نہ رہی حریت رائے کا یہ بنیادی نقطہ در اصل سابقہ ظالمانہ سماج کے خلاف انتقامی جذبہ کے ماتحت تسلیم کیاگیا تھا چنانچہ اس انفرادی آزادی کے تخیل سے موجودہ سرمایہ داری کا نظام عالم وجود میں آیا اور اسنے ایک صدی میں اسقدر مفاسد پیدا کئے انقلاب فرانس کے بعد   افادیت پسندی و خود غرضی کے نظریات نے وہ مصائب کے پہاڑ توڑے اور انگلستان کے صنعتی انقلاب نے اسپر بڑھتی ہوئی آگ کو اسقدر ہوا دی کہ جماعتی زندگی ختم ہوکر رہ گئی۔ خاندان کی شیرازہ بندی بکھر کر رہ گئی فلسفہ رنگ و نسل عقیدہ قومیت و وطنیت نے تمام اہل عالم کو اپنے پیٹ میں لے لیا اور اخلاقیات کی دھجیاں بکھیر کر رکھدیں جس کے نتیجہ میں کمیونزم و فاشزم نے جنم لیا۔ جسنے شخصی آزادی کو جماعتی مفاد پر قربانی کرنے کا عمومی فیصلہ دیدیا۔ گویا ایک مصیبت کا علاج دوسری مصیبت سے کیاگیا۔ عالمگیر انسانیت کی تشنہ کامی ہنوز بدستور سابق موجود ہے!

جس چیز کی وہ پیاسی تھی اسکی پیاس ویسی ہی باقی ہے بہرحال کلیسائی دور میں خواہ مارٹن لوتھر کی مذہبی تحریک ہو یا نان زوک روسو کی انقلابی، یہ تمام تحریکات تہذیب مغربی کی اصلاحی کوششوں کی کڑیاں ہیں اب آیئے ہندوستانی تاریخ پر سرسری نظر ڈالئے تو آپ پر روشن ہو جائیگا کہ قدیم اقوام کی تاریخ چھوڑ کر آرین تہذیب کا تذکرہ تاریخ ہند کے اولین صفحات پر نظر آتا ہے۔ اس تہذیب کا واضح تصور ذاتوں کی تقسیم، فرائض شہریت کا عہدہ، آرین نسل کا مذہبی تفوق، انسانی زندگی کا چہار گانہ ادوار میں منقسم شہری زندگی میں مذہبیت (برہمنیت) کو طرۂ امتیاز قرار دیاگیا ہے برہمن پروہت مختار مطلق ہے۔ حکومت کا حق اسکو فطری و موروثی دیدیاگیا ہے کسب معیشت کے فرائض سے اس کی ہستی کو بلند و بالا قرار دیاگیا ہے۔ یہ کام کھتری کے سپرد کیاگیا ہے کہ وہ تجارتی و شہری فرائض کی سرانجام دہی میں مصروف رہے اور چھتری بحیثیت محافظ و نگہبان کے فوج اور پولیس کا کام دیں رہی ہندوستان کی قدیم قومیں انکو شودر (نیچ ذات) کا نام رکھکر تمام ذلیل اور گندے کام دیدئے ہیں۔

د ذاتوں کی اس تقسیم نے جہاں خون اور نسل رکھنے کی اچھی کوشش کی وہاں ہزار ہا بے گناہوں کو بہت سے بہترین مواقع سے

انسانوں کو صرف سودا شرا میں جھینکر کے انتہائی ناحق تلفی و انسانیت سوزی کا برتاؤ روا رکھا ہے۔ خاص کر شودر ذات کو اسفل السافلین پر پہنچنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے جہاں سے وہ آج تک نہ ابھر سکے اور انکی بے بسی و بیکسی کی کراہیں فضاؤں میں ابھی تک گونج رہی ہیں۔

چنانچہ اس غیر فطری تقسیم عمل کا ردعمل ہوا اور بہت شدید ہوا تھا گوتم بدھ کا نعرۂ حق پسندانہ پیام مساوات لیکر اس سرزمین نخوت آباد کبر و غرور پر برق خاطف بنکر چمکا جس نے آرین سماج کی غیر منصفانہ بلکہ ظالمانہ بندھنوں کو خاکستر بنا ڈالا اس اعتبار سے ہندوستانی معاشرہ کی اصلاح کا صور سب سے پہلے گوتم بدھ نے اس بلند آہنگی سے پھونکا کہ اس کی صدائے بازگشت ہندوستان سے نہیں تو برما چین و جاپان سے آجتک سنائی دے رہی ہے۔ اس تہذیب کی خوشنما یادگار خوش رنگ و پائیدار نقش و نگار کی آج بھی سانچی ٹوپ، اجنتا اور ایلورا کے در و دیوار کی سنگین شہادتیں بہم پہنچا رہی ہیں۔

دوسرا موقع ہندوستانی سماج کے انقلاب کا مسلمانوں کی آمد سے شروع ہوتا ہے مسلمانوں سے پہلے جتنی قومیں ہندوستان میں آئیں وہ یا تو فاتحانہ طور پر داخل ہوئیں اور چلی گئیں، یا اسقدر اقلیت میں رہیں کہ انکو ہندوستانی قوم میں بجز مدغم ہونیکے اور چارہ کار نہیں تھا لیکن مسلمان فاتح کی حیثیت سے آئے اور یہیں سکونت گزیں ہو گئے مسلمان اپنے ساتھ زندگی کا مستقل فلسفہ مکمل ضابطہ حیات بھی لائے جو فکری و عملی راہوں کو مکمل طور پر ہموار کر کے سامنے کھولتا ہے۔

ان دونوں تہذیبوں کے تصادم سے صدیوں کی کوششوں کے بعد ایک تیسری تہذیب عالم وجود میں آئی جسکو مغلئی تہذیب کہا جاسکتا ہے صدیوں کی کوشش اسلئے کہا گیا کہ کسی تہذیب کو بنتے ہوئے سینکڑوں برس لگ جاتے ہیں یہ انسان کی انفرادی زندگی نہیں ہے بلکہ لاکھوں انسانوں ہزاروں جماعتوں اور سینکڑوں گروہوں کی اجتماعی زندگی کا دستور و لائحہ عمل ہے۔ جسکے تعمیر میں سینکڑوں سال کا صرف ہوجانا کچھ بعید از قیاس نہیں اسلئے گو مسلمانوں کی حکومت کا آغاز آٹھویں صدی سے ہوجاتا ہے لیکن ہندوستانی تہذیب کو گنگا جمنی تہذیب بنانے میں صدیاں لگ گئیں یہی وجہ ہے کہ تہذیب کی تعمیر کا کام تدریجی سست رفتار سے ہوتا ہے لیکن تخریب بہت جلد اپنا قبضہ جما لیتی ہے۔

بنا بریں مغربی قوموں کے داخلہ کا سلسلہ گو سولھویں صدی سے شروع ہو جاتا ہے لیکن اصلی عمل دخل اٹھارویں صدی میں ہو سکا اور مستقل حکومت کی گتھی مغلیہ اقتدار کی ناکامی کی وجہ سے ان کے ہاتھوں پہونچی اس ایک ہی صدی میں ہندوستانی تہذیب کی تخریب بڑی تیزی کے ساتھ شروع ہو چکی ہے۔

ہندوستانی تہذیب کا یہ تیسرا تصادم ہے جو مغربی تہذیب سے پیش آرہا ہے۔ لیکن اس تصادم کی نوعیت پچھلی دونوں تحریکات سے جداگانہ ہے۔ وہ دونوں تصادم مقامی تھے کیونکہ خواہ بدھ مذہب کے پیرو ہوں یا اسلام کے نام لیوا ان دونوں جماعتوں نے ہندوستان ہی کو اپنا حقیقی و اصلی وطن بنا لیا تھا۔ دونوں کے بود و باش اختیار کرنے والے گروہ تھے اس لئے ان دونوں تحریکوں میں اثر اندازی و اثر پذیری کا معاملہ مساوی طور پر تھا۔ ان تحریکات نے جہاں ہندوستان کو اپنے نئے نظریات نئے فلسفۂ زندگی سے متاثر کیا وہاں بہت سے مسائل میں ہندوستانی تہذیب کو اپنایا بھی ہے مگر مغربی تہذیب کا یہ تصادم زبردست تصادم ہے جن افراد سے ہمیں واسطہ پڑتا ہے وہ نہ یہاں کا باشندہ بننے کا ارادہ رکھتے ہیں اور نہ یہاں کی تہذیب کو برقرار رکھنے کا۔

انگریز قوم گو سو دو سو برس سے ہندوستان میں آمد و رفت بلکہ عمل دخل رکھتی ہے لیکن اجنبی بنکر۔ بیگانہ وشی اختیار کر کے وضع قطع چال ڈھال، تراش خراش، معاشرت و معیشت خیالات و نظریات غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ میں ہندوستان کے لئے ویسے ہی اجنبی بنے ہوئے ہیں جیسے دو سو سال پہلے تھے۔

اس لئے اس تہذیب کی حیثیت فاتحانہ، بلکہ حاکمانہ ہے کہیں جھکاؤ نہیں کہیں بھی لچک نہیں۔

سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ مغربی تہذیب نے جن حالات میں جنم لیا ہے ان حالات نے ابتداءً تو کلیسا کیخلاف انتقامی جذبہ پیدا کیا لیکن اسکے بعد نفسِ مذہب ہی سے عداوت اور بغض کے جذبات ابھرتا کے اس تحریک انقلاب کو مذہب کی مخالف سمت میں لاڈالا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ مذہب کیخلاف آزاد خیالی کی جنگ سے ہی یہ تہذیب منظر عام آئی ہے۔ اس ردعمل نے اس تہذیب کو افراط و تفریط کی کشمکش میں پھنسا دیا ہے۔ تہذیب و تمدن کی وہ دو ستون ان پر جنپر اپنی عمارت قائم ہوتی ہے) فرد اور جماعت کا تعلق باہمی، اور عورت و مرد کے باہم

(بقیہ صفحہ ۱۰۰ پر)

سلمان الارشد فاروقی

مراحل

(”پیچ و خم“ کا ایک افسانہ)

جب وہ پیدا ہوئی تو اسے خالہ، ممانی، چچی، پھوپی اور اڑوس پڑوس کی عورتوں نے دیکھ کر ایسے منہ بنایا جیسے ان لوگوں پر اچانک کسی شدید ترین اعصابی بیماری کا حملہ ہو گیا ہو۔ ماں نے اپنے اس بگڑے ہوئے شاہکار کو دیکھ کر شرم سے چہرہ پر دوپٹہ ڈال لیا۔ باپ نے جب پہلی مرتبہ اپنی نورِ نظر و لختِ جگر کو دیکھا تو اس کے ذہن میں بدگمانیاں سی رینگنے لگیں۔ اسے ایسی بدشکل لڑکی کا باپ بنتے ہوئے کراہیت سی محسوس ہو رہی تھی البتہ وہ فرشتے ضرور مسکرا رہے تھے جن کو قدرت نے اس کی حفاظت پر مامور کر دیا تھا مگر ہو سکتا ہے کہ حقیقت کی ستم ظریفی پر مسکرا رہے ہوں۔ ماں باپ کی اس بے اتفاقی کے باوجود اس کا بھی نام رکھا گیا مگر بغیر کسی غور کے کیونکہ بدصورت لڑکی کے لئے کسی حسین نام کی جستجو مناسب نہیں تھی ویسے تو کلثوم اس کا صحیح نام تھا لیکن شکل و صورت کے اعتبار سے واؤ اور میم حذف کر کے ث کو لام سے تبدیل کر کے کلو اس کا گھریلو نام ہو گیا کیونکہ گھریلو نام رکھا جانا اسی قدر ضروری ہے جس قدر کہ سالن میں نمک ڈالنا ــــــ کلو کا ڈیل ڈول بالکل پہلوانوں کا تھا۔ اگر یہی ڈیل ڈول لڑکے کا ہوتا تو ماں باپ شاید یہ سوچ کر صبر کر لیتے کہ ممکن ہے ان کا لاڈلا کسی دن رستم زماں گاما کی جگہ حاصل کرے مگر لڑکی کے لئے رستم زماں ہونا تو درکنار رستم مکاں ہونا بھی ماں باپ کے لئے عذاب جان ہو جاتا ہے لیکن وہ اس بے ہنگم بے اتفاقی کے باوجود زندہ رہی کیونکہ وہ پیدا ہی زندہ رہنے کے لئے ہوئی تھی جبھی خسرہ، ہیضہ اور چیچک جیسے مہلک امراض سے ہنستی کھیلتی گذر گئی اس کے جسم میں یہ امراض ذرا بھی تغیر نہ کر سکے ــــــ اور ــــــ

عام طور پر جوانی میں تو عورتیں اور بھی خوبصورت ہو جاتی ہیں جبکہ شباب اس پر بدذوقی سے ... تھا قدرت شاید اس کے ساتھ فیاضی پر آمادہ تھی مگر قدرت بخیل ہوتی کب ہے اسی لئے تو قدرت نے اس کو بدصورتی عطا کرنے میں اپنی پوری فیاضی کا استعمال کیا تھا اگر قدرت ذرا بھی اس سلسلہ میں بخل کر دیتی تو پھر وہ گھر اور محلہ میں ہتھنی کے بجائے لڑکی ہی نہ کہلاتی۔

ہتھنی ہو یا لڑکی ــــ! بہر حال جوانی کی تشنگی دونوں محسوس کرتی ہیں۔ البتہ ہتھنی کے فطری تقاضوں کی تکمیل میں کوئی امر مانع نہیں ہوتا لیکن لڑکی کے لئے احساس جوانی کا اظہار بھی جرم ہے اور اس کی سزا ذہنوں کی شقاوت پر منحصر ہے۔

ــــــــ ... ــــــــ

اگر زندگی نام ہے اجتماعِ ضدین کا تو کلثوم کی بدصورتی کا نقاد مریم کی خوبصورتی تھی سگی چھوٹی بہن ہونے کے باوجود وہ اس قدر خوبصورت تھی کہ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ دونوں ایک ہی ماں باپ کی نشاط آفرینیوں کا ”خمیازہ“ ہیں۔

مریم خوبصورت ہونے کے باوجود ایک متوسط خاندان کی عام لڑکی تھی مگر کلثوم بدصورتی کے باوجود بڑی ذکی الحس دوشیزہ تھی گو یہ ذکاوتِ حس اس کی جوانی کے لئے ایک ایسا زہر تھی جس کا ابھی تریاق بھی تلاش نہ ہوا تھا چنانچہ وہ رات کو پلنگ پر لیٹ کر اکثر اس تصور سے لطف اندوز ہوا کرتی جو ایک دوشیزہ کا لطیف سہانا خواب کہلاتا ہے اور ایک صبح تک پڑی رہتی اپنے ہتھنی جیسے جسم کو دیکھ کر وہ لیکن آئینہ شناور تھی اور گھنٹوں آئینہ میں اپنی جاذبیت تلاش کیا کرتی۔ اس کے خد و خال باعثِ کشش نہ ہوتے تو کم از کم قابلِ نفریں بھی نہ ہوتے مگر اس کی آنکھ ناک دانت، رنگ کوئی چیز ڈھنگ کی نہیں تھی اور رہی سہی کسر چیچک کے داغوں نے پورا کر دیا تھا اس کے چہرے کی حالت ... کی سی تھی ...

علم کرتی تھی کی وجہ سے اونچے نیچے گڑھے پڑ گئے تھے اور یکایک اسے محسوس ہوتا جیسے کرو ہ جنگ کے زمانے کے کاریگروں کی بنائی ہوئی ہے جو صرف روپیہ بٹورنے کے لئے اوھوری باکس اور کمزور چیزیں بنایا کرتے تھے اور پھر رشوت دے کر اپنے مال کی کھپت کرا دیتے اور پھر وہ سوچنے لگتی کہ کیا اللہ میاں کے یہاں بھی رشوت کا بازار گرم ہے؟ ——

جو اس فیرو سواری کے ساتھ اس جیسے ڈھانچے اور نمونے ڈھال دئے جاتے ہیں۔

اور یہ سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ جاتی۔ خوابوں کے جزیروں میں اسے کبھی کبھی کوئی نوجوان اپنی طرف آتا دکھائی دیتا۔ وہ اسے دیکھ کر شرم سے سمٹ جاتی کیونکہ شرم و حیا عورت کا زیور ہے اور خدا کے گھر سے یہ زیور مساوی حیثیت سے ہر لڑکی کو ملتا ہے بلا لحاظ مذہب و ملت، کالی گوری، لنگڑی لولی، اندھی بہری، کانی کھتری اور گونگی کی وہاں کوئی تخصیص نہیں ہوتی ہے —— اور پھر یہ نوجوان بڑھتے بڑھتے اس کے بالکل قریب آکر بیباکی سے اس سے لپٹ جاتا اور معلوم نہیں کیا! —— اس کی سمجھ میں ٹھیک سے نہیں آتا کیونکہ اس سے زیادہ اس نے کتابوں میں بھی نہیں پڑھا تھا البتہ بھائی کی ننگی تصویروں والی کتاب جو وہ اپنی اسکول کی انگریزی کی کتاب کے نیچے رکھ کر اکثر دیکھا کرتا تھا اس نے بھی دور سے دیکھی تھی اور ایک دفعہ چرا کر وہ اسے غسلخانہ میں لے بھی گئی تھی مگر ڈر کی وجہ سے وہ اسے پوری طرح نہیں دیکھ سکی اور اسی لئے ان تصویروں کے نقوش اس کے ذہن میں مرتسم نہیں ہو سکے تھے تو وہ نوجوان کی اس پر اسرار ہم آغوشی کی لذت محسوس نہیں کر سکتی تھی مگر پھر بھی یہ مس جسمانی اس کے لئے ایک کیف مکمل تھا اور کیف کے اس نقطہ عروج پر یکایک اس کی آنکھ کھل جاتی اس وقت اس کا دل پنکھے کی طرح چلتا ہوتا اور اعصاب میں ایک خاص قسم کی اینٹھن جیسے ——

اس کے پاس الفاظ ہی نہیں تھے کہ وہ اعصاب کی اس پر کیف اینٹھن کو بیان کر سکتی۔

جوانی کے اس مرحلہ پر دن رات ایسی ہی خوشگوار اینٹھن اپنے جلو میں لئے ہوئے گذرتے چلے جا رہے تھے۔ فطری تقاضے تقاضے پر تقاضے کئے جا رہے تھے مگر کلثوم یہ آواز اپنے ماں باپ تک اس لئے نہیں پہنچا سکتی تھی کہ ماں باپ کی سرگوشیوں کا یہ راز اس تک پہونچ چکا تھا کہ:۔

آخر اس لڑکی کا حشر کیا ہوگا!

کیا اس کی وجہ سے مریم بیٹھی رہ گئی؟ اور ماں کی بیکسانہ تائید کے یہ جملے کہ۔

”کلثوم کی قسمت میں بر نہیں ہے۔“

اس کے پندار پر ایسی کاری ضربیں تھے کہ وہ تلملا اٹھتی اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ ماں باپ کے بیچ جا کر ان نوجوانوں کو للکار کر کہہ دے ...

میں سے کون ایسا بہادر ہے جو مجھ جیسی بدصورت لڑکی سے شادی کے لئے آمادہ ہے میرے پاس کان ناک آنکھ دانت زبان ہونٹ سب کچھ ہیں میری قلندی قابل رشک ہے میرے خد و خال میں حسن تلاش نہ کرو میرے اعضا کی موزونیت پر غور کرنے کی زحمت ذرا اٹھاؤ میں لاکھوں خوبصورت لڑکیوں سے بہتر ثابت ہونگی کیونکہ میرے پاس محبت کرنے والا دل ہے میں جس قدر تن کی گندی ہوں اسی قدر من کی اجلی ہوں۔ بولو۔ جلدی بولو۔ مجھے کون قبول کرتا ہے میں اس کے گھر کو جنت بنا دوں گی میں اس کی اس قدر خدمت کروں گی جتنی کہ آج تک کسی عورت نے نہیں کی —— اچانک مکھیوں کی بھنبھناہٹ نقی کی آواز بن کر اس کے لاشعور میں گونجنے لگتی اور وہ جھنجلا کر اپنے سارے جسم کو اس زور سے دباتی کہ خود اسے کپکپی آ جاتی اور یہ کپکپی اسے اپنے خوابوں والے کیف کی تمہید معلوم ہونے لگتی۔

مریم کا رشتہ کلثوم کو نظر انداز کر کے آخر کر ہی دیا گیا جس وقت مریم کی ہونے والی نندوں نے مریم کو سونے کی انگوٹھی پہنا کر اس کے سر پر ریشمی بنارسی زرق برق دوپٹہ ڈالا تو کلثوم کو محسوس ہوا کہ جیسے اس کی نسائیت کی دھجیاں دھجیاں زمین کرنے کے لئے اس رسم کی تکمیل کی گئی ہے صرف ایک وجہ سے کہ اس کے رخسار کشمیری سیبوں کو شرمانے سے معذور تھے اس کی آنکھوں میں شراب کشید ہونا ناممکن تھی اس کا سیاہ رنگ ہزاروں دواؤں کے استعمال کے باوجود چمپئی رنگت سے مبدل نہیں ہو سکتا تھا اور اس لئے اس منظر سے اس کے دل پر گھونسہ لگا مگر ایک ہندوستانی لڑکی کی طرح اس کا فرض تھا کہ وہ خاموش رہے خواہ اس کی جوانی کو دیمک ہی کیوں نہ چاٹ ڈالے۔

اس تحقیر کے کچھ ہی دن بعد مریم اس کو جوانی کی آگ میں سلگتا چھوڑ کر اس کے خوابوں والے نوجوانوں میں سے ایک نوجوان کے ساتھ چلی گئی ان مراحل سے گذرنے کے لئے جو کلثوم کی آنکھوں اور ذہن میں مریم کے ہاتھوں کی مہندی سے زیادہ شوخ رنگ میں رچے ہوئے تھے مریم کے جانے کے بعد کلثوم اور بھی بے تاب ہو گئی وہ اپنی مضطرب جوانی کو کچل دینا چاہتی تھی اس کے اعضا روندے جانے کے لئے بیتاب تھے اس کا دل کسی چوڑے سینے سے ہم آغوشی کے لئے بیتاب تھا مگر ایسے جسم کو کوئی کیا تو اپنی آغوش میں سمیٹنے کو آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔ کاش وہ ہتھنی ہی ہوتی! —— اور پھر وہ خود اپنے اس مضحکہ خیز خیال پر مسکرا دیتی مگر یہ مسکراہٹ بے معنی ... اس الجھے ہوئے معمے کا حل تلاش کرنے سے قاصر تھی۔ سوچتے سوچتے وہ تھک کر بہشتی زیور پڑھنے لگتی مگر اس سے بھی اس کی ... نہیں ہوتی ... الخیری کی جو وہ چار کتابیں ہمیشہ اس کے سرہانے رکھی رہتی تھیں

اب تو ان میں کبھی اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ وہ سوچتی کیا اسے کوئی نہ ملا، لنگڑا لولا بھی قبول نہیں کر سکتا مگر خود اس کے ماں باپ ایسے نوجوان کو قبول ہی کیوں کرنے لگے کیونکہ ماں باپ تو لڑکی کے لیے ہمیشہ فرشتوں جیسے لڑکے کی تلاش کرتے ہیں اپنی لڑکی کے معائب سے بے نیاز ہو کر محاسن کی تلاش میں وہ یہ اندھا دوڑنا ان کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے حالانکہ اس تلاش میں ان کو کیا نوے فیصدی ناکامی ہوتی ہے مگر اس ناکامی کو "لڑکی کی قسمت" کہہ کر یہ لوگ اپنے دل کو مطمئن کر لیا کرتے ہیں۔

کلثوم نے کتابوں میں پڑھا تھا اور محلہ کی عورتوں سے بھی سنا تھا کہ قابل شادی جوان لڑکی کی ماں کو ہسٹیریا اور باپ کو اختلاج قلب کے دورے اس وقت تک پڑتے رہتے ہیں جب تک کہ اس لڑکی کا ہاتھ کسی دوسرے ہاتھ میں نہ دے دیا جائے مگر اس کے ماں باپ کو ہسٹیریا اور اختلاج قلب کے دوروں سے ذرا سی لگاؤ نہ تھا۔ شاید اس کی جوانی اختلاج قلب اور ہسٹیریا کے دوروں کی مرہون منت نہیں ہونا چاہتی تھی۔

ایک ہی سال بعد مریم ان تمام خرابیوں والے مراحل سے گذر کر نسل انسانی میں اضافہ کرنے کے لیے گھر واپس آ گئی۔ مریم کی ناز برداریاں ہوتی دیکھ کر کلثوم کا دل جاہتا تھا کہ مریم کے یہاں اس سے زیادہ بدصورت کالی کلوٹی، لولی لنگڑی اور کانی بہری لڑکی پیدا ہو تاکہ وہ اپنی اس بدصورت لڑکی کو دیکھ کر اپنی مسکراتی ہوئی نظریں نیچی کرنے پر مجبور ہو جائے اور وہ اس کی اس فاتحانہ نگاہ سے محفوظ ہو جائے جو اس کے قلب کو برمے کی طرح چھیدتی چلی جا رہی تھی۔

درد خواہ کسی قسم کا ہو بڑا اذیت کوش ہوتا ہے اور پھر موت و زیست کے درد میں تو اذیت اپنے پورے شباب پر ہوتی ہے لیکن جب کلثوم نے اپنی ماں کو مریم سے یہ کہتے سنا کہ۔

"بیٹی ہراساں نہ ہو اللہ پر بھروسہ رکھو اور اس موقعہ پر اپنی بہن کے لیے دعا کرو کہ خدا اس کے نصیب کو بلند کرے"

اور جب مریم نے دودھ نما مسکراتے ہوئے آہوں کا قدرے مسکیولین کے درمیان خدا سے یہ کہا کہ "اے اللہ میاں اپنے حبیب پاک کے صدقے میں کلثوم آپا کی شادی کرا دے ان کا جوڑا غیب سے ملے" تو اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

اور اس نے مریم کی فاتحانہ نگاہوں سے خالی الذہن ہو کر اپنی ملتجی نظریں آسمان کی طرف اٹھا کر آنکھوں ہی آنکھوں میں خالق کون و مکاں سے کہا کہ جس قدر فیاضی سے تو نے مجھے صورت عطا کی ہے اتنی ہی فیاضی سے تو مریم کے بدصورت بچے کو خوبصورتی عطا کر اس کی دعا فورا آپ کا قبول کر لی گئی کیونکہ چند منٹ بعد اس کی ماں نے بچے کو

بھانجی کی پیدائش پر مبارکباد دی۔۔۔

—— سال بھر بیت گیا کہ مریم سرخ والیوں والے جوڑے میں چلی گئی مگر مریم کی دعا بھی شاید عرش تک پہنچ گئی تھی کیونکہ دوسرے سال ہی کلثوم کے لیے ایک پیام آیا۔ شاید یہ پیام غیب سے آیا تھا کلثوم کو پہلے پہل تو اس کا یقین نہیں آتا تھا مگر یہ شک اس وقت یقین سے بدل گیا جب اس کے باپ نے یہ کہہ کر پیام مسترد کر دیا کہ "میں فقیر ہوں اور شادی کو لڑکی دے کر اس کی زندگی تباہ نہیں کرنا چاہتا۔" کلثوم کو یہ انکار ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے گلے میں کسی نے رسی کا پھندا ڈال کر اسے کسی اندھیرے کنویں میں سسک سسک کر مرنے کے لیے لٹکا دیا ہو ——!

کلثوم جب ہر طرف سے مایوس ہو گئی تو اس نے خود ہی جینا ہو سکنے کے لیے خود سکون کی تلاش شروع کر دی۔ قدرت نے ہندوستان کے ہر نوجوان کے خمیر میں عشق کے اجزاء بے پناہ اس کی آمیزش بڑی فیاضی سے کی ہے تعلیم یافتہ جاہل کالے گورے کانے مکتر سب ہی کو یہ صلاحیت ہمہ وقت موجود رہتی ہے یہاں تک کہ ہر نوجوان عشق کا امتیازی تمغہ حاصل کرنے کے لیے ہندوستانی ونجی کے حصول و کٹوریہ کراس سے کہیں زیادہ بے تاب ہے اور اس کی بیتابی کی وجہ سے کسی محبوبہ کا کوئی خاص معیار مقرر نہیں ہو سکتا ہے۔ ان کو تو عشق کرنے کے لیے ایک دوشیزہ کی ضرورت ہوتی ہے کالی، گوری، معقول، غیر معقول کی تخصیص سے بے نیاز ہو کر خواہ وہ بھی یا پتھر ہی کی بنی ہوئی کیوں نہ ہو۔ مگر وہ دوشیزہ جو چلمن کے پیچھے یا دروازہ کی اوٹ میں سے سرخ، نیلے، کالے و پیلے دوپٹوں سے اپنی جوانی چھپاتے ہوئے کبھی کبھی ان کو دیکھ لیا کرے اور یہ تاک جھانک ہی ان کی معراج عشق ہے ——

چنانچہ کلثوم نے بھی اپنے گھر سے لگے ہوئے دو منزلہ مکان میں رہنے والے نوجوان کو اپنا مرکز نظر منتخب کر لیا بغیر کچھ سوچے سمجھے ہوئے کیونکہ عشق میں سوچنے اور سمجھنے کی زحمت کی ضرورت نہیں۔ محبت کی معصوم نادانی میں خرد کی ہوشمندی کا گذر کیسے ممکن ہے کیونکہ اب یہ خیال بھی توہین عشق کے مترادف ہے۔

اس تاک جھانک نے بالاخانہ والے نوجوان کے سوئے ہوئے احساس عشق کو بیدار کر دیا۔ دور کے اشاروں کنایوں نے نامہ و پیام تک وسعت حاصل کر لی دھندلکوں میں نظر آنے والی بدصورتی حسن بن کر میٹھے میٹھے خوابوں میں نمودار ہونے لگی۔ شرف باریابی کی گمنام استدعا نے کلثوم کو خدا اپنی نظروں میں حسین بنا دیا اور آخر —— ایک دن دو دھڑکتے ہوئے دل ایک دوسرے کے تاریک زینے میں مل گئے۔ آنکھیں کلثوم کی شکل تاریکی میں ...

ـــــ شباب کی مست اداؤں اور خوشبو سے نوجوان کا دماغ معطر ہو گیا ـــــ

اور کچھ ہی دن کی ان گہرائی بھری ہوئی ملاقاتوں نے کلثوم کے رخساروں اور لبوں سے جمالیاتی لذتوں کا بھی پتہ پوچھ لیا گستاخ ہاتھوں نے مرمریں حصوں کو ٹٹول کر خوابیدہ اور الجھی ہوئی پرکیف زندگی کی اصل حلاوت کلثوم سے بیان کر دی ۔اس کی مکمل تشریح اس لئے نہیں کی جا سکی کہ زینہ اس کے لئے موزوں نہیں تھا دوسرے کلثوم بھی آپ سے آگے ایک قدم آگے بڑھانے کو آمادہ نہیں تھی۔ گو وہ اس انٹیمن سے جی بھر کر لطف اندوز ہونا چاہتی تھی مگر اس کے نتیجے سے گھبراتی اور بہا ہوا طریقہ کار پسند تھا اسی لئے اس نے شرمانے اور لجاتے ہوئے لہجہ میں اس نوجوان سے کہہ دیا کہ وہ باضابطہ حاصل کر کے اس کی شرح بیان کرے مگر وہ نوجوان کہ اس جواب سے چکرا گیا کہ ـــــ

"اس کے بیوی بچے پہلے سے موجود ہیں"

ـــــ چند دن تک زینہ کی تاریکیاں ان الجھی اور میٹھی ملاقاتوں سے محروم رہیں لیکن ایک دن کلثوم نے اپنی زندگی کے سب سے فیصلہ کن ڈرامہ کا افتتاح اسی زینہ میں کر دیا۔ وہ اس نوجوان سے گھل گھل کر باتیں کر رہی تھی اس کی آغوش میں لپٹ لپٹ کر سمٹے رہی تھی اور نوجوان کے ہر مرتبہ یہ کہنے پر کہ "تمہارے والد کے آنے کا وقت ہو گیا" وہ اس کے گلے میں اپنی باہیں حائل کر کے اسے اپنی طرف کھینچ لیتی۔ آج وہ بچے باپ کی آمد سے بے نیاز ہو کر وہ سب کچھ جان لینا چاہتی تھی جس کے جاننے کی اس نے کبھی کوشش نہیں کی تھی مگر نوجوان اسے اس وقت یہ سب کچھ بتانے سے معذور تھا کیونکہ کلثوم کا باپ اس کے لئے بڑی حد تک خوفناک تھا وہ اس کی ماں سے بالکل نہیں ڈرتا تھا لیکن باپ کے نام سے اسے جھرجھری آ جاتی تھی کیونکہ باپ عام طور پر خوفناک ہوا کرتے ہیں۔

خوفناک ـــــ جوتے ، لاتیں ، گھونسے ، ہونٹڈے تلوار ، بندوق یہ سب مل کر اس کے ذہن میں تیزی سے گھومنے لگے۔ کلثوم کا لمس جمالی بھی اس خوفناکی کو کم نہ کر سکا ـــــ اور کیا یک نیچے زینہ میں جوتوں کی چرچراہٹ سنائی دی وہ گھبرا گیا اور اس سراسیمگی کی حالت میں کہا۔

"اب"

کلثوم نے لاپرواہی سے غسلخانہ کی طرف اشارہ کر دیا۔ نوجوان تیزی سے غسلخانہ میں غائب ہو گیا۔ مگر جوتوں کی چرچراہٹ نے زینہ میں کچھ سرسراہٹ سی پیدا کی تھی اور ذہن میں کئی برس پہلے کی سی ہڑبڑاہٹوں نے رینگنا شروع کر دیا

تھا اس نے کلثوم کو بے موقعہ رات کے گیارہ بجے زینہ میں موجود دیکھ کر اسے پوچھنا ہی چاہا کہ آخر وہ یہاں کیا کر رہی تھی!

"کچھ نہیں" کیونکہ اس کے علاوہ اس کے پاس جواب ہی کیا ہو سکتا تھا اور تاریخ کی روشنی ادھر ادھر پھینکے گا وجود یکہ وہ کچھ نہ جان سکا ـــــ مگر یکایک سامنے غسلخانہ میں کسی کپڑے کے ارتعاش نے کلثوم کے اس کام کے بارے میں اسے سب کچھ بتلا دیا جو وہ زینہ میں کھڑی ہوئی انجام دے رہی تھی ـــــ

حمیت کے خرمن پر برق کوند گئی! سب کچھ جل گیا پرانے وقتوں کی عزت باپ دادا کی بڑی محنت سے کمائی ہوئی عزت! ـ جس پر اسے ناز تھا۔ روپیہ پیسہ تو اس کے باپ دادا کے پاس تھا ہی نہیں اور ہوتا بھی کہاں سے کیونکہ جس قدر روپیہ خانگی ضروریات کے بعد بچتا تھا اس سے عزت جمع کی گئی تھی جو اسے وراثت میں ملی تھی جس پر وہ فخر کیا کرتا تھا جس میں وہ برابر اضافہ کئے جا رہا تھا تاکہ مرنے کے بعد وہ اپنی اولاد کے لئے اس سے کہیں زیادہ عزت چھوڑ جائے جو اسے اپنے باپ دادا سے ورثہ میں ملی تھی کنٹرول نہ ہونے کی وجہ سے وہ اسے بلیک مارکٹ سے منہ مانگے داموں پر خرید رہا تھا۔ یتیم خانہ کا چندہ، بھوکے بنگال کی امداد، جنگی قرضے، نیشنل ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ ، مستورات فنڈ اس کی رائے میں یہ بلیک مارکیٹ نہیں تو اور کیا تھے۔

عزت ایک مستقل اور دیرپا دولت تھی اسے کوئی گورنمنٹ کیمونسٹ اور سکوں کی طرح منسوخ نہیں کر سکتی تھی۔ مگر آج اس کی دولت لٹ گئی تھی جو کوئی گورنمنٹ نہیں کر سکتی تھی وہ کلثوم نے کر دیا تھا ـــــ اور پھر اس نے اس لڑکے کو غسلخانہ سے نکال لیا اس کا دل اسے مجبور کر رہا تھا کہ وہ کلثوم اور اس نوجوان کو قتل کر دے اور ان دونوں کے سروں کو جسم سے جدا کر کے گیند کی طرح ان میں ٹھوکریں لگائے اور پھر اپنے بھی گولی مار لے! ـــــ بے عزتی کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے مگر پھر اسے خیال آیا کہ اس کے اس اقدام سے اس کی رہی سہی عزت اخباروں میں جذب ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی مگر وہ اس رہی سہی عزت کو برقرار رکھنا چاہتا تھا اور ابھی اس کی عزت تو اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ اس کے گھر کے باہر جلوہ گر تھی۔ مگر یہ قتل اس رعنائی کو بدنمائی سے بدل دیں گے اس کا خاندان اس کی لڑکی سے زیادہ بدشکل اور مکروہ صورت میں تبدیل ہو جائے گا جس کے لئے مریم کی خوبصورتی بھی کچھ نہ کر سکے گی ـــــ اور پھر اسے رہ رہ کر نوجوان کی بدذوقی پر غصہ آنے لگا۔ اس نے جھنجھلا کر اس سے پوچھا تو اس سے شادی کے لئے آمادہ ہے؟ اور نوجوان نے جھنجھلا کر

کے حسن کو روشنی میں بے نقاب دیکھا تو اسے خود اپنی بزدلی کا احساس ہوا اور اسی لئے "ہاں" کرنا اس کے لئے ناممکن ہو گیا — — —

نہ جانے کیوں ایک دم سے کلثوم کو محسوس ہوا کہ جیسے ہزاروں ریل کے انجن اس کے دماغ کے اندر گھس کر سیٹیاں بجا رہے ہیں۔ اس کا ذہن سیٹیوں کی ان گنت آوازوں سے پھٹنے لگا۔ اور اس کی جنسی بھوک بھاپ کی طرح مقید ہو کر اسے تیزی سے دوڑنے کے لئے مجبور کرنے لگی۔ بغیر جانے بوجھے منزل کا تصور کئے بغیر — نہ جانے کہاں! اس کے لاشعور میں ہزاروں کسبیاں وحشیانہ طریقہ سے ناچنے لگیں جن کے بدن پر کوئی کپڑا نہیں تھا۔ اور پھر ایک ایک باقی جو بیاں اپنے پیرہن کی پھٹی ہوئی دھجیاں لے کر قہقہے لگاتی اس کی طرف لپکیں شاید اخلاقیات کی روحانی زنجیروں میں جکڑنے کے لئے اور اس کے جسم کے قریب آکر یہ سب دھجیاں زہریلے سیاہ سانپوں میں تبدیل ہو گئیں جو اسے ڈسنے کے لئے بے تاب تھے — — — اس خوفناک منظر کو دیکھ کر اس نے ایک چیخ ماری اور کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین پر گر کر بے ہوش ہو گئی —

— — — اور صبح ڈاکٹر مریضہ کو دیکھنے کے بعد کلثوم کے باپ سے کہہ رہا تھا۔

"ہسٹریا کی ابتدا ہے اور اس کا واحد علاج صرف یہ ہے کہ لڑکی کی جلد از جلد شادی کر دی جائے۔ خون میں حدت پیدا ہو چکی ہے"۔

ڈاکٹر کی یہ بات سن کر غیر ارادی طور پر کلثوم کے باپ کی نظریں سامنے والے بالاخانے پر گر گئیں۔ مگر بالاخانہ کی وہ کھڑکیاں جو ہمیشہ کھلی رہتی تھیں۔ آج ان کے دروازے بند تھے اور بالاخانہ پر موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

(انجمن ترقی پسند مصنفین بھوپال میں پڑھا گیا)

(تمدنی بحران صفحہ ۶۵ کا بقیہ)

رشتہ — اور اس کے مناسب حدود ہیں۔ کلیسائی دور میں فرد کے حقوق کو مطلق غصب کر لیا گیا تھا اسی طرح عورت کے حقوق کا سلسلہ بری طرح دست اندازی کی تھی۔ اس تہذیب نے اس تفریط کا جواب افراط سے دیا جس کے نتیجہ میں اس تہذیب کی پوری تاریخ مہیب و ہولناک استعمار پسند لڑائیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس نصف صدی میں جنگ عظیم کا واقعہ کچھ کم انسانیت سوز نہ تھا کہ اس جنگ عالمگیر نے قوموں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی — اور سب سے زیادہ مظلوم و محکوم اقوام تباہی و بربادی اور ہلاکت سامانی کا شکار ہوئی ہیں۔ ہمارے لئے یہ مختصر واقعہ کچھ عبرت انگیز نہ ہونا چاہیئے کہا جاتا ہے کہ اتحادی اقوام کے اس جنگ میں ۱۲ لاکھ سپاہی کام آئے جنہوں نے دنیا کو نازیت و فسطائیت کی لعنت سے بچا کر عالمگیر فتح حاصل کی لیکن محکوم غلام ہندوستان کے دس سے بیس لاکھ تک (سرکاری اعداد و شمار اور غیر سرکاری تعداد) ۳۵ لاکھ افراد نے قحط بنگال میں دم دیدیا لیکن انکا کوئی پرساں حال نہیں بہرحال کسی تہذیب کا بہت جلد جلد لڑائیوں کی مصیبتوں میں مبتلا ہونا، لاکھوں افراد کا بیکار اور نکما کر دینا، سینکڑوں قوموں کا غلامی و محکومی کی لعنتوں میں گرفتار رہ جانا — یقیناً اسی تمدن کی ناپائیدار ہونے اور شاخ نازک پر آشیانہ بنانے کی خبر دے رہا ہے۔

اس لحاظ سے مشرق سے اس تہذیب کا تصادم حقیقی تصادم ہے مشرق کی روحانیت سے تصادم ہے۔ وہی مشرق جو ہمیشہ سے مذہب روحانیت کا گہوارہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ جو ہمیشہ بنی نوع انسان کو گمراہیوں کی وادیوں سے نکال کر زندگی کے شاہراہ دکھاتا رہا ہے۔ جو عالم انسانیت کی تاریکیوں کو دور کر کے ہمیشہ روشنی قلب و ضمیر کا سامان بہم پہونچاتا رہا ہے۔

اگر شاعرانہ زبان میں مغربی تہذیب انسانیت کا جسم ہے تو مشرق یقیناً انسانیت کی روح ہے۔ ضرورت ہے کہ مشرق کی روح درخشاں مغرب کے کالبد تاریک کو روشن و منور کرے یہ ضروری ہے کہ یہاں کی روشنی بصورت شرر چمک چمک کر مدہم پڑ چکی ہے لیکن اہل مشرق میں طلوع ہونیکی صلاحیت موجود ہے اہل مشرق کے برعمل ہی کی تاریخ منتظر ہے

قمر جمالی

مرکز!

'انقلاب زندہ باد'

سلیم بھائی فوجی انداز میں سلوٹ کر رہے تھے۔

'انقلاب زندہ باد' احمریں آپا مسکرا دیں' اف ان کی مسکراہٹ کس قدر رنگین تھی۔ کیسی شیریں' کتنی پُرفن۔ شاید زندگی میں پہلی بار میں نے ان کی آنکھوں میں ایسی چمک دیکھی تھی ایسی کہ پپوٹے بھی شرمائیں سلیم بھائی کو دیکھتے ہی جانے کیوں ان کی ساری تلخیوں سے معمور سنجیدگی آن واحد میں نیست ونابود ہو گئی۔ اور اس کے بجائے ہلکی ہلکی مشفقی تمتماہٹ ان کے زرد زرد رخساروں سے پھوٹ پڑی۔ ایک ایسی بے پایاں شگفتگی کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ابھی ابھی وہ شفیق الرحمٰن کا کوئی دلچسپ افسانہ پڑھ کر اٹھی ہوں۔ تو یہ بات تھی۔ میں نے سوچا۔ انقلاب زندہ باد؟ مگر مجھے خیال تمام تر ذمہ داریوں کا بوجھ صرف انہی کے کمزور کاندھوں پر ہے' جب دیکھو مطالعہ میں مستغرق' ہمیشہ کتاب ہاتھ میں' نگاہیں ورق پر۔ اور باتیں کر رہی ہیں۔ کھانا میز پر چنا ہوا ہے۔ آپ ہیں کہ بس ابھی آئی۔ بس آئی۔ ذرا یہ صفحہ ختم کر لوں۔ یا اللہ یہ کتب بینی۔ ' امی چڑ کر بد دعائیں مگر ابا حضور کہتے 'تو کیا ہوا۔ ۔ ۔ آ لی بیٹے ابھی' اور خواہ مخواہ مجھے ان دنوں ابا حضور پر غصہ آنے لگتا'۔۔۔ ہاں ہم بچے ہی کام میں ذرا دیر کر دیں تو 'فرحت تم بہت کام چور ہوتے جا رہے ہو۔ اور رجو تم بہت سست ہو گئی ہو' اور احمریں آپا خواہ کچھ بھی کریں' کھانا کھائیں یا نہ کھائیں' کسی سے بات کریں یا نہیں' کسی کام میں ان کے ہاتھ تیز چلیں یا دھیرے بہرحال ابا حضور کی نظر میں ان کا ہر فعل مستحسن۔ ان کا ہر کام بہت خوب بہترین وہ دن بھر لائبریری میں گھسی طرح طرح کی کتابیں دیکھتی رہیں۔ گھنٹوں قلم چلاتی رہیں۔ طرح طرح کے بیکار مضمون لکھتی رہیں۔ وقت کو فضول برباد کرتی رہیں۔ لیکن خدا جانے کیوں ابا کو ان سے اتنی محبت تھی کہ ہمیشہ احمریں آپا کی تعریف وتوصیف سے انہیں ایک طرح کی روحانی مسرت ہوتی تھی۔ میری بیٹا احمریں اتنی سنجیدہ ہے ایسی بلند ذوق ہے۔ یہ ہے وہ ہے۔ اس کا مستقبل یوں شاندار ہوگا۔ یوں دنیا کے بڑے آدمیوں میں گنی جائیگی۔ ملک وقوم کے لئے وہ جو کچھ کر رہی ہے اس کا جواب نہیں۔ کوئی جواب دیتا تو ڈانٹ پڑتی۔ لیکن مجھے خواہ مخواہ ابا حضور کی زبان سے احمریں آپا کے لئے تعریفی الفاظ سن کر ایک طرح کی شدید روحانی تکلیف ہوتی۔ اور مری طبیعت چاہتی کہ بچوں کی طرح روؤں خوب گلا پھاڑ پھاڑ کر' اور چیخ چیخ کر کہوں احمریں آپا کی تعریف مت کرو۔ مت کرو۔ مجھے ان سے نفرت ہے۔ ان کے نام سے نفرت ہے۔ ان کے کام سے نفرت ہے۔ وہ انسان نہیں۔ کتابوں کا کیڑہ ہیں۔ بچاری ہیں۔ کڑبن ہیں۔ بارہا میں نے احمریں آپا کی حکم عدولی کی۔ تاکہ وہ چھوٹا سمجھ کر مجھ پر خفا ہوں۔ مجھ سے تلخ لہجہ میں گفتگو کریں۔ اور میں روٹھ کر پورے گھر بھر کو سر پر اٹھا لوں تاکہ امی جان ان پر خفا ہوں۔ اور مجھے مزا آئے' لیکن یہ غیر معروف سا جذبۂ انتقام کبھی بھی شرمندۂ تکمیل نہیں ہوا میں ہمیشہ ناکام رہا۔ ہر قسم کی بدتمیزی پر ہمیشہ احمریں آپا نے پیار سے شیریں لہجہ میں بزرگوں کی طرح نہیں۔ بلکہ بچوں کی طرح مجھے سمجھایا۔ خیر۔ رجی میری ننھی منی بہن جاؤ تم ہی اٹھا لاؤ وہ کتاب' دیکھیں تو کوئی کیا کرتا ہے تمہارا۔ اور میں ایسا محسوس کرتا جیسے وہ مجھے چڑا رہی ہوں میں غصہ سے لال پیلا ہو کر رجی کو بھی ڈانٹ دیتا۔ خبردار جو گئی۔ ٹانگ توڑ ڈالوں گا۔ غریب رجی دہیں سہم کر رہ جاتی۔ مگر پھر بھی احمریں آپا کی تیوریوں پر بل نہیں پڑتے ان کے بشرے سے غم وغصہ یا ناگواری کے آثار کا ذرا بھی اظہار نہیں ہوتا۔ وہ خود ہی کتاب لیئے چلی جاتیں۔ اور احساس شکست کی ایک تیز وتند

ہونٹوں کے کناروں پر کانپتی ہوئی سیدھی سیدھی لازوال مسکراہٹ۔ متین دلفریب..... لیکن اچانک یہ لازوال اور متین مسکراہٹ ہونٹوں کے سنگم سے ٹوٹ کر جانے کون سی بے نام و نشان ظلمتوں میں کھو گئی۔ اس کے بجائے ان کے بشرے سے ایک تلخ اور ناقابل برداشت بے نیازی ابل پڑی۔ جیسے کہ ان کے شعور اور لاشعور کے درمیان کوئی شدید جنگ ہو رہی ہو اور ذہن کے ہر گوشے میں ویرانی۔ بدحالی انتشار اور شکستگی کے سوا کچھ بھی نہ ہو کچھ بھی نہیں۔ زہر ملا دھواں' ہلاکت آفریں دھند...

اب ہر وقت احمریں آپا کھوئی کھوئی ڈری ڈری سی رہنے لگیں اکثر کتاب پڑھتے پڑھتے ان کے حلق سے ایک گہری سانس نکل پڑتی۔ وہ کتاب رکھ کر سر تھام لیتیں یا دور افق بعید میں کسی عنقا سی چیز کے تجسس میں کھو جاتیں۔ پھر آپ ہی آپ خواب سے بیدار ہو کر سنہری کمانیوں والا چشمہ ٹھیک کرتیں اور اپنے اردگرد یونہی سی پھسلتی ہوئی نگاہ ڈال کر از سر نو مطالعہ میں محو ہو جاتیں۔ مجھے جانے کیوں ان کے اس کھوئے ہوئے پن سے دہشت سی ہونے لگی۔ دل ہی دل میں ایک مبہم سا خدشہ بھڑکنے لگا۔ ان کو ہر وقت غمگین اور اداس دیکھ کر میری اپنی دلی خواہش کے برخلاف خوشی کے بجائے ایک طرح ناقابل فہم الجھن ہونے لگی۔ اور طبیعت چاہتی کہ کچھ کر ڈالوں۔ مگر کیا..... ؟ یہ میں خود نہیں جانتا تھا کہ کیا ..... اللہ' یہ احمریں آپا' کیوں اس بیدردی سے میرے احساس کا مرکز بنی ہوئی ہیں۔؟ میں کبھی کبھی تنہائیوں میں یا اسکول کے کسی خالی گھنٹہ میں میز پہ گال رکھ کر سوچتا۔ اور میرے دل کی گہرائیوں میں چھپا ہوا ایک بھائی بیدار ہو کر کہتا میری آپا۔ پیاری آپا۔ اچھی آپا بتاؤ نا آخر یہ تمہیں ہوا کیا ہے؟ تم پر ایسی کون سی افتاد آ پڑی ہے جس نے تم کو سر سے پاؤں تک بدل کے رکھ دیا۔ اس قسم کے بہت سے سوال اس لئے اور بھی میرے ذہن میں گونج اٹھتے کہ ایک تو پہلے ہی سے غیر معمولی طور پہ زندگی کے عام راستوں پر سے علیحدہ اپنا ایک راستہ بنائے ہوئے تھیں آپ پر مزید ستم یہ کہ زندگی کی مضراب سے رہا سہا ساز بھی چھن گیا تھا۔ لیکن کیوں ؟ کس خطا کی پاداش میں ؟ ؟

اور تو کوئی نہیں تھا جو ان کے اندرونی سوز کا پتہ چلا سکتا ایک سوائے ابا حضور کے جو بارہا کوشش کے باوجود ناکام ہو چکے تھے البتہ اگر سلیم بھائی ہوتے تو شاید بلکہ یقیناً یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہ ہر دم۔ ہر گھڑی۔ ہر آن اداسیوں میں ڈوبے رہنا کن بنیادوں پر مشتمل ہے

کیونکہ سلیم بھائی ہی ایک تنہا ان کے سچے ہمدرد' ہمدم۔ ہم خیال اور حقیقی غمگسار تھے۔ لیکن کون جانے وہ ان دنوں کہاں تھے۔ سنگاپور۔ برما اور ملایا کے جنگی میدانوں میں بہادری کے جوہر دکھا کر وہ ڈیڑھ سال سے جانے کہاں غائب تھے۔ کاش وہ یہاں ہوتے جن دنوں وہ یہاں تھے تو تقریباً ہر روز ان کا ہمارے یہاں آنا ضروری سی تھا' ابا حضور کو ان سے دلی محبت تھی اولاد کی طرح۔ حالانکہ وہ ہمارے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ تاہم ہمارے دلوں میں ابا حضور کے بعد کسی کا احترام تھا تو صرف ان کا۔ وہ بذات خود بھی اس قدر دلچسپ اور مقبول عام تھے کہ خواہ مخواہ طبیعت چاہتی کہ ان سے باتیں کئے جاؤ۔ ان کی باتیں سنتے جاؤ۔ وہ گفتگو اس قدر دلچسپ انداز میں کرتے تھے کہ دل میں گدگدی ہونے لگتی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان کے حلق میں کمانیاں لگی ہیں۔ ان کی آوازیں گویا میٹھے میٹھے دلکش اور سہانے گیتوں کے سُر کھلے ہوئے ہیں۔ جب دیکھو ہنستے ہی رہتے تھے۔ جیسے ان کی روح کی گہرائیوں میں شگفتگی اور مسکراہٹوں کے ہزاروں شبستاں آباد ہوں۔ جیسے ان کے سینے کی لامحدود وسعتوں میں رنگ و بو کے لاکھوں جہان بسے ہوئے ہوں۔ جن میں ہمیشہ کوئلیں کوکتی رہتی ہوں۔ کلیاں چٹکتی ہوں شگوفے کھلتے ہوں۔ بلبلیں گاتی ہوں۔ مور ناچتے ہوں جھرنوں کی موسیقی گونجتی ہو' اور پریاں..... ان کو پریوں کی بہت سی اچھی اچھی کہانیاں یاد تھیں۔ مگر وہ اس قسم کی کہانیوں کو جانے کیوں لغویت سے تعبیر کرتے تھے۔ مگر ہمارے اصرار پر ایسی لغو کہانیوں کو سنا ضرور دیتے تھے اور ہم سنتے یوں تھے کہ بس وہ بولے جائیں اور ہم سنیں جائیں۔ ایک روز روحی نے ان سے پوچھا کہ بھائی جان جب آپ ان کہانیوں کو لغو سمجھتے ہیں تو پھر سناتے کیوں ہیں۔ تو کہنے لگے کہ دراصل دنیا میں اگر کسی چیز سے مجھے ڈر لگتا ہے تو دل شکنی سے۔ اور میں جانتا ہوں کہ میرا انکار تم سب کی دل شکنی کا باعث ہوگا۔ اس لئے سنا دیتا ہوں ورنہ ..... اور یہ حقیقت بھی تھی کہ انتہائی رحمدل اور منکسر المزاج تھے۔ کسی کی ذرا سی تکلیف برداشت کرنا ان کے لئے ناممکن سا تھا۔ ان کو اپنی اس کمزوری کا پوری طرح اعتراف تھا کہ اکثر بنے ہوئے فقیروں کی مفروضہ داستان غم بھی سن کر متاثر ہو جاتا ہوں۔ حالانکہ جانتا ہوں کہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ سرے سے لے کر پیر تک غلط ہے۔ مگر پھر بھی ان کو ان کی توقع کے خلاف خالی ہاتھ واپس لوٹا دینے کی ہمت نہیں ہوتا۔ وہ کہتے تھے کہ اس طرح وہ بہت بڑے جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ یعنی فقیروں کو خیرات دے کر وہ ان کو عملی جدوجہد اور جائز کمائی کرنے کی قوتوں سے معذور کر دیتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے دل کی کمزوری سے مجبور تھے۔۔ میں نے بارہا دیکھا

پر ذرا مسکراتے ہوئے کسی المیہ کیریکٹر کی اندوہگیں آواز سن کر ہی ان کی بڑی بڑی پر تجسس آنکھوں میں آنسوؤں کی باریک باریک لکیریں کانپنے لگتیں۔ کشادہ پیشانی پر تفکر کا مدوجزر تھرتھرانے لگتا۔ لانبی ناک کے بانسے پر سندی سندی سُرخی اُبل کر جذب ہونے لگتی اور ہونٹ بار بار تھوڑی کمہار کے چاک کی طرح پھیل کر گول ہو جاتی۔ کثرت سگریٹ نوشی سے بادامی اور شاید زیست کی تلخیوں کے احساس سے بھینچے ہوئے ہونٹ ایکدم وا ہو کر کانپنے لگتے۔ مگر فوراً ہی ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کے سرمئی آبگینوں کے پیچھے ننھے ننھے شرارے کانپتے اور پتلیاں ایک دم شعلوں کی طرح جل اُٹھتیں، اُف اس غلام ملک کا ہر فعل غلامی کا آئینہ دار ہے۔ یہاں کوئی ٹھیک سے رو بھی تو نہیں سکتا ہنسنا تو درکنار رونا بھی نہیں آتا۔ اف یہ غلامی۔ پھر وہ اپنے بادامی ہونٹوں کو اسی سختی کے ساتھ بھینچ لیتے۔ ان کے ہر تاثر، ہر تفکر کا ماحصل یہی ہوتا۔ ہم غلام ہیں۔ ہم غلام ہیں۔ غلامی اور آزادی۔ اُٹھتے بیٹھتے وہ یہی رٹتے سیاسی غلامی۔ سماجی غلامی۔ سیاسی آزادی۔ سماجی آزادی۔ احمریں آپا سے ان موضوعات پر وہ بحث کرتے کرتے صبح سے شام کر دیتے۔ مگر پھر بھی کوئی فیصلہ نہیں ہو پاتا۔ اور مزہ یہ کہ ایسی خشک باتیں کرنے میں نہ وہ گھبراتے نہ احمریں آپا۔ مجھے احمریں آپا پر غصہ آنے لگتا کہ دوسروں کو تو زیادہ باتیں کرنے سے منع کرتی ہیں اور خود کے لئے یہ کوئی بری بات نہیں۔ اور پھر یہ کہ بھئی باتیں دلچسپ ہوں تو کوئی بات بھی ہے۔ احمریں آپا سماجی آزادی کو مقدم سمجھتی تھیں، اور سلیم بھائی سیاسی آزادی کو۔ بس اتنا سا فرق تھا کہ گھنٹوں لگ جاتے۔ کوئی ایک بھی اپنی جگہ سے ایک انچ بھی کھسکنے کا نام نہیں لیتا اور جب باتیں حد سے تجاوز کر جاتیں اور فیصلہ نہیں ہو پاتا تو اگلی نشست کے لئے چھوڑ دیا جاتا۔ ظاہر تھا کہ دونوں آزادی کے طلبگار تھے۔ دونوں انسانوں پر انسانیت کا راج چاہتے تھے۔ دونوں کا نظریہ عالمگیر تھا۔ دونوں اونچ نیچ۔ چھوٹے بڑے۔ امیر، غریب۔ کالے۔ گوروں کا امتیاز دنیا سے حرف باطل کی طرح مٹا دینا چاہتے تھے۔ دونوں کی منزل ایک تھی۔ مگر راستے جدا جدا۔ لیکن ایک روز آپ ہی آپ یہ فیصلہ ہو گیا۔

شاید شام کا وقت ہوگا۔ احمریں آپا اور سلیم بھائی پارک کی طرف والے برآمدے میں آرام کرسیوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ احمریں آپا کہہ رہی تھیں ...... ہمارے دل۔ دماغ اور ذہنوں پر غلامی کی مہریں لگی ہوئی ہیں ہم اس قدر پست ہمت اور مردہ ہو چکے ہیں کہ بھول کر بھی ہمارے ذہن میں اپنے زہریلے ماحول سے بغاوت کا احساس بھی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم سماجی شکنجوں میں اس بری طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ ہمیں اپنی بندشوں کی بھی خبر نہیں۔ ہم ذات پات اونچ نیچ کی لعنتوں میں گرفتار ہیں۔ ہم مذہبی تفرقے گوارا نہیں کر سکتے۔ ایک دوسرے کے عقائد کو گوارا نہیں کر سکتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہمارے ذہنوں میں انسانیت کا احساس ٹھٹھر کر مردہ ہو چکا ہے۔ ہم خارجی طور پر تو بہت کچھ ہیں۔ مگر داخلی طور پر بالکل کھوکھلے ہیں قطعی خالی خول۔ ہمارے پاس اپنا ذاتی سوائے نفرت کے اور کچھ نہیں ہم آزادی آزادی چیختے ہیں لیکن دراصل ہم اس کے نام سے بھی واقف نہیں۔ ہم مذہب کے نام پر جانیں قربان کر دیتے ہیں لیکن ویسے اس کی حقیقت کے متعلق ہم سے کچھ پوچھا جائے تو ہم علاوہ رسمی اور اشتعال کے اس کی توضیح و تشریح تو درکنار اس کے بنیادی مقاصد پر بھی روشنی نہیں ڈال سکتے۔ کہ مذہب کا مقصد کیا ہے۔ اس کے افادی پہلو کیا ہیں۔ الغرض کائنات اور زیست کی ہر چیز ہم سے پوشیدہ ہے۔ اب آپ ہی بتائیے اس کا بنیادی سبب کیا ہے؟

سوچیئے تو جس ملک میں ذرا ذرا سی انسانی لغزشوں کو معاف نہ کیا جا سکتا ہو۔ جہاں ایک فرقہ دوسرے فرقہ کا جانی دشمن ہو۔ جہاں مرد کی حیثیت ایک مطلق العنان شہنشاہ کے مترادف ہو، جہاں عورت ناکردہ گناہی کے جرم میں چار دیواری کے اندر قید کر دی جاتی ہو۔ جہاں اس کی پوزیشن ایک عضو معطل بیکار اور بے روح چیز کی طرح ہو۔ جہاں بچوں کو ازل ہی سے بلی۔ کتوں اور رہوؤں کے خوف سے بزدل بنایا جاتا ہو۔ جہاں کا نصاب تعلیم 'رسی کا پھندہ میں نے کھولا' اور 'طوطے کی چونچ لال ہوتی ہے' جیسے بے مقصد اور نفسیاتی اعتبار سے فراری جملوں سے ترتیب دیا گیا ہو۔ جہاں ابتداہی سے بچوں کے جذبات کو مفلوج اور بیکار کر دیا جاتا ہو۔ جہاں شروع ہی سے ان کے خمیر میں غلامی کی روح گھولی جاتی ہو۔ جہاں بندوق۔ تلوار اور اسی قسم کے دوسرے اسلحہ پر قانونی پابندیاں ہوں۔ اور بچوں کو ان کے تصوراتی صورت کے خوف سے سہمنے پر مجبور کیا جاتا ہو۔ بھلا بتائیے۔ وہ قوم کیا آزادی حاصل کرے گی۔ وہ ملک کیا آزاد ہوگا۔ سلیم صاحب حقیقتوں کو الفاظ کے رنگین پردوں میں چھپانا ہی آپ کی بنیادی کمزوری ہے۔ بلکہ میں تو اسے بزدلی کہونگی۔"

خوب... ! لیکن ایسا کیوں ہے.....؟ سلیم بھائی نے اپنے مخصوص انداز میں سگریٹ کا دھواں ایک لکیر کی شکل میں منہ سے نکالتے ہوئے کہا... "کبھی تم نے اس کے بنیادی اسباب پر بھی غور کیا ہے۔ کبھی بھول کر بھی سوچا ہے کہ آج ہم میں اتنی خامیاں کیوں ہیں، غور تو ہمارے

نصاب تعلیم کو ترتیب دینے والے کون سے ہاتھ ہیں۔ وہی سفید چمڑی والے بدیشی ہاتھ۔ جو ہمارے بچوں کو بندوق چلانا سکھو۔ بہادری انسان کا جوہر ہے جیسے جملوں سے اس لئے تعلیم نہیں دلوانا چاہتے کہ کل کو یہی بچے اپنی بہادری کا جوہر دکھانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ وہ جانتے ہیں کہ ہم ہندوستانیوں پہ بندوق۔ تلوار مشین گن اور بموں کے زور سے حکومت نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے اس نے بھلائی کی آڑ لے کر انسانیت کی مانگ کرنے والوں کے خلاف وہ حربہ استعمال کیا کہ سانپ کا سانپ مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ اس نے ہمارے عزائم۔ ہمارے جذبات' ہماری مجاہدانہ اسپرٹ کو سلا دینے کے لئے تعلیم۔ اصلاح۔ انسانیت اور اخلاق کا سہارا لے کر ہمارے صحت مند اجسام میں ایسا زہریلا انجکشن لگایا کہ ہمارا شعور۔ ہمارا ادراک۔ اور ہمارے حواس تک معطل ہو کر رہ گئے۔ برطانوی امپیریلزم کا فرزند لارڈ میکالے جو برطانیہ کی تاریخ کے صفحات میں سنہری صفحات میں لکھے جانے والا وہ کارنامہ کر گیا ہے جس کے نام سے ہمیشہ انسانیت تھرتھرا اٹھے گی۔ غور کرو جس نے اپنے قومی اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے اور چالیس کروڑ کی آبادی کو تا ابد غلام رکھنے کے لئے ایسا نصاب تعلیم ترتیب کیا کہ آج ہمارے ملک میں پڑھے لکھوں کی اکثریت بے رخ اور چلتی پھرتی لاشوں کی طرح نور بصارت سے محروم آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں والا چشمہ چڑھائے سوچنے کی صلاحیتوں سے معدوم زیست کی منزل سے بھٹکی ہوئی ہلاکت آفریں ظلمتوں کی طرف لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے رینگ رہی ہے آج ایک بدیشی کی دماغی صلاحیت چالیس کروڑ دماغوں پر حکومت کر رہی ہے صرف ایک زہریلا انجکشن چالیس کروڑ اجسام کو معدوم کر چکا ہے۔ صرف ایک دماغ یعنی لارڈ میکالے کے بنائے ہوئے نصاب تعلیم نے نہایت بے دردی کے ساتھ ہم کو کھینچ کر دنیا کی دوسری قوموں کے پیچھے کر دیا ہے کبھی تم نے اس زہرافشانی کے متعلق بھی کچھ سوچا۔ کوئی خیال تمہارے ذہن میں پیدا ہوا۔ سوچو وہ قدم جو جمہوریت۔ انسانیت اور اخلاق کا ڈھنڈورہ پیٹتے ہوئے بھی انسانیت سوز افعال میں مبتلا ہو۔ جو غلامی کی زنجیروں کو روز افزوں پھیلا رہی ہو۔ جس کی نگاہ میں کالے گوروں میں بین امتیاز ہو۔ جس نے دیدہ دانستہ اپنے مفاد کی خاطر چالیس کروڑ انسانوں کی زندگی کی لذتوں سے محروم رکھنے کی کوشش کی ہو جس نے درپردہ ہماری سماجی مشنری کے کل پرزوں کو زنگ آلود بنانے کے لئے اپنی طاقتوں سے کام لیا ہو۔ جس نے چالیس کروڑ انسانوں کو بین الاقوامی طور پر جاہل۔ پست۔ ذلیل اور بدتمیز روشناس کرایا ہو' کیا وہ قوم گوارہ کرے گی کہ ہم اپنی سماجی آزادی کے لئے کوئی عملی جد وجہد کریں۔ کیا دیدہ دانستہ اپنے دشمن کو حملہ آور ہونے کا موقع دیگی؟ ہرگز نہیں! ابھی نہیں!!

اب تم ہی فیصلہ کرو کہ ہم کو سب سے پہلے کیا کرنا چاہیئے۔ آیا ان قوتوں کے خلاف جنگ کرنا ہمارا اولین فرض ہے جو ہمارے سماجی ایوانوں کو مسمار کر رہی ہیں یا ان منہدم ایوانوں کو استوار کرنا جنکی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ . . . سوچو . . . ؟ جواب دو ؟؟ آخر دونوں میں کون مقدم ہے ؟

" دونوں۔ " احمری آپا چشمہ اتارتے ہوئے مسکرا دیں۔ مگر . . . . "

وہ اتنا ہی کہہ پائی تھیں کہ یکایک فضا میں ایک ہنگامہ سا مچ گیا۔ سامنے کول تار کی چمکیلی سڑک پر لوگوں کا جلوس نعرہ لگاتا ہوا گذر رہا تھا . . . .

ہندوستان چھوڑ دو۔ . . . . ہندوستان ہمارا ہے۔ انقلاب زندہ باد۔ ہندو مسلم اتحاد زندہ باد۔

نعروں کی آواز اور جلوس کے ہجوم کو دیکھتے ہی سلیم بھائی کی آنکھوں میں ایسا نور ابل پڑا جیسے یکدم ان کی روح کی وسعتوں میں چھپے ہوئے ہزاروں کینڈل پاور کے دودھیا بلب روشن ہو گئے ہوں۔ اچھا خدا حافظ۔ وہ لپک کر کمرہ میں میز سے اپنا فیلٹ ہیٹ اٹھاتے ہوئے بولے' اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ جلوس میں کہیں غائب ہو گئے۔

احمری آپا کی بے چین نگاہیں جب سلیم بھائی کا پیچھا کر کے واپس لوٹیں تو دروازے سے ہوتی ہوئی کمرے کے عین درمیان میز پر رکھے ہوئے کیلنڈر پر جا کر رک گئیں۔ انہوں نے پھر چشمہ چڑھا لیا۔

۱۱ اگست . . . . ہندوستان کی آزادی کا پہلا دن' . . . .

ان کی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔

فوجی لباس میں سلیم بھائی کو دیکھ کر میں بھونچکا سا رہ گیا' . . . . .

کیا مطلب ؟ احمری آپا نے پوچھا۔

دنیا میں امپریلزم سے زیادہ خطرناک اور مہلک ایک قوت اور ابھر پڑی ہے "احمر" جو اپنی وحشت اور بربریت کے زور پر ساری کائنات کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لینے کا عزم لئے ہوئے ہے۔ صرف اس کی شکست کی خاطر میں نے یہ اور میرے بہت سے ساتھیوں نے یہ لباس پہنا ہے۔ برطانوی امپریلزم سے وفاداری کا حلف اٹھایا ہے۔

لیکن . . . . سختی کے ساتھ تنقید کرنا چاہی۔

لیکن ویکن کچھ نہیں۔ سلیم بھائی نے ان کے منہ سے بات چھینتے ہوئے کہا

دنیا میں ہر انسان کا اخلاقی اور انسانی فرض ہے کہ وہ فاشزم کے خلاف جنگ میں حصہ لے چاہے وہ اپنے سیاسی نظریوں کے اعتبار سے کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو۔ سمجھیں آپ.....

شاید چھ مہینے کی ٹریننگ کے بعد ایک روز وہ مینا تارے چہرے پر مسکراہٹیں چپکائے۔ بازوؤں پر سیکنڈ لیفٹیننٹ کا رینک چسپاں کئے جانے کہاں، بہرحال جنگ کے لق و دق میدانوں میں آتش و آہن بارود اور خون کے ہولناک ساز پر ناچتے ناچتے تھک کر شکستہ حال انسانوں کی لاشوں کو روندنے کے لئے روانہ ہو گئے۔

پلیٹ فارم پر میں نے دیکھا۔ احمری آپا کا چہرہ اُترا ہوا تھا. لیکن آنکھوں میں وہی عقابی جھلک تھی۔ وہی رفعتوں کے پرتو...... دو سال تک مسلسل پابندی کے ساتھ سلیم بھائی خط بھیجتے رہے لیکن اچانک بلا کسی اطلاع کے خط آنا بند ہو گئے۔ ایک روز ابا حضور بولے، سلیم کی بٹالین جاپانیوں کی قید میں ہے۔ اس کے بعد سے تو ایسا معلوم ہوا جیسے احمری آپا کا چولا بدل گیا۔ جب دیکھو، اداس، غمگین، کھوئی کھوئی ڈولی ڈولی۔ جیسے اندر ہی اندر کوئی روگ ان کی روح سے گھن کی طرح چمٹ گیا ہے۔ ان کی صورت دیکھ کر مجھے ہمیشہ سلیم بھائی یاد آجاتے۔ کاش وہ یہاں ہوتے، میں نے احمری آپا کو ستانا چھوڑ دیا۔ ان کے لئے بازار سے نئی نئی کتابیں لاکر دینے لگا۔ میرے دل میں ان سے ہمدردی کے ساتھ ایک قسم کا رحم بھی پیدا ہو گیا۔ میں ان سے محبت کرنے لگا۔ مگر پھر بھی ان کے دل پر چھایا ہوا غبار نہ چھٹا۔

اچانک ہیروشیما پر غیر مرئی وزن کا بم پھٹا۔ اور گویا تخریب کے دامن سے تعمیر کے سوتے پھوٹ پڑے ساری کائنات سے۔ اداسیاں غنا کہاں۔ پریشانیاں ساون کے بادلوں کی طرح چھٹنے لگیں۔ دنیا کے حلق سے گہرا سانس نکل گیا۔ لیکن یہ گہرا سانس ذہنی الجھنوں اور ناقابل برداشت پریشانیوں کا مظہر نہیں تھا بلکہ امن اور سکون کی تھرتھراتی ہوئی کرنوں کا والہانہ خیر مقدم تھا۔

دھیرے دھیرے فوجیں واپس آنے لگیں۔ قیدی چھوڑ دئے گئے۔ مگر سلیم بھائی نہیں آئے۔ لیکن ایک دن معلوم ہوا کہ لال قلعہ کی سنگلاخ چار دیواری کے درمیان ملک کے بہت سے جانباز سنگینوں کی جھنکار کے ساز پر "چلو دلی چلو" کا ترانہ گاتے ہوئے لاکر قید کر دئے گئے۔ یکایک ہندوستان کی منجمد فضا انقلابی نعروں سے گونج اٹھی۔

ہڑتالیں ہوئیں۔ مظاہرے کئے گئے، بچوں اور بوڑھوں پر گولیاں چلیں۔ لاٹھی چارج ہوا۔ گرفتاریاں کی گئیں۔ اور اس کے بعد جانے کیا ہوا۔ 'جے ہند' کا نعرہ گلی کوچوں میں سنائی دینے لگا۔ 'انقلاب زندہ باد'؛ میں نے کئی بار سوچا آخر اس سے مراد کیا ہے لیکن سمجھ میں خاک نہیں آیا۔ ایک روز میں نے ہمت کر کے احمری آپا سے پوچھ ہی لیا وہ بولیں 'انقلاب زندہ باد'۔ میں نے کہا 'جی ۔۔۔؟ اس کا کیا مطلب ہوا؟' 'سلیم بھائی آکر بتائیں گے۔' یہ کہتے ہوئے ان کے چہرے پر ایک انوکھی روشنی آگئی۔

میں نے کہا۔ 'کب؟'

'شاید کل یا پرسوں' اس وقت ان کی آنکھوں میں ایسی عجیب سی کشش تھی کہ خواہ مخواہ میں ان کی صورت تکنے لگا ایک طویل عرصہ کے بعد میں نے ان کے لبوں میں مسکراہٹ کی باریک باریک لکیریں تھرتھراتی ہوئی دیکھی تھیں۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ ابا حضور آفس سے واپس نہیں آئے۔ اسکول کی تعطیل تھی۔ میں لائبریری میں منٹو کی نئی کتاب 'کروٹ' کا ٹائٹل دیکھ رہا تھا اور احمری آپا تیزی سے کچھ لکھنے میں مصروف تھیں، دروازے پر کار رکنے کی آواز اور پھر میں ہنگامہ آرائی کے باوجود ہم دونوں اپنی جگہ سے نہیں ہٹے، جانے کیوں۔ مجھے رہ رہ کر آرٹسٹ پر غصہ آرہا تھا کہ آخر اس عریاں تصویر کے بنانے سے اس کا مقصد کیا تھا؟

کہاں ہیں احمری ... یکایک بوٹوں کی آواز کو چیرتی ہوئی ایک سنی سنائی آواز سنائی دی۔

'لائبریری میں' لڑکی کی آواز میں ایک عجیب سی تھرتھراہٹ تھی۔

'انقلاب زندہ باد' میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا، سلیم بھائی دروازے میں کھڑے باقاعدہ فوجی انداز میں سلوٹ کر رہے تھے۔ ایک لمحے کے لئے میرے دل میں ایک انوکھی سی خواہش پیدا ہوئی۔ کاش میں بھی اسی طرح اسی انداز، اسی سلیقے اور اسی آزادی، سچائی و عقیدت کے ساتھ سلوٹ کر سکتا۔

انقلاب زندہ باد۔ احمری آپا مسکرا رہی تھیں۔ اُف ان کی مسکراہٹ کس قدر رنگین تھی، کیسی شیریں، کتنی پرفن...... شاید زندگی میں پہلی بار......

تشبیب

سلیمان اریب

اے کہ وابستہ ہے تجھ سے مرا دامانِ سخن
تو کہ موضوعِ سخن، روحِ سخن، جانِ سخن
تیرے باعث سے ہے مرے نیلوفرِ باغِ جمال
رشکِ فردوسِ بریں میرا گلستانِ سخن

میری ہر نظم ترے پرتوِ رخ سے شاداب
فیضِ رفتار سے ہر گیت مرا تارِ رباب
چشمِ مخمور کی خیام نوازی کی قسم — !
میرا ہر شعر چھلکتا ہوا اک جامِ شراب

جسم کے نور سے روشن نہ ہو کیوں مرا دماغ
جس کے آگے نہ جلا ماہِ دو ہفتہ کا چراغ
زلفِ شب تاب کی تشبیہ جو سوجھی ہے کبھی
مہر کو مل نہ سکا میرے تخیل کا سراغ

تیرے ہونٹوں سے ملا نطق کو میرے اعجاز!
تیری بانہوں سے ہے پیدا مری نظروں میں گداز
کیا کہوں کیا ہو تصور تری انگڑائی کا
عرش و کرسی سے ادھر ہوتی ہے مری پرواز

کاش! میں یونہی ترا ذکر کروں، کرتا رہوں
پھول تو پھول ہیں افلاک سے تارے توڑوں
جب کبھی فرصت ملے اک پل کی غمِ گیتی سے
تیری تصویر کے ہر خط میں یونہی رنگ بھروں

اشتیاق عارف

انتشار

مینو کے آخری سرے پر بیٹھے ہوئے بابو بلند نے ایکدم کرسی سے اٹھتے دیکھ کر دانتوں سے ناخن کاٹتے کاٹتے اپنا ہاتھ اس تیزی سے نیچے کو ہٹایا کہ سامنے رکھی ہوئی چائے کی خالی پیالی میز پر ایک لمحاتی کھنک کے ساتھ اوندھی ہو گئی غنیمت یہ ہوئی کہ ٹوٹی نہیں لیکن بابو جی نے جس عام انسانی کمزوری کے گھناؤنے رخ کو رسماً ایک دوسرے بابو جی کی نظروں سے بچانا چاہا تھا وہ پوشیدہ نہ رہ سکا کیونکہ اٹھتے اٹھتے بابو جی کے بائیں انگوٹھے پر نیم تراشیدہ ناخن کو دیکھ لیا تھا جو نئے چاند کی طرح باریک...... نصف کے قریب بقیہ ناخن سے جدا ہو کر لٹک رہا تھا مگر اہمیت کے شدید احساس سے اس کے چہرے پر ناگواری برسنے لگی۔

کم بخت مہذب بنتے ہیں یہ...... اس کے ذہن پر دل کی صدائے بازگشت گونجی اور وہ کاؤنٹر پر اپنی چینک کر زیر لب خدا جانے کیا بڑبڑاتا ہوا ہوٹل کی تینوں سیڑھیوں کو اس طرح پھلانگ آیا گویا کسی نے دانستہ طور پر اس کی عرق آلود پیشانی کو کالک سے سیاہ کر دیا ہے اور جیسے وہ دیکھ لئے جانے کے ڈر سے بھاگا جا رہا ہے۔

ہوٹل کے سامنے گداگروں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی ان میں اپاہج کم اور بچے بوڑھے اور کردہ صورت عورتیں زیادہ تھیں۔ ان میں کچھ عورتیں ایسی بھی تھیں جنہوں نے تاریک راتوں میں اپنے میلتے ہوئے شباب آقاؤں کی خدمت کر کے نہایت کامیاب طریقے پر تسکین دی تھی۔ بڑا ہی بھت کر سا...... پر مستقبل کے بہم تصور سے دانستہ گریز کرتے رہے وہ گاہک وہی کیسے اور اب جب ان کا یہ بڑھاپا گاؤں کو رہ گئیں اور جب ان کے پینے والوں کی بہبیت سخت پڑ گئی تو وہ بسی کے ویرانوں اور گمنام روڈ میں سسکتی ہوئی نکلیں، اپنا کو کھوں اور گود ما تتے قبیل کے تپا کا...... تنہا پیٹ پر گنا ہوں بھتوں اور بھائیوں میں ناز کرنے والے نو خیز نے جب...... وقت ان کے گلا بچھوں کا رس نچوڑ لیا تھا۔ اب ان میں جذبات خود کوئی دلفریبی باقی نہیں رہی تھی اب کوئی جیالا نوجوان بے کیف راتوں کے عوض انہیں اپنا جیون رس دینے کو آمادہ نہ تھا اب ان کی خستہ حالی اور چہرے کی بد رونقی بھی لوگوں کو اپیل نہیں کرتی تھی حتیٰ کہ قوم کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے اب وہ اپنی بھوک کا سہارا نہیں لیتی تھیں کیونکہ لوگ انہیں قابل توجہ نہیں سمجھتے تھے پھر بھی ان اپاہجوں، بے کاروں، از کار رفتہ حسیناؤں اور کاہلوں کے لئے چالیس کروڑ مخلوق کے دروازے عیش گاہیں، ہوٹل، اسٹیشن اور پلیٹ فارم موجود ہیں ان مقامات پر بھیک مل جاتی ہے، قوم کے گندے بچے قوم کی خیرات کے سہارے پروان چڑھتے ہیں، آگے بڑھتے ہیں...... بھیک مانگتے ہوئے اور اسی طرح کبیر کے استری کئے ہوئے پتلون کی چمک دیکھ کر سیڑھی کے قریب یاس اور نا امیدی کی کشمکش میں مبتلا...... ایک ادھیڑ عمر کی عورت بھیک مانگنے کے لئے اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔

سیٹھ...... سیٹھ، وہ وقت سے بھوکا ہے یہ...... عورت نے اپنی چھاتی سے چمٹے ہوئے لاغر بچے کو اس کی نظروں کے روبرو کرتے ہوئے مسکین صورت بنا کر کہا...... جیسے سچ مچ اسے بھیک ملنے کی توقع تھی۔ کبیر کے تیز تیز قدم رکنے لگے اور قبل اس کے کہ وہ بالکل تھم جائیں اس کی رفتار میں پھر وہی تیزی پیدا ہو گئی لیکن عورت کو سامنے اڑے دیکھ کر اس کا چہرہ اور بھیانک ہو گیا۔

ہٹ سامنے سے...... انتہائی جھنجلا کے بادھو کئی گالیاں ایک دم کہہ گیا...... چلے تو بچے ہی کچھ ٹھٹکی پھر احساس مجبوری سے الگ ہٹ گئی۔

...... دیا، ایسے اجلے کپڑے پہننے والے سیٹھ کچھ نہیں دے سکتے عورت کو بے سی دیکھ کر نہیں دیا نہیں آتی نہ سہی لیکن اس ننھے بچے کی بھوک کا ان کے دماغ میں ذرا بھی خیال نہیں ہوتا...... واہ رے سیٹھ!...... عورت کے ... احساسات نے اندر ہی اندر پکار شروع کر دی۔

ٹھیک اسی وقت کوٹ کی جیب میں پڑی ہوئی آگئی پہ اس کی انگلیاں

پھسلنے لگیں صرف ایک اکنی باقی بچی تھی اس کے پاس اور اسے ابھی شام کی چائے
بھی پینا تھی سامنے ہاتھ پھیلائے ہوئے فقیر، بچے اور عورتیں اس کے دل میں
سانپ کی طرح چبھن، خلش پیدا کر رہی تھیں اور وہ اس خلش کی لذت آگینی کو
گھونٹ گھونٹ پیتا ہوا . . . مجبوریوں کی شرمناکی سے گزر نہار،
اکنی کو انگلیوں سے مسلتے ہوئے کراس روڈ تک آ پہونچا۔

لائبریری کے موڑ پر کھڑے ہوئے تانگے میں ایک سواری کی جگہ تھی جس
کے لئے تانگے والا لائبریری ہی سے کسی بابو جی کا انتظار کر رہا تھا اسے دیکھتے ہی
اس نے آواز لگانا شروع کردی۔

ایک سواری، ایک سواری . . . ٹیشن بابو جی ٹیشن . . . .

کبیر نے بے اختیار اکنی کو مضبوطی سے سنبھال لیا اور پہلے سے زیادہ
مرجھائے ہوئے چہرے پر روشنی پیدا کرلی جسے دیکھ کر تانگے والے کی
بلند آواز یکایک دھیمی ہوگئی۔

"صاحب دو آنے دیجیے گا ٹیشن کے" . . . . وہ یہ سمجھتا تھا کہ لگے
ہاتھوں جو کچھ مل جائے وہی غنیمت ہے۔

نہیں نہیں بھائی . . . . مجھے کہیں نہیں جانا ہے . . . . . .

کبیر نے پیچھا چھڑانے کے لئے جھنجھلا کر جواب دیا اور جلدی سے سڑک
پار کر گیا۔

اس وقت نہ معلوم کیوں اس کی حسیات بیدار ہو گئی تھیں ورنہ اکثر
کی بے شمار چیزیں تھیں اس سے قبل دیکھ کر اس نے بے اعتنائی برتی تھی اس
وقت اس کے شعور پر بوجھ بنی ہوئی تھیں۔ لائبریری کے بالمقابل اس نے
بارہا حجاموں کو استرے تیز کرتے ہوئے بالوں سے اٹی ہوئی جھاڑنوں کو
ہوا میں جھٹکارتے ہوئے دیکھا تھا لیکن ہر مرتبہ کی طرح آج اس دوکان
کی آراستگی اور گاہکوں کی سج دھج کو وہ نظر انداز نہ کر سکا۔

لائبریری کے اونچے زینے پر قدم رکھتے ہی کسی غیر محسوس قوت نے
اس کے پاؤں تھام لئے۔

بابو! . . . بابو رے . . . . ایک پیسہ

اس سے ایک ایسی بھکارن بھیک مانگ رہی تھی جس کی آنکھوں
میں کجلاہٹوں کی شدت نہ تھی آواز میں سچ مچ بھوک کی وحشتیں تھیں
اور انداز میں نسوانی بیچارگی کی خوف زدہ تصویر تھی۔

اسے اس وقت اپنے چاروں طرف فقیر نظر آرہے تھے جن سے اسے
نہ ہوٹل میں پناہ ملی اور نہ سڑکوں پر . . . . کسی نے کہا۔

بابا اللہ نام پر مسلمان کی مدد کرو . . . . بہت سے لوگ اس لئے در در کی
خاک چھانتے پھر رہے ہیں کہ ان کے شہروں میں ہندو مسلم فساد کی آگ پھیلی ہوئی
ہے وہاں ان کا ذریعہ معاش نہیں رہا۔ ہندوستان میں اور بھی ہزاروں
شہر ہیں جہاں کروڑوں انسان آباد ہیں ہر سال ان شہروں میں لاکھوں نئے
انسان پیدا ہوتے ہیں اور ہندوستان انہیں اپنی قدیم روایتی فیاضی سے
حسب ضرورت جگہ دیتا چلا جا رہا ہے۔ پھر ان چند ہزار فساد زدوں کی رسائی
کیوں نہیں ہوتی انہیں کام کیوں نہیں ملتا . . . . . بمبئی، مونگیر،
بہاولپور اور احمد آباد نہ سہی کہیں اور . . . . لیکن سچی بات تو یہ ہے
کہ ہندوستان کو جنگ نے تھکا دیا ہے بہت طویل عرصہ کا سکون چاہیے ابھی تو
اندرونی خلفشار پر کوئی دھیان نہیں دینا چاہتا اس لئے کہ مسلمان پر امن رہنے
کا قصد کئے ہوئے ہیں اور ہندو اہنسا پر جمے ہوئے ہیں مسلمان نعرۂ امن
بلند کرتے ہیں . . . . . ہم انتہائی نازک دور سے گزر رہے ہیں اس وقت
معمولی سی فروگذاشت ہمارے مستقبل کو تاریک بنا دے گی۔ صدیوں کا فساد،
ہمالیہ کی بلندیوں سے کر خلیج کھمبات تک پھیل گیا ہے جس کی لپیٹ میں بلا امتیاز
عورت و مرد ہر شخص آگیا ہے۔ سچے ہمدردوں کو اس ملک کے نقشے پر خون کے دھبے
ابھرے ہوئے نظر آرہے ہیں لیکن جلد ہی یہ خونیں دھبے ہندوستان کو لہو سے
سیراب کر دیں گے۔ ہر جگہ نعشوں کے ڈھیر ہوں گے اس مقدس سرزمین پر ہر
جگہ انسانیت چیخ رہی ہوگی ہندوستان آگ اور خون کا ملغوبہ بنا ہوگا۔

. . . . دوسرا فرقہ اہنسا کا پرچار یوں کرتا ہے . . . . . ہمیں
آبرومندانہ زندگی بسر کرنے کے لئے آپس میں بھائی چارگی کے بندھن کو مضبوط بنانا ہوگا۔
اپنے قدیم کلچر، تہذیب اور تاریخ کو اپنائے بغیر ہم آزادی کا سانس نہیں لے سکتے
چھوٹی اقلیتوں کو ہر مرحلے پر ضد نہ کرنا چاہیئے اس لئے کہ وہ بڑی اکثریت کو زیادہ
عرصہ تک غلام بنائے رکھنے میں شہنشاہیت کی مدد نہیں کر سکتیں جہاں تک معقولیت
کا سوال ہے۔ ہر بات تسلیم کی جائے گی لیکن ضد کا نتیجہ بڑا خوفناک ہوگا . . . .

. . . . . . قہ قہ قہ . . . . اس کے دماغ سے ایک شرابی
قہقہہ پھوٹ پڑا . . . . . . قہ قہ . . . . خوفناک . . . .

ہوٹل میں بمبئی کا مصیبت زدہ نو مسلم کہتا تھا . . . . جان بچا کر یہاں
بھاگ آیا ہوں وہاں رہنے کا ٹھکانا نہیں ہے۔ کل رات سے منہ میں ایک کھیل تک
نہیں گئی کھانا کھلا دو سیٹھ . . . . . اور وہ جیب میں پڑی ہوئی دونوں اکنیاں سے
کھیلنے لگ گیا تھا . . . . ارے بھلا کسی مذہبی جنونی کے پاس جاکر
دو ٹکڑا روٹی وہ تمہارا پیٹ بھر سکتا . . . . . . میں تمہارا [illegible]

فسادوں کی آگ نے گھر سے بھیک مانگنے کا نرالا طریقہ نکالا ہے تم لوگوں نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دھرم اور مذہب کا نام ہی کل مذہب میں رہ گیا ہے کسی بچارے کو پکڑا تو وہ بھی جان سے تمہاری جاں نثاری کرے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن ان جھڑکیوں کا تعلق بالواسطہ اس ہمدردی سے تھا جو عام انسانی ہمدردی رکھنے کے باوجود انسان کے دامن سے لپٹی رہتی ہے۔ ایسے موقع پر اگر جیب خالی ہو تو خواہ سیٹھ لوٹ ہو یا بابو جی ۔ ۔ ۔ ۔ سبھی کو ذہنی اذیت ہوتی ہے اور اسی اذیت کے باعث وہ پول سے یکبارگی اٹھ کر چل دیا تھا۔

اب سیڑھی کے اونچے زینے پر کھڑے ہوئے اس نے بھکارن کو گھور کر دیکھا۔ وہ اپنے ہاتھ کو اوپر اٹھائے ہوئے بائیں ہاتھ سے اپنے بچے کو، جو اس کے سینے میں سما ما رہی تھی سنبھالے سیاہی مائل سرخ سرخ پاؤں ماں کی داغدار اوڑھنی کے دامن سے باہر نکلے ہوئے تھے ان سرخ سرخ پاؤں کو دیکھ کر اس کے دل میں پیار امنڈ آیا اس کا جی چاہا کہ بے اختیار بچے کو اپنے سینے سے لگا لے لیکن ٹھیک اسی وقت بھکارن کے کھلتے ہوئے ہونٹوں کے درمیان میں دانتوں پر جمی ہوئی غلیظ کثافت اور متعفن آمیز بھکرانڈ کا خیال آتے ہی اس کا جذبہ رحم بھاگ نکلا۔

بابو ۔ ۔ ۔ ۔ بابو رے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے پہلے سے زیادہ شدت سے مانگنا شروع کر دیا۔ پھر اس نے کبیر کے چہرے سے نرماہٹ کو فرار ہوتے دیکھ کر اپنی لگا بیں نیچی کر لیں بچے نے ماں کی سوکھی چھاتی سے اپنا منہ ہٹا لیا بغیر چولی کے چھاتی نیچے کو ڈھلک گئی بے بھکارن نے اوڑھنی میں چھپانے کی قطعاً کوشش نہ کی۔ عریاں چھاتی کے نقطۂ ابھار پر ہلکا سا خم دیکھ کر اس نے ایک جھرجھری لی۔ جس میں لذت سے زیادہ جنسی میلان تھا ۔ ۔ ۔ ۔ توبہ! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے ذہنی انتشار کا رخ کئی دنوں سے سوئے ہوئے جذبے کی پذیرائی کی طرف مڑ گیا۔ گناہ و ثواب کے تو ہم سے آزاد کر دینے والا جذبہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک جنسی خواہش ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو عام طور پر جوانوں میں جاگا کرتی ہے ۔ ایک خوف زدہ اور بے بس عورت کو دیکھ کر تو اس خواہش کے بند ٹوٹ جاتے ہیں پھر اس کے سامنے تو ماچس کی ایک ایسی ڈبیہ تھی جس کے لیبل سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ جب یہ ڈبیہ بھری ہوگی تو اس کی تیلی میں آتش ریز فاسفورس کی کافی مقدار ہوگی اور ان تیلیوں نے شبستانوں کی کتنی شمعیں فروزاں کی ہوں گی اسی طرح کی عورتوں کے بنگال کے چپے چپے پر بھوک سے نڈھال ہو کر اپنی عظمت، اپنی پاکیزگی، انس اور عزت کو دولت کی گود میں [illegible] دیا تھا یہ کلکتہ کی فلک بوس عمارتیں بھی ہزاروں کنواری سسکیاں اس ظالمانہ عصمت ریزی کی صدائے باز گشت بنی ہوئی ہیں۔

بھوک لگی ہے تجھے؟ کبیر نے جیب سے اکنی نکال لی

ہاں بابو جی

کتنے پیسے لے گی؟ اس نے بائیں آنکھ کے گوشے کو اشارتاً میچ لیا۔

اوں ہنک ۔ ۔ بابو جی! ۔ ۔ ۔ ۔

مانگتی کیوں نہیں۔ بول کتنے پیسے چاہئیں تجھے؟

وہ ایک دم سکتے میں پڑ گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھیری لگانے والے اور صاحب لوگوں میں پھر کیا فرق ہے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے پراگندہ دماغ میں یہ سوال کلبلانے لگا، گھبراہٹ اور خوف کے عالم میں وہ نراش ہو کر اوڑھنی کو سینے پر سنوارتے ہوئے آگے کو چل پڑی۔

ارے رے رے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ارے ۔ ۔ ۔ ۔ یہ پیسے لے ۔ ۔ ۔

اس نے اکنی سڑک پر پھینک دی۔

ہر بھکارن بہرحال اتنی کھوکھی نہیں ہو سکتی کہ وہ بنگال کے واقعات کو دہراتی تھک جائے ۔ ۔ ۔ وہ سوچنے لگا۔

چند لمحے پہلے جو عجیب تحرک خواہش اس کے دل میں پیدا ہوگئی تھی وہ آپ ہی آپ ادھڑنے لگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اسی شام کو تاروں کی جگمگی سپاٹ سڑک پر وہ اور قمر دن بھر کی تھکن دور کرنے کے لئے نکلے تھے یہ وہی سڑک تھی جس پر چہل قدمی کرتے ہوئے اکثر اس نے یہ محسوس کیا تھا کہ اس جگہ جیسے شہر کی زندگی ابھی ابھی سو کر اٹھی ہے اسی سڑک پر شام کی دھندلی فضا میں اس نے کئی بار رنگروٹوں سے بھرے ہوئے ایسے فوجی ٹرک دوڑتے دیکھے تھے جن کی تیز رفتاری سے اتنا ڈر نہیں لگتا جتنا کہ موٹے ٹائروں کی اس فراخ آواز سے جو تارکول کی ابھری ہوئی سطح پر پھسلنے سے موت کے نغمے کی طرح گونجتی رہتی ہے بالکل اسی طرح جیسے صبح صادق کے وقت کسی کہر آلود دیہات میں آٹا پیسنے کی چکیاں چل رہی ہوں لیکن ان کی آواز میں زندگی کی لہر ہوتی ہے قہقہے اور موسیقی ہوتی ہے اور لاریوں کے خوفناک ٹائروں میں موت کا بھجتا ہوا نغمہ، مُردوں کی چیخیں ۔ ۔ ۔ ۔ انہیں دیکھ کر کئی بار اس کے دل میں یہ خواہش ادھوری ہو کر رہ گئی کہ کاش کوئی کھلنڈرا بچہ ان کے لپیٹ میں نہ جائے! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو کیا ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سولین ڈرائیور کے سیاہ ہونٹوں میں دبی ہوئی ادھ جلی سگریٹ چرمر ہو کر رہ جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسٹیشن پر [illegible] ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ [illegible] اس کی روح جیسے یک بارگی پھڑپھڑا اٹھے۔

پیچھے سے تانگہ آتا دیکھ کر وہ دونوں بائیں ہاتھ والی فٹ پاتھ کی طرف ہٹ گئے۔

کبیر نے پرسکوت ماحول کے احساس کو ایک بڑے احساس کے نیچے اس طرح دبا دیا تھا جیسے رنگتی ہوئی چیونٹی پر کوئی تو جی بات نکالے سے وہ بڑا احساس کر رہا تھا؟ . . . . . . اس بیکاری کو تنہائی میں قابل گرفت پا کر جو جذبہ اس کے رگ و پے میں امنڈ آیا تھا اور بعد میں جو شدید رد عمل ہوا تھا وہی بڑا احساس اس کے لاشعور پر اس وقت طاری تھا۔ اصل وہ یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایسے نازک مواقع پر اس کے دوست کیوں فنی سامان مہیا کرتے ہیں۔ اس کے دل میں یہ خیال بڑی مضبوطی سے جم گیا تھا کہ عورت کے بارے میں اس کے نظریے، دوست اس سے زیادہ واقفیت رکھتے ہیں۔ کوکب کو تحسین پسند عورتیں سے رومان لڑانے میں خاص مہارت ہے۔ تاج عورتوں کو ان کی رنگت اور گرمی فن کے لحاظ سے ترجیح دیتا ہے اور قمر . . . اس کا تو ڈھنگ ہی نرالا ہے اس کے یہاں ابھرے ہوئے سینے اور گداز پنڈلیوں کی تخصیص نہیں بس نام کرنے عورت کافی ہے اور . . . . . .

وہ اپنے اس نرالے نظریے کی حمایت میں بڑی عجیب و غریب باتیں کرتا ہے۔

یہی عورت ہے جو ماں بن کر ہمیں جنم دیتی ہے۔ اس کی یہ دلفریبی کیا کم ہے کہ ہر انسانیت کو اپنی شفقت آمیز نگاہوں کے زیر سایہ پروان چڑھا کر مستفید کرتی ہے . . . . . . بہن کا یہ امتیاز کہ یہی عورت معصوم بھائیوں کی نگہداشت کرنے میں اپنے عہد طفلی کے الہڑپن اور جوانی کے کیف و انبساط کی خیرگی سے بے نیاز ہو جاتی ہے . . . . پھر مجال کیا جو وہ کبھی اپنے بھائی پر نامہ گزرے . . . . عورت کے بانکپن کا عروج اس بے پناہ شیفتگی میں ہوتا ہے جو کسی مرد کے لئے مخصوص ہے . . . . . . رنگ و نقش سے قطع نظر ان کی یہ محبوبیت کیا کم ہے کہ جہاں مرد ان کے نزدیک آیا سارے . . . کرامات ہو گئیں اس کے لئے عورت ہونا چاہئے خواہ کالی ہو یا گوری . . .

پھر ساری دنیا کی عورتیں عورتیں تو نہیں ہوتیں . . . . . .

یکایک اسے بات چھیڑنے کا بہانہ مل گیا۔

ارے بھئی قمر . . . . اس نے قمر کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔
میں نے کافی کوشش کی لیکن روپیہ نہیں ملے۔

جیسے اس نے کوئی غیر متوقع خبر سنی ہو۔

. . . .

. . . سے کچھ ادھر تھوڑی دیر پہلے چلے گئے۔ منیر نے اپنی سیونگ بنک بک

بتا دی اس میں کل ایک روپیہ نو آنے جمع ہیں۔

رضیہ سے میں وعدہ کر چکا ہوں اگر روپیوں کا انتظام نہ ہو سکا تو وہ میرے متعلق بڑی خراب رائے قائم کر لے گی۔

تم کسی قسم کا بہانہ کر دینا۔

اسے بڑی شدید ضرورت ہے اس وقت اگر میں حیلہ جوئی سے کام لیا تو وہ سمجھ جائے گی . . . . . . میں اسے بارہ روپے نہیں دے سکتا . . . .

اس کی آواز میں کھوکھلا پن پیدا ہو گیا

پھر وہ سوچنے لگا . . . . اس کے اور رضیہ کے درمیان یہ بارہ روپے دیوار کی طرح حائل ہو گئے ہیں۔ وہ . . . . . وہ کیا کہے گی . . . . ایک ذرا سی آزمائش سے تمہارے پاؤں لڑکھڑا گئے . . . کیا جانو تم . . . . عورت کو مطمئن و مسرور بنانے کے کیا کچھ کیا جاتا ہے . . . .

اس نے دیکھا قمر کے چہرے پر غیر مبہم خیالات کی پرچھائیاں رینگ رہی تھیں . . . . . . آنکھوں میں ایک عجیب اضطراب کی دھندلاہٹ لرزاں تھی۔

دور افق پر گہرے ابر کے ٹکڑے دوڑ رہے تھے جن کے اندر ملاقات . . . نیلگوں پھیلی ہوئی تھیں اور کبھی کبھی ان نیلے ہیولوں کے آغوش میں کوئی ننھا سا ستارہ ٹمٹما اٹھتا تھا۔ اٹ سینما ہاؤس کے وسیع احاطے میں سبز و سرخ رنگ کے بے شمار قمقمے کسی دوشیزہ کے خود فریب تخیل کے رنگ محل کی طرح جگمگا رہے تھے۔

جنوبی گوشے میں شہر کے سب سے قدیم قبرستان کی دیوار کو جانے والی سڑک سے ملتی ہوئی حدود پر دو انسانی سائے ایک دوسرے سے چپکے ہوئے روشنی کی طرف آ رہے تھے۔ دھندلکے میں سے پھوٹتی ہوئی سرخی جب ان کے چہروں پر پڑتی تو ان کے مٹیالے نقوش واضح ہو جاتے تھے۔ معلوم ہو رہا تھا کہ دو بدمست شرابی ایک دوسرے کے سہارے لڑکھڑاتے ہوئے چل رہے ہیں۔

کبیر نے چند لمحوں تک اس طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھا لیکن فوراً ہی ایک عام انسانی جذبے نے اس کے شکوک کو رفع کر دیا . . . .

. . . غریب اپنے کسی عزیز کو دیار نہ میں سلا کر واپس ہو رہے ہیں جب اسے تاریکی میں کوئی ہمنوا و غمخوار ان کا ساتھ دینے نہیں آیا۔ ٹھیک تو ہے . . . محرومی کے غم میں ان کو کوئی شرکت نہیں کرتا . . . شہر کی مصروف زندگی میں کسے فرصت ملتی ہے کہ وہ غلے بھوکے انسانوں کے آنسو پونچھتا پھرے . . . . . .

بہت دن ہوئے اسے یاد ہے جب ایک آتاترک کے جنازے کا فلم دیکھی تھی کہ ہوتے ہر عقیدت مند . . . بار جنازے کو اٹھانے کے لئے جنازے کے ساتھ سر پیٹ . . .

انسانوں کا عظیم الشان جلوس تھا اتنا بڑا جلوس تو کسی چھوٹی موٹی مملکت کے تاجدار کے جشن تاجپوشی کے دن بھی کم نظر آیا ہوگا۔ ایسے محبوب آتا ترک کو اس فانی دنیا کی آخری آرامگاہ تک پہنچانے کی سعادت حاصل کرتے ہوئے کتنی اشخاص بھیڑ میں کچل گئے تھے جلوس ان کی لاشوں پر سے گزر رہا تھا۔

جب اس نے خلا کی طرف گھورتے گھورتے قریب کے لیمپ پوسٹ کے نیچے دیکھا تو ایک عورت راہ گیروں کی نگاہوں سے بچتی ہوئی اس کی سمت بڑھی چلی آرہی تھی اس کے قریب آتے ہی کبیر کو زلزلہ کی طرح ایک جھٹکا سا لگا۔ ..... یہ وہی سلونی بھکارن تھی ..... ننھا بچہ اس کی بغل سے چمٹا ہوا تھا اور اس کے سیاہی مائل سرخ سرخ پاؤں اس کی داغدار اوڑھنی سے باہر کو لٹک رہے تھے۔ بھکارن کے دانتوں پر جمی ہوئی غلیظ کثافت کا خیال آتے ہی اس کے منہ میں تھوک آگیا ...... ہونٹوں پر مسی کی دھڑی دیکھ کر اس نے بغیر کسی کراہت کے تھوک کو حلق کے نیچے اتار دیا۔ جیسے ہونٹوں پر چمکنے والی مسی ..... اس کے گندے دانتوں کی ساری کثافت کا نچوڑ ہے اس چمکیلی مسی کو دیکھتے رہنے سے کتنی خیال انگیز مسرت ہوتی ہے ......!

سینما ہاؤس کے آہنی پھاٹک کے اندر ایک تانگہ داخل ہو رہا تھا۔ تانگے والا فیں میں چابک دبائے پیچھے مڑ مڑ کر جاتی ہوئی بھکارن کے سراپا کو نگاہوں میں جانچتے ہوئے اپنے ایک غنڈے دوست کی پیٹھ تھپک رہا تھا۔

شاباش بیٹا! آج تو خوب ہاتھ مارا تو نے ....

بڑی مہنگی پڑی یار ..... مٹھائی اور چوڑیوں کے ساتھ ادھا بھینٹ چڑھانا پڑا ہے۔

ابے کیوں اڑتا ہے یاروں سے ..... اٹھنی میں ٹرخایا ہوگا۔

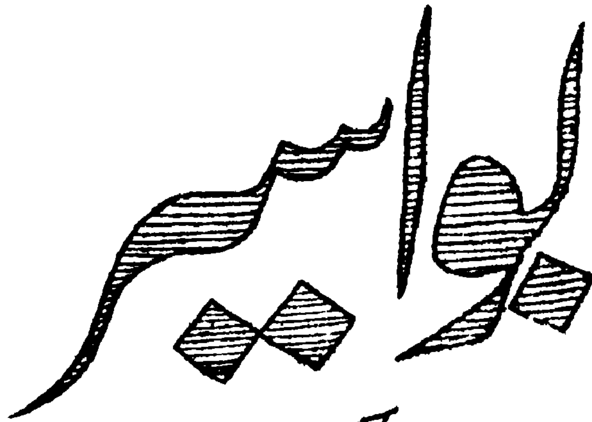
قسم خدا کی ابتو ادھر بھی بلیک مارکیٹ چلنے لگی ہے پرسوں جمو دادا موز بھنا کے پھرے مگر دس روپے سے کم پر کوئی لونڈیا تیار نہیں ہوئی۔

بیٹے دیکھو .... غنڈے نے پریس انسپکٹر کو دیکھتے ہی سانس روک لی۔

کبیر کے اندر ایک لامحدود ٹھہراؤ پیدا ہو گیا۔

کوکب کی تعلیم یافتہ قیصر ... تمر کی شوخ و تنگ رضیہ ..... تاج کی نازک اندام ناہید ..... اور یہ بھکارن ..... سب ایک ہی جنس سے تعلق رکھتی ہیں ...... بلیک مارکیٹ کی جنس .... مہنگائی کا زمانہ ہے۔

اور تمر کی نظریں آپا جی کے ڈریم میں لگی ہوئی "دو بیجوان انڈیانا" کے قد آدم پوسٹر میں جینی کرین کی سڈول مرمریں رانوں پر جم کر رہ گئیں تھی۔



کی

دنیا میں سب سے کامیاب دوا

خونی ہو یا بادی

غرضیکہ کتنی ہی پرانی بواسیر کیوں نہ ہو صرف دو ہفتہ میں قطعی غائب

غلط ثابت کرنے پر سو روپیہ انعام

ہزارہا بواسیر کے بیمار ڈاکٹر اس حیرت انگیز دوا کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں۔ سو فی صدی کامیاب اور حیرت کن یہ جادو اثر گولیاں ہیں۔ جن سے ہزاروں مریضوں نے فائدہ اٹھایا اور جن کے استعمال سے خدا کی قدرت کا کرشمہ نظر آنے لگتا ہے اور مریض کو کلی صحت ہو جاتی ہے۔ تمام ہندوستان میں یہ گولیاں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ حقیقتاً یہ گولیاں ایک بے نظیر ایجاد ہیں۔

قیمت

فی شیشی دو روپے بارہ آنے [illegible]

دہلی کا نامور [illegible] دوا خانہ

انڈو جینوئن کیمیکل ورکس نزد ڈاکخانہ جامع مسجد دہلی۔ فون نمبر ۶۹۲

موج (علیگ)

للکار!

آج بے رنگیٔ گیتی سے ذرا اکتا کر
میں نے تابندہ ستاروں پر اٹھائی تھی نظر
چاہتا تھا کہ اتر جائے شکستوں کی تھکن
ان سسکتے ہوئے لمحات پہ گر جائے کفن
اور یکبارگی پیمانے میں لہرائی شراب
کسی شعلے کی لپک دینے لگا سازِ شباب
کوئی للکار کے بولا کہ ٹھہر دیوانے
ابھی احساس کی قندیل جلی رہنے دے
ابھی کچھ اور سنور نے دے شکستوں کا گداز
ابھی بہتے ہیں یہ آنسو تو انہیں بہنے دے
تو بھی اک پیکرِ غمگیں ہے اسی بستی کا
جس کے سڑتے ہوئے ماحول سے اڑتا ہے دماغ
تو بھی مرجھایا ہوا پھول ہے ویرانے کا
جس کی تدبیر نے پایا نہ بہاروں کا سراغ
ہم بھی بے رنگیٔ گیتی کا گلہ کرتے ہیں،
ہم بھی تیری طرح زخموں کے جلاتے ہیں چراغ
تو نے ساغر تو اٹھایا ہے مگر دیوانے
تو اکیلا تو مسرت سے نہیں جی سکتا
اپنے ہمسایوں کے آنسو تو نہیں پی سکتا
ابھی احساس کی قندیل جلی رہنے دے
ورنہ اک دوست کی غفلت سے شکایت ہوگی
سوچ لے تیری محبت سے شکایت ہوگی

میں نے یہ سنکے وہیں جام و سبو توڑ دیئے

نشور واحدی

تاب و تواں

یہ دورِ فتنہ ہے اے لالہ و گل و نسریں
چمن فروش ہے دنیا چمن پرست نہیں
جھکی ہوئی ہے زمیں پر ابھی گلوں کی جبیں
بہار کیا ہے میں اتنا بتا تو سکتا ہوں

وہی نمو ہے جو ایجاد رنگ و بو کر لے
فسردگی میں تبسم کی آرزو کر لے
مری طرح رگ ہر تار کو لہو کر لے
کہ میں خزاں میں کوئی گل کھلا تو سکتا ہوں

شمیم آئے نہ آئے غبار کیوں آئے
سموم بن کے نسیم بہار کیوں آئے
ہمہ دروغ ہے جلوہ قرار کیوں آئے
فریب رنگ جہاں آزما تو سکتا ہوں

ہزار طور ہیں ایجاد زندگانی کے
ہزار پہلوئے امکاں ہیں دور فانی کے
ہزار ہاتھ ہیں احساس ناتوانی کے
حجاب سعی و تمنا اٹھا تو سکتا ہوں

فشار مرگ کے عالم میں زندگی کا سکوں
غم حیات کی تلخی میں دلخوشی کا سکوں
متاع و جاہ کی محفل میں بےخودی کا سکوں
سکوں نہیں ہے مگر میں بنا تو سکتا ہوں

مرے وجود سے عالم میں انقلاب بھی ہے
کہ ریگزار میں کچھ جنبش سحاب بھی ہے
مری حیات عزائم میں کامیاب بھی ہے
کہ اشک پی کے سہی مسکرا تو سکتا ہوں

محمد احمد سبزواری
ایم۔اے (عثمانیہ)

۱۹۴۶ء کا معاشی پس منظر

دریا بہتا رہتا ہے مگر اس کی روانی معلوم نہیں ہوتی اسی طرح وقت گذرتا رہتا ہے مگر اس کا احساس نہیں ہوتا اور سال ختم ہونے پر ایک دم معلوم ہوتا ہے کہ ہم زندگی کا ایک ورق الٹ گیا جس کے اوراق کی تعداد تک معین ہیں ایک سال کا گذر جانا زبان سے کہدینا بہت آسان ہے مگر ایک سال قوموں کو زندگی کی دوڑ میں کئی سال آگے بڑھا دیتا ہے اور کبھی کئی سال پیچھے ڈھکیل دیتا ہے۔ چنانچہ جب مجھ سے ۱۹۴۶ء پر معاشی حیثیت سے نظر ڈالنے کی خواہش کی گئی تو مجھے کافی الجھن ہوئی کیونکہ اتفاق سے ہندوستان کے واسطے ۱۹۴۶ء کا سال معاشی حیثیت سے کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، دراصل یہ سیاسی سال تھا، مگر آج کل سیاست اور معاشیات میں ایسا چولی دامن کا ساتھ ہو گیا ہے کہ ان دونوں چیزوں کو الگ کرنا ممکن نہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ اس زمانے میں سیاست معاشیات کے محور پر گھوم رہی ہے۔ لہذا اس ذیل میں بعض سیاسی باتوں کا تذکرہ کیا جائے گا اس کا مقصد سیاسی الجھنوں اور پیچیدگیوں میں پڑنا نہیں ہے بلکہ وہ معاشی اعتبار سے اس سال کی عکاسی۔

ہندوستان میں ۱۹۴۶ء کا آغاز قحط، بیماریوں اور خوراک کی قلت سے ہوا۔ ۱۹۴۵ء میں ہندوستان میں جو غذائی بحران تھا اس کے اثرات جنوری اور فروری میں بدستور قائم رہے۔ نصف مارچ سے نئی فصلیں آنا شروع ہوئیں اور حالت کچھ سنبھلنے لگی مگر اس سال بھی ہندوستان کے غذائی مسئلہ کا کوئی مناسب حل تلاش نہ ہوسکا۔ ۱۹۴۵ء کی غیر معین اور غیر وقتی بارش سے ۱۹۴۶ء کی غلوں کی فصلوں اور بالخصوص گندم پر بڑا برا اثر پڑا۔ پنجاب جیسا گندم خیز خطہ بھی کوئی بہت زیادہ معقول مقدار پیدا نہ کر سکا۔ دوسرے مقامات پر بھی فصلیں اچھی نہیں ہوئیں۔ اس وجہ سے وسط سال سے ہی ہندوستان کے بعض حصوں مثلاً جنوبی مدراس، میسور، ٹراونکور اور سی پی کے اکثر اضلاع میں قحط کے آثار نمودار ہونے لگے اگرچہ بنگال کے ہولناک کال نے مرکزی اور صوبہ داری حکومتوں کی آنکھیں اب بھی نہیں کھولی تھیں تاہم اس مرتبہ کسی غفلت اور تساہل سے کام نہیں لیا گیا جس کا مظاہرہ بھوکے بنگال میں کیا گیا تھا مقامی عہدہ داران، مرکزی حکومت کے افسروں، گورنر جنرل اور قومی رہنماؤں نے آغاز ہی میں قحط زدہ علاقوں کا دورہ شروع کر دیا اور تحقیقاتیں کی جانے لگیں۔ کوشش کی گئی کہ آسٹریلیا، کنیڈا، ارجنٹائنا، انڈونیشیا وغیرہ سے گیہوں، چاول، مکا، جو، جئی وغیرہ حاصل ہوتی رہے اور اس میں ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی جس نے صورت حال کو بہت زیادہ خراب نہ ہونے دیا اور یہ سال کشم پشم گذر ہی گیا۔

صوبائی اور مرکزی انتخابات جو جنگ کے زمانے میں سات سال تک رکے رہے ان کا آغاز اگرچہ ۱۹۴۵ء کے آخر میں ہو گیا تھا مگر وہ پورے طور پر ۱۹۴۶ء کے ابتدائی حصے میں مکمل ہوئے۔ ان انتخابات کی سب سے بڑی خصوصیت یہ رہی کہ تمام ملک میں ہندو نشستوں پر کانگریس اور مسلم نشستوں پر لیگ کا قبضہ ہو گیا اور یہی دونوں جماعتیں مرکز میں کامیاب ہوئیں۔ سوائے پنجاب کے ہر جگہ اکثریت نے وزارت سنبھالی اور کامیابی کے نشے نے مخالف پارٹی کو نظر انداز کر دینے پر آمادہ کیا۔ اگرچہ پنجاب میں مخلوط وزارت بنی مگر وہاں بھی صوبہ کی سب سے بڑی جماعت وزارت سے باہر رہی۔ اس وجہ سے جن ہندوستانیوں نے یہ امید باندھی تھی کہ عوامی وزارتیں حکومت کی باگ ڈور ہاتھ میں لیتے ہی ملک کی فلاح و بہبود کے واسطے کوئی ٹھوس کام کریں گی، وہ پوری نہ ہو سکی، اور پارٹیاں آپس ہی میں دست و گریباں رہنے لگیں۔

ادھر انگریز بھی بین الاقوامی حالات کے تحت مجبور ہو رہے تھے کہ وہ ہندوستان کو جلد از جلد آزادی دینے کا وعدہ کرلیں چنانچہ اس کی

غرض برطانوی وزارت نے ایک وزارتی مشن ہندوستان بھیجا جس نے کافی جد و جہد کی کہ ہندوستان کی دونوں بڑی جماعتوں میں صلح ہو جائے مگر کامیابی نہیں ہوئی اور اس نے ایک درمیانی شکل پیدا کر دی جس میں نہ تو مکمل ہندوستان کو مانا گیا اور نہ پاکستان کو تسلیم کیا گیا بلکہ صوبوں کو چند حصوں میں تقسیم کر کے ان کو خود اختیاری کا حق دیدیا گیا کہ اگر وہ چاہیں تو مرکز میں شامل رہیں اور چاہیں تو مرکز سے علیحدہ ہو جائیں، اور ساتھ ہی دس سال کے درمیانی عرصے کے واسطے ہندوستان میں ایک قومی حکومت بن جائے، اور ملک میں ایک دستور ساز اسمبلی بن جائے جو ہندوستان کے آئندہ دستور کا خاکہ تیار کرے۔ کانگریس نے فی الوقت اس تجویز کو نہ مانا اور لیگ نے قبول کر لیا۔ لیکن برطانوی حکومت نے لیگ کو مشترکہ ذمہ داری دینے سے پہلو تہی اختیار کی۔ وزارتی مشن تو ہندوستان سے ناکام واپس چلا گیا مگر بعد میں گورنر جنرل کے بیانات اور وفد کے بعض امور کی تشریح و توضیح نے کانگریس کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ عارضی حکومت میں شامل ہو جائے چنانچہ اگست میں گورنر جنرل کی پرانی کابینا نے استعفیٰ دیا اور دوسری ستمبر کو کانگریس نے ہندوستان کی وزارت سنبھال لی۔ مسلم لیگ نے نہ صرف عارضی حکومت میں شرکت سے انکار کیا بلکہ اس نے براہ راست اقدام کا تصفیہ کیا۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں ابتداً لیگ کو نظر انداز کر دیا اور پھر اسی طرح کانگریس کی وزارت میں شرکت کی دعوت دینا اور اس کا اس دعوت کو قبول کر لینے سے ایک گونہ ذہنی ردعمل شروع ہوا چنانچہ مسلمانوں نے اپنے اپنے خطابات واپس کر دیے۔ تمغے اور سندیں واپس کرنا شروع کیں اور وہ عملی طور پر میدان میں آنے کے واسطے تیار ہونے لگے۔ اس موقع پر گورنر جنرل نے پھر لیگ سے گفت و شنید شروع کی اور لیڈران مسلم کے درمیان علاوہ ازیں نواب صاحب بھوپال نے پوری کوشش کی کہ ہر دو جماعتوں میں کوئی سمجھوتہ اور تصفیہ ہو جائے مگر ان کی ساری محنت اور کوشش بیکار گئی۔ اگرچہ گورنر جنرل کے کہنے سے لیگ نے عارضی حکومت میں شرکت قبول کر لی مگر ہر دو پارٹیوں نے ایک دوسرے سے اشتراک اور تعاون سے گریز کیا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر دسمبر میں کانگریس اور لیگ کا جھگڑا وزارت تو بن گئی لیکن ملک کی قسمت کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ لیگ نے دستور ساز اسمبلی کا بائیکاٹ کر دیا۔ اور اس بنا پر

وزیر اعظم برطانیہ نے ہندوستان کے چار رہنماؤں کو لندن آنے کی دعوت دی، یہ دعوت بھی قبول کر لی گئی، مگر مختتم فیصلہ یہاں بھی نہ ہو سکا۔

کشمکش اور پیچیدگیوں کے اس زمانے میں ملک نے اور پلٹا کھایا اور ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے۔ ان کا آغاز احمد آباد اور الہ آباد سے ہوا، پھر بمبئی اور کلکتہ میں ہنگامے شروع ہوئے کلکتہ کے ہنگامے تو کچھ دنوں کے بعد دب گئے مگر بمبئی میں اب تک فرقہ وارانہ کشیدگی نہ صرف موجود ہے بلکہ بڑھتی ہی جا رہی ہے پچھلے فسادوں میں سوڈا واٹر کی بوتلوں کی جنگ تو سنی تھی مگر اس مرتبہ تو بمبئی میں کھانے پینے کی چیزوں میں زہر ملانے، مسافروں، بسوں اور ٹریموں پہ تیزاب پھینکنے، اور زہریلی گیس تک کے استعمال کرنے کے واقعات اخباروں میں آ رہے ہیں۔ اکتوبر میں بنگال میں نواکھالی اور اس کے متصلہ اضلاع میں باقاعدہ سول وار شروع ہو گئی۔ اخباروں اور ملک کے رہنماؤں نے ان واقعات کو کچھ اس طرح بڑھا چڑھا کر بیان کیا کہ سارے ملک میں فرقہ وارانہ تناتنی پیدا ہو گئی نتیجہ یہ ہوا کہ بہار کے متعدد اضلاع میں اس قدر جوش اور اشتعال پیدا ہو گیا کہ نواکھالی کا انتقام لینے میں کوئی کسر اٹھا کے نہ رکھی گئی وحشت اور بربریت کے ایسے مظاہرے کئے گئے جن پر انسانیت کو بھی شرم آئے، بہار کے ہنگاموں کی آگ کچھ ٹھنڈی پڑی تھی کہ یو۔پی کے قصبہ گڑھ مکتیشر اور اس کے اطراف و اکناف میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ پھیل گئی اور انسانیت کی ہولی کھیلی جانے لگی۔

ہندوستان کے ان ہنگاموں میں کتنے آدمی ہلاک ہوئے اس کا اندازہ مشکل ہے، وزیر ہند کے ایک بیان کے مطابق نواکھالی، بہار اور گڑھ مکتیشر کے ہنگاموں کے علاوہ کل مرنے والوں کی تعداد پانچ ہزار کے قریب ہے نواکھالی، بہار اور گڑھ مکتیشر میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد کچھ اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ اس کے متعلق یہ رائے قائم کرنا کہ کون سے اعداد صحیح ہیں، اور کون سے غلط بڑا مشکل کام ہے بہرحال اگر کم از کم اور زیادہ سے زیادہ دونوں، اعداد کا اوسط ہی رکھ لیا جائے تو ان تینوں مقامات پر ہلاک ہونے والوں کی تعداد بہت کافی ہو جاتی ہے اسی طرح زخمیوں کی تعداد بھی نصف لاکھ کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ مرنے والوں اور زخمیوں کو جو نقصان پہنچا وہ تو الگ ہے

لیکن ان ہنگاموں میں کتنے بچے یتیم ہوگئے، کتنی عورتیں بیوہ ہوگئیں کتنے گھر اجڑ گئے، ان کا اندازہ تو اب تک کیا ہی نہیں گیا۔ معاشی حیثیت سے کتنے خاندانوں کو نقصان پہنچا، کتنے لوگوں کے سرپرست، وہ کفیل تھے، مارے گئے، کتنے گھروں میں آگ لگی، کتنے کا مال جلایا گیا، کتنے کاروبار بیٹھ گئے، ان نقصانات کو روپیہ میں ناپنا ممکن ہی نہیں۔ زخمیوں اور پناہ گزینوں کو غذا، لباس اور دواؤں کی ضرورت ہے۔ ان میں امراض پھیل رہے ہیں ان کی خاندانی اور گھریلو زندگی ختم ہوگئی ہے اسی طرح کی اور مشکلات ہیں۔ جن پر صوبہ واری حکومتیں غور کر رہی ہیں اور عرصہ تک غور کرتی رہینگی۔

یہ سب تو انفرادی نقصانات تھے لیکن ان ہنگاموں سے اجتماعی نقصانات بھی پہنچے، ہندوستان میں احمد آباد اور بمبئی سوتی پارچہ بافی کے بڑے مرکز ہیں، آپس کے فسادات کی وجہ سے اکثر کارخانے کافی عرصہ تک بند رہے یا بہت کم لوگوں کے ساتھ کام کرتے رہے۔ اس طرح کپڑے کی پیدائش میں کافی تخفیف ہوگئی۔ ملک میں زیادہ تر جوٹ کے کارخانے کلکتے اور اس کے گرد و نواح میں ہیں۔ وہاں کے ہنگاموں کی وجہ سے جوٹ اور اس کی مصنوعات میں کمی ہوئی۔ پھر عام تجارت اور کاروبار پر بھی اثر پڑا۔ بڑے بڑے کارخانوں اور فرموں میں نقل و حمل کی دشواریوں کی وجہ سے تیار شدہ مال پڑا ہے۔ اس کی وجہ سے اندرون ملک لوازمات زندگی کی قلت محسوس ہونے لگی۔ اور ان کی قیمتوں میں اضافہ ہونے لگا۔ نواکھالی اور بہار کے ان حصوں میں جہاں فسادات ہوئے وہاں لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر اپنی اور اپنے بال بچوں کی جان اور آبرو بچانے کی خاطر گھر سے بے گھر ہوئے ہیں اور ان میں جو زراعت پیشہ لوگ تھے ان کی [illegible] ہیں یہ لوگ کچھ اس قدر دہشت زدہ ہیں کہ ابھی تک ان میں اپنے دیہات میں واپس آنے کی جرات نہیں۔ اگرچہ صوبہ جاتی حکومتوں نے [illegible] کے ذریعہ ان کی فصلوں کے تحفظ اور کاٹنے کا انتظام کر دیا ہے [illegible] سے صرف ضائع ہو جانے والا غلہ کا بڑا حصہ تو محفوظ ہو جائے گا مگر مالکوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچیگا۔ کیونکہ اول تو اتنے عرصہ تک عدم [illegible] کی وجہ سے فصلوں کو جو نقصان پہنچ چکا ہے اسکی تلافی ممکن نہیں دوسرے انتظامات ابھی عمل میں لائے جا رہے ہیں۔ ان کے مصارف مالکوں سے وصول کر لئے جائیں گے۔

ان حالات میں جو حکومت بھی برسر اقتدار آتی اس کو فسادوں دستوری مسائل اور آپس کی نوک جھونک سے اتنی فرصت کہاں مل سکتی ہے کہ وہ تعمیری کاموں کے واسطے وقت نکال سکے مرکزی اسمبلی کے خزاں کے سیشن میں لیگ اور کانگریس کے مشترکہ طور پر وزارت میں آجانے سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ کاروائی جلد جلد ہونے لگی اور حکومت کے بہت سے قانون یا تجویزیں معمولی سی بحث و مباحثہ کے بعد منظور ہوگئیں گذشتہ سال ہندوستان کے صنعتی کارخانوں میں ہڑتالیں عام رہیں ان کو روکنے اور مزدوروں کی بہتری کے واسطے چند قوانین زیر بحث لانے گئے، اس کے ساتھ صوبوں کے وزیر مزدوروں، ریاستوں کے وزیروں کی کانفرنسیں بھی ہوئیں مزدور اور مالکان کارخانہ کے نمائندوں کی ایک کانفرنس بھی ہوئی تاکہ سب کے مشورہ سے نہ صرف برطانوی ہندوستان (یہی اس لفظ کا استعمال صحیح ہے) بلکہ ریاستوں میں بھی مزدوروں کی فلاح و بہبود کے واسطے کوئی بھلائی قدم اٹھایا جاسکے۔

گذشتہ سال کے وسط میں ہندوستان کی ریلوں میں کام کرنے والوں نے اپنی تنخواہ، اجرت اور گرانی بھتہ میں اضافہ کی درخواست دی، ریلوے بورڈ نے ان کے مطالبات ماننے سے انکار کیا اور اس بنا پر ہڑتال کا نوٹس دے دیا گیا۔ بعض ریلوں میں جزوی ہڑتال شروع بھی ہوگئی غذا اور کوئلے کے علاوہ دوسری چیزوں کی آمد و رفت عارضی طور پر ملتوی کرنا پڑی مگر بعد میں آپس میں مصالحت ہوگئی اور سارے ملک میں وسیع پیمانے پر کوئی ہڑتال نہ ہوسکی۔ تقریباً اسی قسم کے مطالبے ڈاک و تار کے محکموں کے ملازمین کی جانب سے پیش کئے گئے۔ ملک کے مختلف حصوں میں جزوی ہڑتالیں ختم ہوگئیں ان دونوں ہڑتالوں نے صرف عارضی طور پر ملک کی معاشی زندگی کو متاثر کیا اور ان کے نتائج کچھ دور رس اور دیرپا نہیں ہوئے۔

گذشتہ چند دنوں سے جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے خلاف جو قوانین بن رہے تھے ان کا ملک پر بڑا سخت ردعمل ہوا اور خصوصاً اقوام کی اسمبلی میں سیاسی حیثیت سے ہندوستان کا مقدمہ لڑنے کی جو کوشش کی جا رہی ہے جس میں کچھ کامیابی بھی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ جنوبی افریقہ سے تجارتی تعلقات منقطع کرلئے گئے، آسٹریلیا کا ایک تجارتی وفد ہندوستان آیا تاکہ ہندوستان اور آسٹریلیا کے درمیان تجارتی تعلقات میں وسعت ہوسکے۔ ہندوستان کے بہت سے صنعتی رہنما [illegible] امریکہ گئے تاکہ وہاں سے کارخانوں کے واسطے [illegible]

اس میں ان کو کامیابی بھی ہوئی۔

ہندوستان کی موجودہ حکومت کو فی الحال ۔۔ وقت قبل تھا کہ وہ ملک کی اہم ترین یا کلیدی صنعتوں سے متعلق کوئی پالیسی وضع کرے ہوائی جہاز کی صنعت کو قومی ملکیت بنانے کا مسئلہ زیر غور ہے ۔ ریلوں میں سہولتیں اور آسانیاں بہم پہنچانے کے ذرائع پر بھی غور کیا جا رہا ہے۔ اسی کے ساتھ مسافروں اور نقل و حمل کے کرایوں کی شرح میں اضافہ کا رجحان بھی پایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں نئے نئے کارخانے کھولنے کا مسئلہ بھی زیر غور ہے اور امید کی جاتی ہے کہ اس سال پانچ بانی کے کارخانوں میں نہ صرف وسعت دی جاسکے گی بلکہ متعدد نئے کارخانے بھی کھل جائینگے۔

صوبوں میں گذشتہ سال کا سب سے اہم واقعہ یو۔پی میں زمینداری نظام کے خاتمہ کی تجویز ہے۔ زمینداری نظام دراصل قدیم جاگیرداری نظام کا ایک جزو تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ زمین کا ایک [illegible] ہے اور جو کاشتکار اس پر کاشت کرتا ہے اس کی حیثیت ایک کرایہ دار کی سی ہے۔ جس سے مالک جو چاہے رقم وصول کرسکتا ہے مگر حکومت کو وہ ایک معینہ رقم ہی ادا کرتا ہے۔ گویا زمیندار حکومت اور کاشتکار کے درمیان ایک واسطہ کا کام کرتا تھا۔ یہ زمیندار صرف یہی نہیں کرتے تھے کہ وہ کاشتکاروں سے بہت زیادہ لگان وصول کرتے تھے بلکہ طرح طرح کے ٹیکس وغیرہ بھی عائد کر رکھے تھے اور ان سے نذر، نذرانہ اور اسی قسم کے دوسرے ناموں سے کافی رقم وصول کرتے تھے، جب یو۔پی کی مجلس مقننہ میں یہ مسودہ قانون پیش ہوا تو اس کی بڑی مخالفت ہوئی، مخالفت میں مسلم لیگ سب سے زیادہ پیش پیش تھی اور اس کی دلیل یہ تھی کہ زمینداری کے خاتمے کے ساتھ ہی دوسرے سرمایہ دارانہ نظاموں کو بھی ختم کیا جائے مثلاً کارخانوں، بنکوں اور دوسرے کاروباروں کو بھی قومی ملکیت بنا دینا چاہیئے۔ لیگ کی دلیل مضبوط ضرور تھی مگر حکومت زمینداروں کے ساتھ ہی ساتھ دوسرے عناصر کو اپنا مخالف بنانا نہ چاہتی تھی۔ اس وجہ سے اس نے اپنی تجویز میں ترمیم منظور نہ کی [illegible] یہ مسودہ منظور ہوگیا۔ اگرچہ مسودہ منظور ہوگیا مگر ابھی حکومت نے زمینداری کو ختم کرنے کے واسطے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا۔ ادھر زمیندار برابر اس کوشش میں مصروف ہیں کہ وہ اس قانون کو ملتوی یا منسوخ کرا دیں۔ دوسری اہم چیز چند صوبوں کے بعض اضلاع میں ترک منشیات [illegible] ہے۔ ان میں مدراس صوبہ تھا جہاں ۱۹۳۵ء میں پورے ایک ضلع کے اندر اس اسکیم کا تجربہ کیا گیا تھا [illegible]

میسور کو بھی اپنی کل ریاست میں سیندھی، تاڑی اور شراب وغیرہ کے استعمال کی ممانعت کردے۔

ان حالات میں ۱۹۴۶ء ختم ہوگیا اور ۱۹۴۷ء آگیا۔ فی الحال سنئے سال سے ہمیں کسی اچھی اور خوشگوار چیز کی توقع معلوم نہیں ہوتی بلکہ اس وقت کے سیاسی افق پر جو بادل چھائے ہوئے ہیں ان سے تو یہ مترشح ہوتا ہے کہ ۱۹۴۷ء کہیں ۱۹۴۶ء سے زیادہ ہولناک ثابت نہ ہو خدا کرے کہ ہمارا یہ خیال صحیح ثابت نہ ہو۔

میکش حیدرآبادی

کرنیں اور سائے

کچھ آنسو پلکوں سے ڈھلکے کچھ ہمدم تارے ٹوٹ گئے
لو! صبح نے ہم کو چھین لیا ظلمت کے ساتھی چھوٹ گئے

پہنچوں میں مشینیں چلتی رہیں آہوں میں فصلیں کٹتی رہیں
اب کے بھی پرانے ڈاکو ہی مفلس کی پونجی لوٹ گئے

طوفانوں سے لڑنے والا ساحل کی طرف بڑھتا ہی رہا
ناہروں کے چھوٹے دو چار گھروندے ٹوٹ گئے

منزل کی طرف بڑھنے والا کیا سوچے گا کیوں جانے گا
آبلے ننگے تلووں پر کب آئے اور کب پھوٹ گئے

کیوں دیکھے ٹوٹی زنجیروں پر تیشہ زنی کرنے والا
ریشم کی پھندوں میں الجھ کر کتنے ساتھی چھوٹ گئے

بیدار سی اک مدہوشی میں رندوں نے پھر کروٹ بدلی
کچھ جام چھلک کر منہ سے لگے کچھ خالی ساغر ٹوٹ گئے

نورس کلیاں تو جاگ اٹھیں نوخیز بہاریں تو آئیں
اچھا ہی ہوا مرجھائے ہوئے کچھ پھول خزاں [illegible] لوٹ گئے

بڑھتے قدموں نے دیکھا [illegible] دھندلی دھندلی سرحد پر
کچھ زندہ کرنیں ساتھ ہوئیں کچھ مردہ سائے چھوٹ گئے

انتباہ

اسد بھوپالی

عفریتِ ظلم و جبر کے خونخوار ساتھیو !
انسانیت کی لاش سے کچھ اور کھیل لو !
ہاں آؤ اے حکومت و زر کے پجاریو !
اجسام فاقہ کش سے بہر طور کھیل لو

کچھ اور ڈوب جاؤ نشاط و سرور میں
کچھ اور بھی بڑھاؤ تمنائے تخت و تاج
تاریکیٔ شب نمودِ سحر کے قریب ہے
مظلوم زندگی کا لہو رقص میں ہے آج

یہ آج بڑھ ہی جائیگا شدادیت کا زور
یا دورِ امن آئیگا لے کر حیاتِ نو
یا آج چھا ہی جائیگی ہر شے پہ بےحسی،
یا انقلاب ہوگا۔ پئے کائناتِ نو

کوثر چاندپوری

ہے بھگوان

وہ منڈوے پر بیٹھی مکا کے کھیت کی رکھوالی کر رہی تھی۔ ساون کا مہینہ تھا۔ بارش تین دن سے برابر مینہ برس رہا تھا۔ اندھیری رات میں ندی کے پانی اور طوفانی ہوا اور کا شور پہاڑوں کی ابھرتی ہوئی چوٹیوں کو بادلوں کی گاڑھی چادر نے ڈھک دیا۔ بجلی چمکتی تو منظر دکھائی دیتا ہوا دور نکلتا جا رہا تھا اور تنگے بادلوں میں اس طرح تحلیل ہو جاتا جیسے کوئی ویرانہ اور سنسان حویلی کا آخری دیا بجھ جانے کے بعد روشنی کا نام و نشان تک باقی نہ رہے۔ ندی جب طوفان پر ہوتی تو [illegible] چلی ہوئی تھی تاکہ وہ جو آتا بہا لے جائے [illegible] شہر گئے تھے وہ لوٹ کر ندی کے اس پار اٹکے ہوئے تھے۔ ان میں کے اکثر من چلے مگر وقت گزار رہے تھے اور ندی اپنے کنارے کے درختوں کی بیلوں کو چھوتی اور جھاگ اگلتی بہتی چلی جا رہی تھی۔ جب ہوا کا کوئی تیز جھونکا آتا تو درختوں کا پیڑ اس سرے سے اس سرے تک جھک جاتے اور ہوا کی سنسناہٹ اور ندی کی لہریں سرگوشیاں کرتی ہوئی پہاڑوں سے ٹکرا کر فضا میں غائب ہو جاتیں۔ کبھی کبھی جوگے گیدڑوں کا غول کھیت پر حملہ کرنے کی کوشش کرتا اور وہ زور زور سے پیپا بجانے لگتی۔ آس پاس کے کھیتوں میں بھی پیپے بجنے لگتے اور ان کی جھوبری آوازیں بھی پہاڑوں کی بادلوں سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں میں جذب ہو جاتیں۔

وہ پیپا بجائے جا رہی تھی اور بھیگے ہوئے کپڑوں کی ٹھنڈک بار بار اس کے سانس میں نشتر سے چبھو رہی تھی۔ اس کے تصورات ماضی کے دھندلکوں میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہے تھے اور شعوری قوتیں آپ ہی آپ دبتی جا رہی تھیں۔ اک بات اسے یاد آیا کہ اب سے دو سال پہلے جب وہ نئی نئی بیاہی آئی تھی۔ اس کے شوہر پرشاد نے اسی منڈوے پر بیٹھے بیٹھے بیڑی جلاتے ہوئے کہا تھا۔ رات کے وقت بھیگے ہوئے کپڑے نہیں پہنا کرتے۔ انہیں اتار ڈالو!

اور اس نے دیا سلائی کے ننھے سے شعلے کی روشنی میں اس کی چمکیلی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کا جوار بھاٹا سا دیکھ کر بیزاری سے کہا۔ دیا تھا اور نہ کیا ہوتا ہے؟ سردی ہو جاتی ہے باؤلی۔ اس نے ذرا قریب کو کھسکتے ہوئے کہا تھا اور پھر وہ دونوں رات بھر منڈوے کی لچکدار لکڑیوں پر لیٹے رہے تھے ان کے نیچے گیلا بستر بچھا ہوا تھا اور پانی کی بوچھار گھاس کی بھیگی ہوئی ٹٹیوں کے باریک سوراخوں سے گذر کر [illegible] تھی۔ جو کپکپی پیدا کرتی تھی مگر ان کے جان جسموں کی گرمی نے جلد ہی بستر کی [illegible] میں ایک انجانی نور پیدا کر دی تھی جو آگ دھوپ سے کبھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ پرشاد کے سینے کا تو [illegible] رات بھر اس کی چھاتیوں کے معصوم ابھاروں پر لوٹتا رہا تھا اور [illegible] سانس کی حدت پرشاد کے خون میں روانی پیدا کرتی رہی تھی۔ کیا دن تھے؟ —— ایک برسات عمر میں ایک ہی دفعہ آتی ہے۔ وہ اندھیری راتوں سے [illegible] تی اندھیرے میں [illegible] کرتا تھا کہ اس مان پر [illegible] راتیں کیسی سہانی ہوتی ہیں۔ ایک مرتبہ [illegible] تو کہتا نہیں [illegible] اپنی چاندنی راتوں میں [illegible] ہونے لگتی تھی [illegible] لیٹے پرشاد سے [illegible] بجلی کڑک رہی ہے!

وہ کہتا ہہ منڈوے ہی پر گرتی اور دیر تک ان کے جسموں کی [illegible] کھنکتی ہوئی صدائیں دور جا کر ساون کے نغموں میں [illegible] تھیں۔ پرشاد کا [illegible] ہوا سینہ اس کی کسی ہوئی انگیا کی تھرتھراہٹوں کو جذب کرنے لگتا اور ان کے لمبے لمبے سانس اس طرح آپس میں ٹکرانے لگتے جیسے پروا کے جھونکے پچھوا کے جھونکوں سے ٹکرانے لگتے ہیں۔ ایسی برسات بس ایک ہی دفعہ آئی اس نے چھاتی میں درد کی کسک کا احساس کرتے ہوئے سوچا اب جیون میں کبھی وہ سکھ نصیب نہ ہوگا۔ اس نے سوچا کہ ایک مرتبہ برسات میں وہ شہر سے مٹی کا تیل لینے چلا گیا تھا اور ندی چڑھ جانے

کی وجہ سے آدھی رات تک سامنے والے میل کی جھڑ میں بیٹھا گاتا رہا تھا اس کی میٹھی میٹھی تانوں سے آتا کا مرجھایا ہوا پھول ایک دم کھل گیا تھا اور کئی بار اس نے چلا کر کہا تھا پیڑ کے نیچے سے ہٹ جاؤ۔ ہوا بہت تیز چل رہی ہے! ———— مگر یہ آواز پرشادی تک نہ پہنچ سکی تھی وہ وہیں بیٹھا برابر گاتا رہا تھا ———— رم جھم مینہا برسے!

رات کو جب کسی وقت ندی ازگئی تھی تو دھیرے دھیرے کیچڑ کھوندتا ہوا منڈوے کی طرف بڑھنے لگا تھا ہوا بہت زور سے چل رہی تھی آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بڑی سخت اندھیری تھی ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا چپ چپ کی کھاٹ میں سن کر وہ چونک گئی تھی اور سہم کر اس نے پیپہ بجا دیا تھا۔ پرشادی ہنسی ضبط نہ کر سکا تھا اور منڈوے کی موٹی لکڑی پکڑ کر وہ ایک ہی جھلانگ میں اوپر آگیا تھا اس کے منہ سے مونگ پھلی کی بھینی بھینی بو سونگھ کر جلدی سے اس نے پرشادی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر مٹھی بھر مونگ پھلی نکال لی تھیں پھر دیر تک وہ دونوں ساتھ مونگ پھلیاں کھاتے رہے تھے اس نے جھلکی لے کر پرشادی سے کہا تھا . . .

. . . . . رات کو گیلے کپڑے نہیں پہنا کرتے انہیں اتار ڈالو۔

پھر پرشادی نے لیٹتے ہوئے پوچھا تھا ڈر تو نہیں لگا تجھے؟ کیا کرتی بھاگتے بھاگتے تھک گیا پھر بھی ندی میں پانی آہی گیا تیل کی بوتل ہاتھ میں نہ ہوتی تو کبھی کا آگیا ہوتا میں تیر کر، اسی وقت ایک گیدڑ منڈوے کے نیچے چیخنے لگا تھا اور وہ ڈر کر پرشادی سے چمٹ گئی تھی، پرشادی نے ہاتھ بڑھا کر پیپہ بجا دیا تھا سب لوگ سوتے رہتے ہیں، رات کو مکا کے بہت سے پیڑ گیدڑوں نے توڑ ڈالے تھے اور اس کے سسر نے گھر سے آکر جبار آواز سے کہا تھا۔ پرشادی رات بھر سوتا ہے۔ جب ہی تو یہ پیڑ توڑ ڈالے گیدڑوں نے میرا کیا ہے بھگتنا تجھے ہی پڑے گا . . . . ———

اور بالکل یہی ہوا جب کھیت کٹا اور کھیتوں سے دانے نکل لئے تو پچھلے سال کے مقابلے میں آدھی پیداوار بھی نہیں کتی پھر لڑائی کی وجہ سے مہنگائی بڑھنے لگی۔ دو بیل مر گئے۔ ایک گائے بیمار ہو کر دودھ سے بھاگ گئی۔ اس کی جھیا سوکھ کر کانٹا ہو گئی اسی سمے چوکیدار نے گاؤں کے آدمیوں کو فوج میں بھرتی ہونے کے لئے اکسایا۔ اس نے کہا۔ شہر میں بھرتی کا دفتر کھل گیا ہے اور سرکار بڑی بڑی تنخواہ پر رنگروٹ بھرتی کر رہی ہے بہت سا روپیہ پیشگی بھی ملتا ہے۔ تنخواہ الگ ملے گی اور کھانا کپڑا سب سرکار کے ذمہ ہوگا۔ پرشادی بھوک، مہنگائی اور مہاجن کی روز روز کی ڈانٹ پھٹکار سے تنگ آکر فوج میں بھرتی ہونے کو تیار ہو گیا۔ اور ایک دن وہ اپنی میلی دھوتی اور قمیض کو یوں ہی بغیر صابون کے ندی میں دھو کر جلدی جلدی سکھا کر شہر چلا ہی گیا۔ شام تک وہ لوٹ کر نہ آیا تو اس کی چھاتی میں ہوکیں اٹھنے لگیں ایسا لگنے لگا جیسے بہت دنوں کے بعد آج اسے ہولدلی کا دورہ پڑ جائے گا۔ وہ سوچنے لگی کہیں چوکیدار نے اسے دھوکہ سے پکڑوا تو نہیں دیا یا سرکار نے زبردستی اسے ریل میں بٹھا کر لڑائی پر تو نہیں بھیج دیا وہ جس قدر سوچتی تھی اسی قدر اس کا دل دھڑکتا اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں جھلکنے لگتیں مگر دن چھپنے کے دو گھڑی بعد جب گیہوں کے ہرے کھیتوں میں سارس محبت کے گیت گا رہے تھے اور چکوا چکوی کے پریم بھرے نغمے فضا میں گونج رہے تھے پرشادی ہنستا ہوا گھر میں آگیا تھا اس کے ہاتھ میں دو نئے کاغذ تھے اس نے خوشی کے ساتھ اپنے باپ سے کہا تھا میں بھرتی ہو گیا ہوں چوکیدار کو یہ کاغذ دے دوں گا وہ لکھا کے دستخط کرا کر انہیں بھرتی کے دفتر میں دے آئے گا۔ کڑوے تیل کے دیئے کی مدھم روشنی میں وہ کٹھیا کی آڑ سے جھانک کر پرشادی کے خوشی سے چمکتے ہوئے چہرے کو دیکھ رہی تھی اس کا دل اور زور سے دھڑکنے لگا تھا اب تک وہ یہی سمجھ رہی تھی پرشادی ایسے دبلے پتلے آدمی کو فوج میں کون بھرتی کرے گا وہ یوں ہی لوٹ آئے گا مگر . . . رات کی اندھیری راتوں میں بھی وہ دونوں منڈوے پر پیپہ بجایا کریں . . . شادی کے منہ سے یہ باتیں سن کر اس کے سارے بدن کی جان نکل گئی۔ ہاتھ پاؤں سن ہو گئے جیسے کسی نے بہت سی افیون کھلا دی ہو اس . . . کاغذ میں لپٹی ہوئی دو تین جلیبیاں پرشادی نے اس کی طرف بڑھا دی تھیں . . . نہیں لے کر کتنی خوش ہوئی تھی اس دھڑکے کی موجودگی میں بھی کہ پرشادی . . . دن کے بعد چلا جائے گا اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں ————

بڑا بے رحم ہے وہ نہیں مجھ سے ———— یہ سوچ کر وہ کچھ اترا سی گئی تھی اور اس کے کانوں میں غریب بہن کی وہ چیخیں گونجنے لگی تھیں جو تقریباً روز ہی پتی کی مار کھا کر اس کے منہ سے نکل جایا کرتی تھیں وہ بڑی بدگمان ہے۔ یہ سوچتے سوچتے اس نے ایک ٹھنڈی اور لمبی سانس بھری جلیبی کو دانتوں سے کاٹا مگر کیا اثر دیکھا تھا کتنی مٹھاس تھی ان جلیبیوں میں جلیبیوں کی یہ مٹھاس زبان سے روح تک پھیلتی چلی گئی تھی اور اس وقت ہولدلی کا دورہ بالکل ہی ٹل گیا تھا۔

اگلے دن چوکیدار نے بھرتی کے کاغذوں پر مکھیا کی تصدیق کرا کر انہیں دفتر میں بھیج دیا اور دوسرے ہی ہفتے میں پرشادی کو شہر بلایا گیا۔ جہاں سے اسے کچھ روپیہ پیشگی مل گیا تین چار گھنٹے کے بعد وہ بہت سے سفید سفید نوٹ لے کر لوٹ آیا۔ آتے ہی اس نے کہا ——حکم مل گیا نوکری کا بھرتی کے دفتر سے پرسوں میں یہاں سے چلا جاؤں گا اپنی نوکری پر اتنے سفید اور اتنے بہت سے نوٹ ساری عمر میں پہلی بار ہی اس نے دیکھے تھے جب باپ کے کہنے سے پرشادی نے یہ نوٹ رکھنے کو دئے تو نہ جانے کیا . . .

بھیگی تھی اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو نکلکر گالوں پر بہنے لگے تھے.... وہ چلے جائیں گے....... کیا اگلی برسات میں وہ اکیلی ہی منڈوے پر بیٹھی پپیہہ ڈر بھگایا کرے گی. مگر وہ اکیلی رہنے کو وہاں کیونکر رہ سکے گی؟... .... وہ سپھر مکھیا کا بڑا لونڈا رام سرن کیونکر اسے چھین لینے دیگا. مقدر بھی پانی لانے وقت کبھی کبھی اسے دیکھ کر زور سے ہنس دیا کرتا ہے رام سرن کا خیال آتے ہی اسے عجیب قسم کی الجھن سی ہونے لگی طبیعت گھٹنے لگی. جیسے کوئی زہریلی چیز اس نے نگل لی ہو. اس نے بڑی بے دلی سے ان سفید نوٹوں کو تانبے کی کوٹھی میں ڈالدیا تھا ویسے ہی بلا کسی احتیاط کے جیسے ان کی کوئی قیمت ہی نہیں اور اس کی زندگی کو ان سفید نوٹوں سے کوئی تعلق ہی نہیں.

دوسرے دن پرشادی نے گاؤں کے بنئے کا قرضہ چکا دیا. مہاجن کے روپے بھی بھیجدیے اور لگان بھی اپنے بوڑھے باپ کو دیکر کہہ دیا کہ تحصیل کے سپاہی کو دے دیا جائے قرض کا بوجھ سر سے اتر جانے کے بعد اس کے بوڑھے باپ کی سوکھی ہوئی رگوں میں ندی کے سے طوفان آنے لگے اس کا چہرہ پھول کی طرح کھل گیا اور دانتوں کی بے ترتیب جھنگوں میں اس نے جھکے جھکے پرشادی کی کمر ٹھونک کر کہا جیتے رہو بیٹا! پھر ایک دن سویرے ہی پرشادی پرانے کپڑوں کی چھوٹی سی گٹھڑی لے کر شہر چلا گیا اور وہ ندی کے اونچے کنارے پر کھڑی پنجوں کے بل ابھر ابھر اسے دیکھتی رہی تھی وہ بھی پھر پھر کر اسے تک رہا تھا. جیسے کوئی چیز اس کے پاس بھول گیا ہے جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا اسے ایسا محسوس ہوا کہ سورج ڈوب گیا. پر گاؤں بھر میں اندھیرا چھا گیا. چوتھے پانچویں دن پرشادی کے خط آتے رہتے وہ ندی پر نہاتی، اور کوٹھی کی آڑ میں چولہے کے پاس بیٹھ کر چپکے چپکے روتی رہتی اس کا سسر کھانس کھانس کر بلغم اگلتا رہتا اور وہ آنسو بہاتی رہتی. ٹھنڈے اور موٹے آنسو. ایک دن پرشادی کا خط آیا اس نے لکھا تھا وہ اسی مہینے سمندر پار جا رہا ہے یہ نہیں معلوم کہاں جا رہا ہے مگر خط اسے ملتے رہینگے

ذرا ٹھہر کر اس نے سوچا خط سنتے ہی اس کی رگوں میں خون جم گیا. احساس میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی. یوں محسوس ہوا جیسے پرشادی کو اس سے چھین کر کوئی لئے جا رہا ہے سال بھر کے بعد خط آنے ایکدم بند ہو گئے تھے ادھر رام سرن نے اسے تنگ کرنا شروع کر دیا یوں تو پرشادی کے جاتے ہی وہ اودھم مچانے لگا تھا مگر اب تو کچھ دنوں سے بری طرح اس نے آگ موتنی شروع کر دی. اسے پتہ چل گیا کہ پرشادی کے خط آنے بند ہو گئے ہیں اور وہ بالکل بے سہارا ہو گئی ہے اس کا بوڑھا سسر رام سرن سے آنکھ ملانے کی ہمت ہی نہیں کر سکتا اور کوئی گاؤں میں ایسا ہے نہیں جو رام سرن کے برے کرتوتوں پر انگلی اٹھا سکے وہ مکھیا کا بیٹا تھا.

سب اس سے ڈرتے تھے. جاڑے بیتے گرمیاں آئیں. گرمیاں گئیں برسات آئی مگر پرشادی کا خط نہ آنا تھا نہ آیا. اساڑھ کا مہینہ لگتے ہی اس کے سسر نے کھیت میں ہل چلا کر مکا بودی اور چوتھے پانچویں دن گیلی زمین سے بے شمار سوئیاں پھوٹ نکلیں جو بڑھتے بڑھتے ہرے بھرے پیڑوں میں تبدیل ہو گئیں. تب کھیت کے بیچ میں منڈوا ڈالا گیا اس پر ڈھاک کی چند گیلی اور سیدھی لکڑیاں ڈالکر ذرا سی گھاس پھونس چھا دی گئی ایک ٹوٹا ہوا زنگ آلود پیپہ کہیں سے لاکر اس کے سسر نے چھت کی ایک لکڑی میں ٹانگ دیا.

.... رام سرن کے ڈر سے اس نے بہت چاہا کہ اپنے سسر سے کہدے کہ وہ اکیلی رات کو منڈوے پر نہیں رہ سکتی مگر ایسا کہتے ہوئے اسے کچھ شرم سی آئی. بوڑھا سسر ویسے ہی دمہ کا مریض تھا. وہ مینہ بوندی کے ان دنوں میں کیونکر منڈوے پر بیٹھ سکے گا برسات کی بھیگی ہوئی ہوائیں ایک ہی دن میں اسے موت کے گھاٹ اتار دینگی وہ کھانستے کھانستے مر جائے گا اور کوئی گھر میں تھا نہیں ساس بھی ہوتی تو وہ صاف صاف اس سے کہہ دیتی. سسر کے سامنے تو اس کی زبان کھلنے سے رہی. آخر ایک دن سورج ڈوبتے وقت وہ منڈوے پر جا بیٹھی رام سرن تو پہلے ہی سے تاک لگائے تھا وہ کئی دفعہ کھانستا ہوا اس کے کھیت کی مینڈ سے گذرا اور ہر مرتبہ اس کا دل دھک سے ہو گیا. وہ پیپہ بجا کر گیدڑ بھگاتی رہی. پیپہ بجاتے بجاتے آپ ہی آپ گذری ہوئی برسات کی سہانی یاد اس کے لاشعور سے نکل کر حافظہ میں رینگنے لگی اور وہ ان میٹھی اور سنہری راتوں میں کھو گئی جب پرشادی اور وہ دونوں منڈوے کی ان لکڑیوں پر لیٹے رہتے تھے اس وقت تو یہ لکڑیاں کبھی اس کے نہ چبھتی تھیں ابکے تو نہ جانے کیا بات ہے یہ رات بھر یوں ہی چبھتی رہتی ہیں ندی چڑھی ہوئی تھی. بادل گھور رہا تھا اور دور ندی کے اس پار گاؤں کے لوگ بیٹھے گا رہے تھے

"رم جھم مینہا برسے"

ماضی کی یاد اس کی رگوں میں کروٹیں لے رہی تھی وہ پیپہ بجا رہی تھی.

مگر اس کی جھرجھری آوازوں میں اب وہ رس اور ترنم نہ تھا وہ گیت کے بے بوجھ سے بالکل خالی ہو گئی تھی بھیگی ہواؤں میں بھی اب وہ گرماکی سی مٹھاس باقی نہ رہی تھی بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور بجلیوں کی کڑک نے ساز بجانا چھوڑ دیا تھا مینہ کی بوندوں میں زندگی نہ رہی تھی اور پہاڑ کی بادلوں سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں تو بری طرح اسے گھورنے لگی تھیں وہ رام سرن کی نگاہوں سے بھی زیادہ بھیانک ہوتی جا رہی تھیں جہاں تک روٹیوں کا سوال ہے اس کی زندگی اتنی کٹھن نہ رہی تھی دونوں وقت پیٹ بھر کر روٹی مل جاتی تھی مگر وہ اپنے جیون کو اجاڑ بالکل اجاڑ اور سنسان خیال کرنے لگی تعجب تک پرشادی کے خط آتے رہے تھے بیتے ہوئے دنوں کی یاد میں اجالا باقی تھا خطوں کے بند ہوتے ہی ان میں بھی اندھیرا چھا گیا تھا وہ قریب کے ان دنوں کو بھول

یاد کرتی تھی جب پرشادی کا نمک پاس تھا اور پیٹ کی جھوجھری کا ذائقہ دیر تک رس بکھیرتی چلی جایا کرتی تھی۔ مینھ کی بوندوں میں زندگی کا رس وہ برس برس کر اس کی امنگوں میں اور زیادہ جان ڈالا کرتی تھیں۔ بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور بجلی کی چمک میں مسکراہٹیں بھری ہوئی معلوم ہوا کرتی تھیں۔ سچ مچ اس کی دنیا ویران ہو گئی تھی۔ زندگی برا درس چھوڑ گئی تھی اور جوانی اجڑ گئی تھی۔ اس کی بہاروں میں خزاں آگئی تھی مستقل نہ ختم ہونے والی خزاں اور نہیں ویرانیوں اور اداسیوں بھری۔

ایک بے رونق سی شام کو جب سورج نیچے کی طرف ڈھلتا ہوا مرجھا رہا تھا۔ منہ چھپانے جا رہا تھا رام سرن منڈوے کے پاس سے گنگناتا ہوا نکلا اور مڑ مڑ کر اس کی طرف دیکھتا گیا۔ اس کے بعد بھی اس نے کئی چکر لئے اور ایک مرتبہ کھیت کے منڈھے پر کھڑے ہو کر ایک میٹھی سی تان لگائی۔

من کی بات سناؤں کس کو کون سنے گا من کی بات
گھنڈی کی بول بھلیاں اور بھیانک کالی رات
بادل گرجے بجلی چمکے اور بھری برسات

اس وقت تو اس تان میں اس کے لئے کوئی کشش نہ تھی مگر تھوڑی دیر بعد ہی پپیہا بجاتے بجاتے رام سرن کا یہ میٹھا میٹھا گیت اس کے احساس پر مٹھاس برسانے لگا اور وہ کہیں بیٹھا گا رہا تھا۔

بادل گرجے بجلی چمکے اور بھری برسات

آپ ہی آپ پپیے کی جھوجھری آواز ولت ایک نغمہ سا نکلنے لگا بوندوں میں جان پڑ گئی۔ اور بجلی کی چمک سے امنگوں کی جوت سی ہوتی ہوئی معلوم ہونے لگی دیر تک وہ ایک گہرے اور مرشے دار سوچ میں ڈوبی رہی آخر منڈوے پر پڑے پڑے اسے نیند آگئی۔ سوتے ہی اس نے خواب میں دیکھا تین گیلے اس کے صحن میں آ گھسے ہیں اور پھر چھنٹے چلاتے۔ وہ ایک کمرہ میں چلے گئے جہاں کئی وقت اس کا آنگن کو آگئی اور بچے پی کے ساتھ وہ رات کی اندھیری میں زندگی کی بہاریں ڈھونڈنے لگی اس کا دل زور زور سے اچھل رہا تھا اور رگوں میں طوفان سے بھرتے جا رہے تھے جیسے خون کی جگہ پھڑ پھڑا کی چنگاریوں کو چھوتی اور جاگ لگتی ندی اس کی رگوں میں دوڑ رہی ہو اور پھر رام سرن کا اپنے کانوں میں گونجنے لگا

من کی بات سناؤں کس کو کون سنے گا من کی بات

اسی لمحہ چپ چپ کی وہی انداز آواز میں جو پہلی برسات میں پرشادی کے کیچڑ میں پہو کے پھوٹ چپنے سے پیدا ہوتی تھیں بہت اچھی طرح سنائی دینے لگیں اور جلد ہی کوئی منڈوے پر چڑھ آیا۔ مینھ زور سے برسنے لگا۔ ہر طرف اندھیری چھا گئی ندی کا طوفان اور بڑھ گیا۔ منڈوے کی گیلی اور ٹھنڈی فضا گرم سانسوں سے بھر گئی

اس کے احساس میں گدگدی سی ہونے لگی جو تھرمامیٹر کے پارے کی طرح اوپر کو چڑھتی گئی نہ جانے کب سے اس کی ٹھنڈی رگوں میں خون جما ہوا تھا اس میں روانی دوڑ رہی تھی اس وقت ذرا سی دیر میں اس کے ٹھٹھرے ہوئے جذبات بھڑک اٹھے پھر بھی اس نے بھیگی بھیگی آنکھوں سے آنے والے کو گھور کر کہا۔

کون ہے تو۔ میں پپیہا بجاتی ہوں!

ایک دم بہت سی مونگ پھلیاں اس کی گود میں آگریں اور رام سرن کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ پہاڑوں کی بادلوں سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور اس کا ہاتھ پپیے کی طرف اٹھتے اٹھتے رہ گیا اس میں انگلی کے پوروں سے شاید ایک سنسنی سی پھیل گئی اور پھر؟ .... بہت دیر کے بعد اس نے مسکرا کر کہا۔

ذرا آنا کبھی میرے منڈوے پہ
اور جو آ گیا میں کسی دن اور!
میں پپیہا بجا دوں گی۔

اور وہ منڈوے میں ہنسی کی ایک کچی پکی آواز چھوڑ کر چپ چپ کے ادھر وادک بکھیرتا چلا گیا اس کے بعد سے اس کی آتما ایک نامعلوم بوجھ سے دبتی چلی گئی۔ مکا کے کھیت کٹ گئے اور برسات کے بعد گلابی جاڑے بھی شروع ہو گئے مگر اس کا یہ بوجھ کم نہ ہوا بڑھتا ہی گیا اس وقت وہ کئی بار پیٹ میں ایک حرارت سی محسوس کر چکی تھی جیسے کبوتر کو ذرا کر دیا گیا ہو وہ پورے اضطراب سے پھڑ پھڑا رہا ہو اس سال پیداوار بہت اچھا ہوا تھا کہ اس کے سسر کو بڑی خوشی کی تھی اس خوشی میں جیسے قائم جوان ہوا جا رہا تھا۔ بڑھاپے تک روز روز کہا کرتا تھا اور اچھی پیداوار کبھی سال بھر تک اس کا پیٹ بھرتی رہے گی۔ مگر وہ نہ جانے کیوں ہر وقت اداس اداس رہتی تھی اس کی آنکھوں سے فکر مندی اور اداسی کا ملا جلا احساس ہر وقت بہتا رہتا تھا وہ سوچ رہی تھی کانوں میں یہ بات پھیلتے نہ کی پڑے دن ہو گئے پورے دو سال ہو چکے تھے اتنے دنوں کے بعد اس چھوٹے سے گھر میں کس ننھے سے بچے کی ماں بننا آ کی طرح بھی مناسب نہ تھا لیکن بار بار رام سرن کی اپنی اس الجھن کا ذکر آیا اور پھر تب اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی ان پھیکی مسکراہٹوں میں اس کی مصیبت کا کوئی علاج نہ تھا ..... آخر ایک اندھیری اور ٹھٹھری ہوئی رات میں جب پہاڑوں کی چوٹیوں سے لیکر ندی کے کنارے تک کہرے کی ٹھنڈی چادر تنی ہوئی تھی وہ گھر سے نکل کر شہر کی طرف چلدی۔ وہ پگڈنڈی پر دوڑ رہی تھی اور اس کا مستقبل افق پر ڈوبنے والے سورج کی طرح دھندلا ہوتا جا رہا تھا وہ ابھی تھوڑی ہی دور چلی تھی کہ دور سے کھانسنے کی آواز آئی جو لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہی تھی

قریب ہی تالاب کے کنارے پرشادی ایک نیا گیت گاتا ہوا گاؤں کی طرف آ رہا تھا اور اس کے منہ سے نکلے ہوئے بول پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اس کے کانوں میں دھنستے چلے جا رہے تھے اس کے ... میں عجیب سا جذبہ ابل رہا تھا جب پرشادی اس کے پاس سے گزرنے لگا وہ یک لخت جھاڑی کی آڑ میں کھڑی ہو گئی .... ہے بھگوان! میں نے جیا کتنا انداز دھیرے سے کہا اس ... جیسے زور سے کسی نے دبا دیا ہو۔ بہت دنوں کے بعد بہار اس کے سوکھے ہوئے باغ کی طرف آ رہی تھی .... مگر اس نے اپنے فیصلہ پر قائم رہتے ہوئے کہا۔ میری زندگی کا باغ تو اب اجڑ چکا۔ اس میں کبھی بہار نہ آئے گی۔ پھر ایک گہرا اور لمبا سانس لے کر وہ کہرے سے ڈھکی ہوئی پگڈنڈی پر دوڑنے لگی۔

تاثرات

قمر نعمانی

ترے خیال میں گم اور جہاں سے بیگانہ
جنوں کے بھیس میں پھرتا ہے ایک دیوانہ

حریم حسن میں جاتا ہوں میں حریفانہ
مرا مذاق محبت نہیں گدایانہ

یہ چشم مست کی افسوں گری معاذ اللہ
چھلک نہ جائے کہیں اب خرد کا پیمانہ

تو میری راہ نمائی کرے مروت سے
کہ ہے تلاش حرم لے چراغ بت خانہ

وفور شوق میں اتنا بھی کیوں خیال رہے
نثار شمع ہو بعد طواف پروانہ

امین راز محبت کا میں نہیں تو ہے
تری نگاہ میں ہے میرے دل کا افسانہ

لب حسیں پہ یہ موجیں نہیں تبسم کی
چھلک رہا ہے مئے ناب کا پیمانہ

نگاہ رحم طلب سے ترے حسن کو دیکھا
عجب جنوں کو ملا تھا مزاج شاہانہ

میں دیکھتا ہوں بصد احترام اس کو قمر
بنا دیا ہو محبت نے جس کو دیوانہ

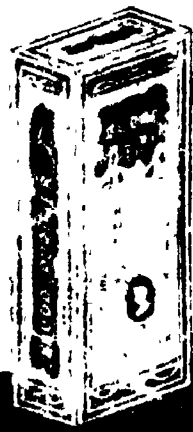
اپنا اور بچوں کا خون صاف کر کے جسم کندن بنایئے

ٹونک سارسپریلہ

فساد خون کے تمام امراض کی بہترین مجرب اور خون کی خرابی سے پیدا ہونیوالے

جملہ امراض کی مسلمہ سرتاج ایجاد

یہ سوفیصدی حیرت انگیز اور کامیاب دوا ہے جو از حد مصفّی خون ہے۔ جمیع امراض سوداوی و بلغمی و فساد خون و بقیہ مادۂ آتشک، درد مفاصل و خارش خشک و تر کیلئے بیحد مفید ہے۔ کھجلی خارش، داد، پھوڑے پھنسیاں، عرق النسا، جذام، گٹھیا، گنج، مہاسہ، گرمی دانے، چھیپ اور تمام زہریلہ مادہ جلدی امراض کا خاتمہ ہو کر جسم کندن بنجاتا ہے۔ ہزارہا ڈاکٹر اپنے مریضوں کو استعمال کرا کر نیک نامی اٹھا رہے ہیں۔ ممبئی اسمبلی کے ممبران نے بھی اسکے زود اثر اور اکسیر صفت ہونے کے شاندار سرٹیفکٹ مرحمت فرمائے ہیں۔ قیمت فی شیشی دو روپے (۲) محصول ایک روپیہ علاوہ



لیکن تین شیشی کے خریدار کو محصول بھی معاف ہے

خصوصیت) یہ دوا بچوں اور بڑوں کیلئے یکساں مفید، مارکیٹ میں فائدہ کے لحاظ سے سب سے ارزاں و سب سے مفید



ہندوستان اور برٹش ایسٹ افریقہ کیلئے واحد تقسیم کنندگان

روکی فریک اینڈ کمپنی!

کیمسٹ اینڈ ڈرگسٹ پشت جامع مسجد پوسٹ بکس ۵۴ دہلی

Rockie Frack & Co. P. O. BOX 54: JAMA MASJID: DELHI.

سازِ شکستہ

نازش پرتاب گڑھی

پرسشِ احوالِ دل پر مسکرا دینا پڑا
آج ٹوٹے ساز پر ایک گیت گا دینا پڑا

جب کبھی بھی ڈگمگائے راہ میں میرے قدم
اکثر ان کو بازوؤں کا آسرا دینا پڑا

ہائے وہ ساعت کہ جب ہر ہر نفس تھی تیری یاد
آہ یہ عالم کہ تجھ کو بھی بھلا دینا پڑا

اک تغافل ایک شانِ بے نیازی ہی تو کیا
مل گئیں نظریں تو تم کو مسکرا دینا پڑا

تھک چلی حسرت مگر آئے نہ تم پروانہ وار
اب چراغِ عشق مجبوراً بجھا دینا پڑا

اُف رے یہ رسمِ مروت یہ رواجِ فتنہ کار
شدتِ غم میں بھی مجھ کو مسکرا دینا پڑا

کروٹیں لیتی ہے اب بھی چاند تاروں میں وہ رات
جب مری خاطر تری زلفوں کو گا دینا پڑا

آج اُٹھیں وہ نگاہیں اور کچھ اس انداز سے
دل میں ارمانوں کا اک طوفاں جگا دینا پڑا

ایک ایسا بھی مقام آیا ہے راہِ شوق میں
جس جگہ قدموں کو خود ہی ڈگمگا دینا پڑا

مرحبا صد مرحبا نازش یہ رنگِ دستِ شوق
میری جانب ان کو خود دامن بڑھا دینا پڑا

طوفان کے بعد

کنول پرشاد کنول

سسکنے لگ گئیں پھر آنسوؤں میں جولانیاں ساقی — رگوں میں منجمد ہونے لگیں طغیانیاں ساقی

لہو پی کر نکھر آئے تھے آنکھوں کے کنول لیکن — یکایک چھا گئیں کیسی یہ پھر ویرانیاں ساقی

بدل ڈالا تھا ہم نے خواہ ہی عنوانِ ہستی کو — وہی پھر کیوں نظر آتی ہیں یہ عنوانیاں ساقی

اندھیرے میں ہے معنی پہچان مشکل دوست دشمن کی — کٹینگی بھی شبِ غم کی کبھی طولانیاں ساقی

یہاں اک قطرۂ خوں بھی نہیں تسکینِ خاطر کو — یہ گھر میں نت نئے مہماں نئی مہمانیاں ساقی

لگاتے آ رہے ہیں آگ گھر میں خود ہی بھیدیوں سے — بٹھا دیں کس نے عقل و ہوش پر نگرانیاں ساقی

بدلنا ہے بدل کر ہی رہیگا نظمِ عالم یہ
رہے گا اب نہ اپنی وقت نافرمانیاں ساقی

انجم سلمانی

جلوس

وہ اچانک ہڑبڑا کر بستر سے اٹھ بیٹھا اور کچھ دیر مبہوت رہنے کے بعد دائیں بائیں اپنی کمر کو بل دیا اور پھر بستر پر نیم دراز ہو کر اس نے کمرے کی کھڑکی کھول دی اور باہر دیکھنے لگا۔ دن کی روشنی آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھی اور سڑک پر اکا دکا آدمی چل رہے تھے البتہ سامنے والے چوراہے پر کچھ سپاہی اور انسپکٹر کھڑے ہوئے تھے اچانک ہوا کے ایک تیز جھونکے کے ساتھ کسی آواز کا شور اس کے دماغ سے ٹکرایا اور بے اختیار اس کا سر تکیہ پر جا پڑا جیسے کسی نے اس کو دھکیل دیا ہو۔ کیا ہڑبونگ ہے۔ کمبخت ... کھنچتے ہوئے وہ بڑبڑایا اور پھر اس نے سوچا۔ کم بخت دوسروں کے آرام کا خیال بھی نہیں کرتے۔ ایک اودھم مچا رکھا ہے۔ اور اس نے آنکھیں بند کر لیں اور شور سے بے نیاز ہو کر دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر شہد کی مکھیوں کے بھنبھنانے کا سا شور آہستہ آہستہ بڑھتا ہی جا رہا تھا صبح کی ہوا کمرے میں داخل ہو کر خنکی پھیلا رہی تھی۔ اس نے بُرا سا منہ بنا کر آنکھیں کھولیں اور ہاتھ بڑھا کر زور سے کھڑکی کا ایک پٹ بند کیا اور پہلو بدل کر کھڑکی کی طرف پیٹھ کر لی۔ فروری کا مہینہ ختم ہو رہا ہے اور سردی ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ صاف دن چڑھتا آ رہا ہے اور نیند ... اس نے آنکھیں کھول دیں اور سیدھا ہو کر کمرے کی چھت کی طرف تاکنے لگا۔ اور زندگی کی حقیقت بھی تو سردیوں ہی میں کھلتی ہے ایسی سردی میں جبکہ شدت برودت سے رگوں میں دوڑتا ہوا خون منجمد ہو رہا ہو اور مہینہ کی پہلی تاریخ ہو جبکہ سردی کا مقابلہ کرنے کے لئے جیب میں روپے ہوتے ہیں ایک بڑا سا سجا ہوا اور پُر آسائش کمرہ ہو اور کمرہ کو گرم رکھنے کے لئے سامنے انگیٹھی میں کوئلے سلگ رہے ہوں ... پاس ہی میز پر ایک بوتل اور دو پیک رکھے ہوں اور پہلو میں ... آخر ہرج ہی کیا ہے؟ اس میں ایک ذرا بدن کو گرمی پہنچانے کے لئے جبکہ دن بھر کی محنت کے بعد انگ انگ ایک نامعلوم بوجھ میں جکڑا ہوا ہوتا ہے

اس وقت کیسی سخت سردی ہوتی ہے کہ دانت کٹکٹانے لگتے ہیں اگر ایسے میں تھوڑی دیر کے لئے فطری آنچ میں ہاتھ پاؤں سینک لئے جائیں تو اس میں ہرج ہی کیا ... اور وہ جائے اور پانوں سے اینٹھی ہوئی زبان منہ کے لعاب میں تر کرتے ہوئے نہ معلوم کیوں آپ ہی آپ مسکرا دیا۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنکھیں چمکنے لگیں۔ ہونٹ بھینچ گئے اور اس کا تمام بدن آپ ہی آپ ایک گٹھری بنکر رہ گیا ...... آخر یہ کیا حماقت ہے؟ اس نے بڑبڑاتے ہوئے پھر باہر جھانکا۔ سڑک پر پولیس کے سپاہی کھڑے ہوئے ہر راہ گیر کو غور سے دیکھ رہے تھے اور سامنے چوراہے پر دو انسپکٹر کمر میں پستولیں لگائے ہوئے بے چینی سے ٹہل رہے تھے جیسے وہ کسی اہم واقعہ کے منتظر ہیں اور سڑک ...... یہ تارکول کی بنی ہوئی سفید، بھوری سڑک اور دنوں کے مقابلہ میں آج زیادہ اجاڑ اور سنسان معلوم ہو رہی تھی نہ معلوم کیوں؟ حالانکہ اس پر لوگ چل رہے تھے۔ سپاہی ہاتھوں میں ڈنڈے لئے ہوئے ٹہل رہے تھے اور انسپکٹروں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی اور وہ بھنبھناہٹ ..... شہد کی مکھیوں کی سی رسیلی بھنبھناہٹ اب بڑھ کر نعروں میں تبدیل ہو گئی تھی اور یہ نعروں کی آوازیں دم بدم قریب آتی جا رہی تھیں جس سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی جلوس قریب آتا جا رہا ہے ...... یہ ہندوستانی بھی کیا اوٹ پٹانگ سوچتے ہیں ... اس نے پلنگ پر تکیہ کھڑکی کے قریب سرکاتے ہوئے خیال کیا دنیا ہیں کہاں ہو رہی ہے اور یہاں صرف نعرے لگائے جا رہے ہیں ... دنیا کی ہر قوم اپنے کو سب سے زیادہ بہادر اور جنگجو ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہے اسلحہ خریدے جا رہے ہیں فوجی کیمپ قائم کئے جا رہے ہیں اور یہ ایٹم بم ..... خدائی عذاب ہے شاید جب قیامت آئیگی تو ہر شخص کے پاس ایک ایک ایٹم بم ہوگا .... مگر واہ رے ہندوستان ..... یہاں کے بد قسمت لوگ جلسے جلوسوں پر روپیہ برباد کر رہے ہیں اور اگر بہت ہی ترقی ہوئی تو ایک آدھ دھواں دھار تقریر کر دی جاتی ہے بار بار قربانی قربانی کی

مٹ لگائی جاتی ہے۔ قومی غیرت کا واسطہ دیا جاتا ہے ... کی جاتی ہے گڑگڑایا جاتا ہے دھمکیاں دی جاتی ہیں جیسے اگر ان کا ... نہ مانا گیا تو بھونچال آجائے گا۔ مگر جب قربانی کا موقعہ آتا ہے جب مشقت کے پلتے تو پسینے کے قطرے جمع کرکے کوشش کرنے میں کہ اپنے دشمنوں سے انتقام لیں آخر یہ عوام کو آپس میں لڑا دیا جاتا ہے کبھی تو اکھالی کے گاؤں لٹوا دئے جاتے ہیں کبھی بمبئی یا ... میں جلوا دی جاتی ہیں اور یہ غریب بیچارے ... ... کیسے ذہین اور قابل ہوتے ہیں وہاں کے لوگ یہ ان کی ذہانت اور قابلیت سے کام لیا گیا ہے کہ آپس میں ہی ایک دوسرے کو ذبح کرا دیا پھر ان فسادیوں کو برا بھلا کہہ کر تمام الزام لڑنے والوں کے سر منڈھ دیا جاتا ہے اور خود دامن جھاڑ کر الگ ہو جاتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا ...... اس سے تو بہتر ہے کہ یہ لوگ خاموش ہی رہیں اور ......

ہندو مسلم .... بھائی بھائی!

انگریزوں کی ...... ہائے تباہی!!

.... ہندو مسلم ....

لڑتے رہیں گے! ...... وہ زور سے چیخا مگر فوراً اسے اپنے پاگل پن کا احساس ہوا اور اس کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اس کے ضمیر کی آواز میں جلوس کے فلک شگاف نعرے دب گئے ہوں۔

لاحول ولا ..... کیا بیہودہ نعرہ ہے؟ .... اس نے ہتھیلی کا سہارا لے کر کھڑکی سے اپنا سر باہر نکالا بڑے بڑے لال جھنڈے لئے ہوئے ہزاروں لوگ آہستہ آہستہ اس کے مکان کی طرف آرہے تھے اُجلے دودھ جیسے سفید کپڑے پہنے ہوئے میلے کھدر کو اپنے سخت اور کھردرے بدن سے لپیٹے بے ڈھنگ۔ کمر میں ایک مٹیالی رنگ کے کپڑے کا کملا لپٹا ہوا۔ پسلیاں ابھری ہوئیں آنکھوں میں بڑے بڑے سیاہ حلقے بڑے عجیب بدہیئت سی شکل .... مگر جوش میں کپکپاتی ہوئی۔ ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچی ہوئی سینہ نکلا ہوا جیسے سپاہی جنگ پر جا رہے ہوں ..... اور اس کو ان کی یہ مسخری صورتیں دیکھ کر بے اختیار ہنسی آگئی .... بھلا یہ لوگ انسان ہیں جن کی شکلیں دیکھ کر ہنسی آتی ہے اور بچے خوف سے ڈرتے ہیں انسان تو اشرف المخلوقات ہے وہ خدا کا نائب ہے وہ خدا کی بنائی ہوئی مخلوق میں سب سے زیادہ حسین ہے سب سے زیادہ عقل و فہم کا مالک اور ذہین دیکھا ہے اس نے زمین سے خزانے نکالے .. عظیم الشان محل تعمیر کئے۔ شہر بسائے باغوں کی آبیاری کی کھیتوں سے غلہ پیدا کیا اور خدا کی تمام جاندار مخلوق کا پیٹ بھرا .... اور یہ (وہ) یہی تو انسان ہی تھے جنھوں نے سمندروں سے موتی نکالے اور ان میں جہاز چلائے

اور خدا کی بنائی ہوئی اس طویل و عریض زمین کے تمام بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو سمیٹ کر یک کر دیا .... اس نے اپنے قوتِ بازو سے اس دنیا کو سجایا اور سنوارا اور اس کی پیدا کی ہوئی تمام نعمتوں کا حقدار بنا .. مگر یہ لوگ! ...... یہ لوگ کاہل اور بزدل ہیں۔ نوعِ انسان کی پیشانی پر ایک بدنما داغ ہیں اور اپنے بے رونق کریہہ المنظر چہروں اینٹھے اور اکڑے ہوئے بدن اور مسخری چال سے انسانیت کی توہین کر رہے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو ....

مزدور .... بھوکے نہیں مریں گے

مزدور .... ایک ہیں ....!

نعروں نے اسے اپنے خیالات سے چونکا دیا۔ اس نے نفرت سے جلوس کی طرف دیکھا آہستہ آہستہ جھنڈے اٹھائے ہوئے اب وہ کوئی گیت گانے لگے تھے ..... اس نے سوچا۔ کیا عورتوں جیسی حرکتیں ہیں؟ پہلے تو چیخنا چلانا اور پھر عورتوں کی طرح گانا ..... عجیب لوگ ہیں اس سے یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ ایک ہیں کیونکہ یہ ایک آواز ہو کر بڑی اچھی دھن میں گا رہے ہیں مگر اس سے یہ کہاں معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بھوکوں نہیں مریں گے ... جب یہ لوگ ہڑتالیں کریں گے۔ ہزاروں لوگ ایک جگہ جمع ہوں گے بدامنی پھیلائیں گے تو پھر کس نے کہا تھا سے آئے گا! دنیا میں پیدا ہوئے ہو تو انسانوں کی طرح رہو دن بھر محنت کرو اور شام اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق مزدوری کا معاوضہ لو اور گھر جاؤ اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالو اور چین کی بنسی بجاؤ .... یہی زندگی ہے ..... اور یہی انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنے کا سیدھا راستہ ہے ... آخر ہم بھی تو انسان ہیں۔ ہماری طرح رہو ..... انسانوں کی طرح ..... اس نے اپنا ایک ہاتھ کھڑکی کے جنگلے پر رکھ لیا اور سر بازو پر رکھ کر وہ سوچنے لگا ... ہمارے وہ اسلاف جنہوں نے اس دنیا کو سنوارا اور ہمارے رہنے سہنے اور زندگی گذارنے کے قوانین بنائے انہوں نے ہمارے لئے ایک سماج بنائی اور ہمارے آرام و آسائش کی خاطر خون پسینہ بہا کر ہمارے لئے ایک مکمل تمدن کا ڈھانچہ تیار کیا اور آج ہم نے ہر پرانی باتوں پر لعنت بھیجنا ایک فیشن سمجھ لیا ہے اور اس سماج کو اپنے لئے غلامی کا طوق سمجھتے ہیں لیکن ہم نہیں جانتے کہ اسے کن کن دقتوں سے ترتیب دیا گیا ہے کیسی کیسی مصیبت اٹھائی گئی ہے جب کہیں آج ہم اس قابل ہوئے ہیں کہ مہذب انسانوں کی سی زندگی بسر کر سکیں مگر یہ لوگ اپنے بزرگوں کی تمام محنتوں اور روایتوں کو مٹا دینا چاہتے ہیں ان کو ملیا میٹ کر دینا چاہتے ہیں اور اپنی بے وقوفی اور حماقتوں سے ان کی تمام یادگار اصول و قوانین کا گلا گھونٹنے پر تلے ہوئے ہیں۔ آخر کیوں؟ ...... ایسا کیوں ہے! ..... اوہ

اس کا کوئی جواب نہ سوچ سکا۔ البتہ اسے خیال آیا کہ وہ کبھی کبھی اپنے کو ایک بے بس اور لاچار مزدور کی طرح محسوس کرنے لگتا ہے جب مہینہ آخر ہو جاتا ہے اور کہیں سے روپیہ ملنے کی امید نہیں ہوتی ہاتھ پاؤں کی سردی دن بدن بڑھتی جاتی ہے اور منجمد خون کو کھولانے کے لئے ایک توتن اور ایک ماڈل۔۔۔۔۔۔۔ حاصل کرنے کی کوئی صورت قطعی نظر نہیں آتی تو کتنی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ وہ اپنی اس بے بسی پر خوب روئے کتنی ہی بار جب وہ کسی مہنگے سوٹ کو طے کرنے میں روپیوں کی کمی کی وجہ سے ناکام ہوا تو اپنی اس لاچاری پر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور بے اختیار اس کا جی چاہا کہ اس بے ننگم اور ناجائز زندگی سے تو بہتر ہے کہ وہ خودکشی کرلے۔۔۔۔۔۔ اور یہ خیال آتے ہی غیر شعوری طور پر اس نے ایک ٹھنڈی اور لمبی سانس لی اور اس نے سوچا کہ آخر کیوں صرف چند لوگوں نے دنیا کے جنت کدہ میں آگ لگا کر اسے جہنم زار بنا دیا ہے۔۔۔ صبح آٹھ بجے سے رات کو ۹ بجے تک وہ باٹا شوز ہاؤس میں رجسٹر کے خانوں اور رقموں کے نمبروں میں الجھا رہتا ہے ہزاروں روپیوں کے بل اس نے اپنے ہاتھ سے وصول کئے اور ہزاروں ہی روپیہ اس نے اپنے ہاتھ سے منیجر کی تجوری میں بند کیا مگر جب بھی مہینہ ختم ہوا پھر چاہے تیس سے اکتیس دن ہی کیوں نہ ہو جائیں مگر اس کی جیب میں اسی روپے سے ایک پائی زیادہ نہیں آتی تھی اور وہ اسی روپے بھی بوڑھا منیجر اس طرح دیتا تھا جیسے وہ اس کی سات پشتوں پر بڑا احسان کر رہا ہے اور وہ جو مہینہ بھر تک رجسٹر کے خانوں میں اپنے دیدے پھوڑتا ہے وہ کوئی بات ہی نہ ہوئی۔۔۔۔۔۔۔ اور پھر مہنگائی نے بھی تو روپیوں کو کوڑیاں بنا دیا ہے اور پھر وہ تو ایک نواب زادہ لڑکا تھا جس کی فضول خرچیوں اور شاہانہ مصارف کی وجہ سے تمام خاندانی جائیداد نیلام پر چڑھ گئی تھی اور مرتے وقت غریب کے پاس ایک کوڑی تک نہ تھی کہ اپنا علاج ہی کرا لیتا یا اس کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا اطمینان سے کچھ دن کھا پی سکتا۔۔۔۔۔

مگر وہ تو بھلائی ہو اس کی ہمسائی کا جو کسی زمانہ میں اس کے باپ کے یہاں ملازم تھی۔۔۔ اس نے اس کو کسی بے مروت اور طوطا چشم عزیز کا دست نگر نہ بننے دیا اور اس کے رشتہ دار بھی یہ سوچ کر کون مصیبت مول لے خاموش ہو گئے۔ البتہ ہمسائی نے اس بے ماں باپ کے بچے سے بے انتہا ہمدردی کا اظہار کیا اسے اپنے یہاں رکھا، پڑھایا لکھایا اور ایک ماں۔۔۔۔۔۔۔۔ ہاں!۔۔۔

۔۔۔ شاید جیسے تمام عورتیں صرف ماں بننے کے لئے ہی پیدا کی گئی ہیں۔ مگر اس کی ہمسائی تو ابھی تک ماں نہیں بنی تھی اور اپنی عمر کی بیس پچیس بہاریں دیکھنے کے بعد بھی کنواری دوشیزہ کی طرح زندگی بسر کرتی تھی اور اس کا تو بالکل ایک سگی ماں کی طرح خیال رکھتی تھی اور جب بھی ان کے یہاں نیا آدمی آتا تو وہ اس سے کہتی۔

نامو میاں! ۔ دیکھو یہ تمہارے چچا ہیں۔ ان سے باتیں کرو یہ تمہیں پیسے دیں گے اور جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو۔۔۔ تمہارے باپ کی طرح ایک بڑا دولتمند آدمی بننے میں یہ تمہاری مدد کریں گے۔ اور وہ ان سب باتوں پر شرما کر اپنی ہمسائی سے لپٹ جاتا۔ جب وہ اس کے کہنے پر خالہ کہنے لگا تھا۔۔۔۔ ورنہ شروع میں تو اس نے اسے بھی اپنی ماں کی طرح امی ہی کہنا چاہا تھا مگر اس نے اسے ڈانٹ دیا اور جب اس کے چچا چلے گئے تو اس نے اسے سمجھایا۔

دیکھو میاں! تم ہمیں کسی کے سامنے امی نہ کہا کرو۔

اس نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ کیوں؟

اس کی ہمسائی نے بے اختیار اس کا منہ چوم کر کہا نہیں میاں ہم تمہاری امی نہیں۔ ہم تو تمہاری خالہ ہیں۔

یہ راز اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اس سے خالہ کہنے لگا تھا اور ہر نیا آنے والا خواہ وہ جوان ہو یا بوڑھا اس سے اس طرح باتیں کرتا جیسے وہ اسی کا بیٹا ہے اسے پیسے دئے جاتے۔ کپڑے بنائے جاتے۔ تفریح کرائی جاتی اور جب تک چچا اس کے یہاں رہتے خوب اس کی ناز برداریاں ہوتیں اور پھر ان سب کے بعد ایک دن وہ بھی آتا جبکہ کسی بھی معمولی بات پر چچا اور خالہ میں لڑائی ہوتی اور چچا صاحب ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاتے۔ ان کی جگہ کوئی دوسرا سنبھال لیتا۔

۔۔۔ ۔۔۔۔ اور ان چچاؤں کی آمد و رفت دیکھتے دیکھتے اس کی عمر اٹھارہ سال سے زیادہ ہو چکی تھی اور اس طویل عرصہ میں اس کی خالہ کے جسم کی تمام رعنائیاں اور آرائشیں پگھل کر اس کے دولتمند چچاؤں کے بدن پر چربی بن کر چڑھ گئی تھیں جنہوں نے مدت سے اس کے یہاں آنا بھی چھوڑ دیا تھا اور پھر ایک دن۔۔۔۔۔۔ ایک دن ایسا آیا جبکہ اس کی خالہ کسی تکلیف دہ بیماری میں مبتلا ہو کر مر گئی اور یہ مکان۔۔۔۔ اس کی خالہ کا یہ مکان۔

۔۔۔۔۔ آج حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کی خالہ کون تھی اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اس کے چچا کیسے لوگ تھے۔۔۔۔۔ مگر یہ سب شاندار مکان اور دو ہزار بھی تو اس کی خالہ نے ان چچاؤں کے ذریعہ سے ہی پیدا کیا تھا۔۔۔۔ اور یہ اسی روپیہ کی ملازمت دینے والے باٹا شوز ہاؤس کے منیجر بھی تو اس کے ایک چچا ہی تھے جنہوں نے اس پر ترس کھا کر اپنے یہاں ملازم رکھا تھا۔۔۔۔۔۔ پھر کیا ہوا؟ اس کے خون میں کونسی رذالت ہو گئی؟ اور اس کی شکل و صورت میں کہاں کی کراہت آگئی؟ اس سے اس کی شرافت و نجابت میں کونسا فرق آگیا؟ ۔۔۔۔۔۔ وہ تو خاندانی اور نجیب الطرفین رئیس زادہ ہے اس کے سامنے

جسم میں ایک سنسنی اور باحمیت خون جوش مار رہا ہے۔ اور یہ اس کی بھری ہوئی چھاتی اور حسین صورت! . . . . خوبصورت . . . . . . اس نے ایک دم لحاف پھینک دیا اور وہ ابھی اپنی صورت آئینے میں دیکھنے کے لئے اُٹھا ہی تھا کہ اچانک باہر اس کو شور و غل سنائی دیا . . . . . اُن سُنی کرنے کی کوشش کی مگر شور بڑھتا ہی گیا . . . . . یہاں تک کہ وہ گھبرا کر پلٹا اور پھر کھڑکی میں سے اس نے باہر نظر ڈالی . . . . . . اور دور تک وہ نظر دوڑاتا گیا۔ سڑک پر جلوس جا رہا تھا۔ بڑے بڑے لال جھنڈے اُٹھائے ہوئے . . . . . مگر اب ایک انتشار پھیلا ہوا تھا . . . . ایک سراسیمگی اور بھگدڑ مچی ہوئی تھی . . . . جلوس کے آگے پیچھے پولیس کے دستے کھڑے ہوئے تھے اور بیچ میں سینکڑوں سپاہی بے تحاشہ جلوس پر لاٹھیاں برسا رہے تھے۔ بچے چیخ رہے تھے عورتیں سہمی ہوئیں اور خوف زدہ کھڑکیوں میں سے جھانک رہی تھیں . . . . اور مرد . . . . . . ننگ دھڑنگ اور دُبلے پتلے انسان، جن کی سُرخ آنکھیں نکلی ہوئیں منہ سے جھاگ اڑتا ہوا۔ سینکڑوں لاٹھیوں کے چکر میں نعرے لگا رہے تھے۔ کھدر پوشوں کے نعرے بلند ہونے کی کوشش کرتے تھے مگر لاٹھیوں کی سنسناہٹ اور وحشیانہ حملوں سے پیدا ہونے والی چیخیں انہیں دبا دیتی تھیں۔ اس نے گھبرا کر کھڑکی بند کر دی اور دونوں ہاتھوں سے دبا کر اپنا پورا وزن اس پر ڈال دیا جیسے ابھی کوئی دروازہ توڑ کر اندر آ جائے گا . . . . . زخمیوں کی چیخیں اس کا دل دہلا رہی تھیں اور پُرجوش نعرے اس کا بھیجہ اُڑائے دیتے تھے لاٹھیوں کا شور کانوں کے پردے پھاڑے ڈالتا تھا . . . . . . اس پر بے ہوشی سی طاری ہونے لگی . . . . اور آنکھیں بند کرتے کرتے وہ ایک ساتھ کسی بندوق چلنے کی آواز سن کر چونک پڑا اور سنبھل کر اس نے پلنگ کا سہارا لیا۔ شور ایک دم ختم ہو گیا۔ نعرے بند ہو گئے اور لاٹھیوں کی سنسناہٹ رک گئی البتہ جب اس نے کھڑکی کھول کر دوبارہ باہر دیکھا تو دور تک سوائے پولیس کے سپاہیوں کے اور کچھ اسے دکھائی نہیں دیا۔ جو زخمیوں کے درمیان میں چہل قدمی کرتے ہوئے ان کی کراہوں کو اپنی فتح مندی کی کہانیوں کے شور سے کچل رہے تھے۔ سڑک پر ہر طرف لاشیں اور لاٹھیاں بکھری ہوئی تھیں اور کہیں کہیں پھٹے ہوئے جھنڈے بھی اپنے مستولوں میں اُلجھے ہوئے پڑے تھے۔ شفاف سڑک پر جا بجا خون کے دھبے پڑ گئے تھے . . . . زیادہ دیر تک اس دردناک منظر کو دیکھنے کی تاب نہ لا سکا اور ایک شکست خوردہ انسان کی طرح اپنے بستر پر گر پڑا جیسے وہ بھی اسی منتشر کئے ہوئے جلوس میں کا ایک فرد ہے جس کے متعلق ابھی اس کے ذہن میں نفرت کے گندے خیالات آ رہے تھے مگر اب وہ اپنے کو ہر دور کا سب سے بڑا ہمدرد سمجھ رہا تھا اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ابھی ابھی وہ لڑائی ہار کر واپس آیا ہے۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے بے چینی سے کروٹ بدلکر اپنی نظریں سامنے دیوار پر لگے ہوئے کلینڈر پر گاڑ دیں پھر اس کے ذہن میں ایک خیال نے انگڑائی لی۔

. . . . . . ان غریبوں کی قسمت میں کب تک ٹھوکریں لکھی رہیں گی آج مدراس میں گولی چل گئی . . . . . کل ٹراونکور میں۔ پرسوں حیدرآباد کی باری ہے آخر کب تک ان کو اس طرح کچلا جاتا رہے گا۔ کب تک لوگ حیوانوں کی طرح ان پر اپنا بوجھ لاد کر ان کا خون چوستے رہیں گے یہ بھی تو انسان ہی ہیں۔ ہمارے ساتھ رہتے ہیں . . . . زندگی گذارتے ہیں۔ ان کا بھی جی چاہتا ہے کہ صاف ستھرے مکان میں رہیں۔ مرغن کھانے کھائیں۔ اچھے کپڑے پہنیں اور اپنے دوستوں کے ساتھ اکڑتے اینٹھتے اور سگریٹوں کے دھوئیں اڑاتے ہوئے چلیں . . . . . . وہ بھی چاہتے ہیں کہ ان کی بیوی ایک سلیقہ مند خاتون ہو تاکہ دن بھر کی محنت کے بعد وہ جب گھر پہنچیں تو خندہ پیشانی سے ان کا استقبال ہو . . . . . وہ بھی سوچتے ہیں کہ ان کے بچے اسکول اور کالجوں میں پڑھیں اور انہیں اس کی پوری آزادی ہو کہ وہ چاہیں تو ترقی کرکے وزیر اعظم بنیں یا کرکٹ کھیلیں کھیلیں کہ مودی یا مرچنٹ بن جائیں . . . . غریب مزدور ہیں نا اور مزدوری کرتے وقت جب یہ اپنے مالک یا منیجر کی جھڑکیاں سنتے ہیں تو ایسا ہی سوچتے ہیں اور انہیں ایسا ہی سوچنا بھی چاہیئے۔ سینکڑوں تجوریوں کے مالکوں کو انہوں نے ہیروں میں تلوا دیا . . . . . کٹیوں میں رہنے والوں کے لئے کوٹھیاں سجا دیں . . . . . . انگریزی تمدن کے شیدائیوں کو کبھی انہوں نے سروں پر بٹھایا۔ میلوں لمبے ان کے جلوس نکالے بعض کو چائے کی کمپنیاں کھلوا دیں۔ اخبارات خرید وائے اور سینکڑوں دولت مند جو ایک لفظ لکھنا بھی نہیں جانتے انہیں ایڈیٹر بنا دیا اور پھر ان سب کا نتیجہ؟ . . . . انجام؟ فاقہ کشی اور ٹھوکریں! . . . . ایسے ایسے عظیم انسان سارے زمانے اتنی بہت سی آرزوئیں اور ان سب کا ایسا مختصر انجام! . . . . . مرجھائی ہوئی صورتیں . . . . ڈھلکی ہوئی گردنیں پچکے پچکے جسم اور جھکی ہوئی کمریں . . . . ان سب کے معاوضے میں انہیں دنیا میں اتنا بھی حق نہیں کہ ایک جگہ جمع بھی ہو سکیں اپنے اوپر ہونے والے مظالم کی شکایت بھی کر سکیں اپنی اُجرت بڑھانے کا مطالبہ کر سکیں اور اگر ان کی بات نہ مانی جائے تو ہڑتال کریں۔ جلوس نکالیں . . . . یہ سب صرف اس لئے کہ وہ کمینے ہیں، ذلیل ہیں کیونکہ ان کے پاس پیسہ نہیں ہے کہ وہ موجودہ تمدن کے مطابق آسائش خرید سکیں۔ انہیں دولت میسر نہیں ہے مگر وہ انسان ہیں اور انسان ہونے کی حیثیت سے انہوں نے بھی اس دنیا کے بنانے اور اس کو ترقی کے اعلیٰ مدارج تک پہنچانے میں ہم سے زیادہ حصہ لیا ہے انہوں نے اپنے بھائیوں کے دوش بدوش چلکر دنیا کی تمام

فرقوں سے پیوستہ ہوئے اور انہیں تمام لوگوں میں تقسیم کرنے کے قوانین بنائے ہیں۔ . . . . یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے ایک نئے اور انوکھے تمدن کی بنیاد اگر حیوانوں میں انسانیت کی داغ بیل ڈالی ہے اور کوشش کی ہے کہ انسان اپنے ماحول اور نئی معاشرت میں آنکھیں کھول کر اپنی تمام چھوٹی بڑی صلاحیتوں کو آزادی سے کام میں لائے تاکہ اس سماج میں رہ کر انسان حیوانوں سے بالکل الگ ایک قوم بن جائے انہوں نے اس دنیا کی تعمیر اس لئے نہیں کی کہ خود ان کے ہم جنس ان کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کریں۔ انہوں نے اس لئے دنیا کو ترقی کی طرف نہیں بڑھایا کہ ان سے دنیا میں زندہ رہنے کا حق بھی چھین لیا جائے انہوں نے اس لئے اس تمدن کی بنیاد نہیں ڈالی کہ دنیا سمٹ کر انکو پیس ڈالے اور نہ ہی انہوں نے کبھی یہ خیال کیا تھا کہ یہ سماج جسے آج خود وہ بنا رہے ہیں کبھی ان کے لئے لعنت بن جائے گی اور ان کے اس انسانیت کے چولے کا اس بے رحمی اور وحشیانہ طریقے سے گلا گھونٹ دے گی جسے انہوں نے ہزاروں سال کے الٹ پھیر کے بعد صحیح طریقے سے پہنا ہے . . . . اب یہ برداشت نہیں کیا جائے گا کہ غریب انسان صرف چند انسانوں کی وجہ سے اس دنیا کو اپنے لئے ایک قید خانہ تصور کریں۔ ہم اب اس کے لئے تیار ہیں کہ اپنے اسلاف کی تمام محنتوں کو برباد کر کے پھر سے حیوان بن جائیں . . . . ہم انسان ہیں . . . . اور انسان ہی رہیں گے۔ ہم اپنی تمام شعوری اور نیم شعوری طاقتوں کو کام میں لائیں گے اگر یہ سماج ہماری روزمرہ زندگی میں رکاوٹ ڈالتی ہے اگر یہ ہمیں ترقی کرنے سے روکتی ہے اور بجائے آگے بڑھانے کے ہمیں پیچھے کی طرف دھکیلتی ہے تو سماج ہم نے بنائی ہے ہم سماج کے لئے نہیں بنے ہیں . . . . . . ہمیں یہ حق ہے کہ اگر سماج کسی انسان کو جینے کا حق نہ دے تو اس کی دھجیاں اڑا دیں اور اس لعنت کا وجود مٹا دیں اور ایک نئی سماج . . . . ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھیں جو بجائے نفرت، بے رحمی ریاکاری اور ایک دوسرے کے گلا کاٹنے کے محبت، ہمدردی اور شرافت سکھائے گی . . . . اور ہم ایسا ضرور کریں گے ضرور . . . . ضرور . . . . . .

اس نے اپنا ہاتھ زور سے پلنگ کی پٹی پر مارا۔ پھر فوراً ہی تکلیف کی وجہ سے ایک سسکاری بھری اس کے ساتھ ہی آفتاب کی ایک ننھی منی کرن کمرے کی کسی درازے سے جھانک کر اندر آگئی۔ کچھ دیر سامنے کی دیوار پر ٹھہری پھر آہستہ آہستہ بڑھتے بڑھتے ایکدم کمرے سے غائب ہو گئی۔ جیسے اس کے ذہنی شعور میں تیرتے ہوئے خیالات کے سینکڑوں جلوس بنے، بڑھے اور عزائم کے بڑے بڑے جھنڈے لئے ہوئے لاشعور کی تاریکیوں میں ڈوب گئے ؂

شفیق کوٹی

احساسات

سینے میں سوز ہے مرے لب پر فغاں نہیں
جلتا ہوں ایسی آگ میں جس میں دھواں نہیں

تو نے عطا کیا ہے غمِ عشق شکریہ
اب یہ مرا نصیب کہ یہ جاوداں نہیں

تمہید صد ہزار قیامت لئے ہوئے
اک خامشی ہے جس کو میسر زباں نہیں

صیاد مانگتا ہوں میں تیرے قفس کی خیر
میری نگاہ و ذہن میں اب آشیاں نہیں

نام آگیا کسی کا تو آنسو نکل پڑے
اس کے سوا اب اور مری داستاں نہیں

پھولوں کا کیوں چمن میں گریباں ہے تار تار
میرے جنوں کا پاؤں اگر درمیاں نہیں

آنکھوں میں بس رہی ہیں تری مست انکھڑیاں
خم خانۂ بہار لئے تو کہاں نہیں

موجِ بہار نکہتِ گل عنفوانِ رنگ
ہے اور کیا ہیں گر تیری انگڑائیاں نہیں

گر یہ ہے زندگی تو شفیق اس سے الحذر
ٹھکرا نہ دوں کہ زیست کا اس پر گماں نہیں

تم کیوں چھوڑ سدھارے

منظور احمد
بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

تمرے کارن توڑ کے لائے گگن گگن کے تارے
دو نینوں میں دیپ جلا کر مات کئے اندھیارے
تمرے کارن ساون بھادوں برسے نیر ہمارے

پھر بھی چھوڑ سدھارے ساجن تم کیوں چھوڑ سدھارے
تم کیوں چھوڑ سدھارے

من کے مرگھٹ میں جلتا ہے ارمانوں کا لاشا
آج تماشا کرنے والے خود ہی بنے تماشا
ساجن ہم سے تم کیا روٹھے روٹھ گئی ہے آشا

جیون تھا اک سپن سہانا ساجن ساتھ تمہارے
تم کیوں چھوڑ سدھارے

پھول سا کومل یہ دل توڑا قدر نہ تم نے جانی
بے کل آنسو، تپتی آہیں دے گئے خوب نشانی
تم کو کھو کر سب کچھ کھویا کس بل روپ جوانی

تم کو کھو کر ہم جیون کی جیتی بازی ہارے
تم کیوں چھوڑ سدھارے

رگ رگ میں سو خون کے سوتے نس نس میں سو گھاؤ
قدم قدم پر ٹیڑھی راہیں پگ پگ پر الجھاؤ
لیکن تم کو چنتا کیوں ہے تم جاؤ، تم جاؤ

جیسے ہو گا کاٹ ہی لیں گے جیون داس تمہارے
تم کیوں چھوڑ سدھارے

مشاہدہ

ساحر قدوائی

خالقِ کون و مکاں، قادرِ ہر پست و بلند
تیری دنیا کو بہت غور سے دیکھا میں نے
خس و خاشاک کی نبضوں کو ٹٹولا میں نے
برق و طوفاں کی جبینوں کے پسینے دیکھے
قطرۂ آب میں شعلوں کی روانی دیکھی
سنگ ریزوں کے دھڑکتے ہوئے سینے دیکھے
تری دنیا کو بہت غور سے دیکھا میں نے
رشتۂ گل سے ٹپکتا ہوا خوں دیکھا ہے
سانس لیتے ہوئے ذرّوں کی سنی ہے آواز
لالہ و گل کو جو شاخوں میں کچلتے دیکھا
دشت و کہسار کی باہوں میں بھی پایا وہ گداز
تری دنیا کو بہت غور سے دیکھا میں نے
جو عفاریت کی بستی میں بھی ڈھونڈے نہ ملے
اے خدا تری خدائی میں وہ دیکھا میں نے

مسجدوں، مندروں، گرجاؤں، کلیساؤں میں
نورِ ایماں کے اجالوں میں اندھیرے دیکھے
مولوی، پادری، پنڈت کے حسیں روپوں میں
ظالم و جابر و سفاک لٹیرے دیکھے

تری دنیا کو بہت غور سے دیکھا میں نے
جگمگاتے ہوئے شہروں کے گلی کوچوں میں
کتنی تہذیب کی سڑتی ہوئی لاشیں پائیں
کتنے تابندہ و مہتاب نما ماتھوں پر
غم و اندوہ کی پُرسوز خراشیں پائیں
تری دنیا کو بہت غور سے دیکھا میں نے
عشق سرگشتہ و حیران و پریشاں دیکھا
حُسن کے چہرے پہ مغموم خوشی آئی نظر
برف پاروں کی رگ و پے میں حرارت دیکھی
آتشِ تند کی پلکوں پہ نمی آئی نظر
تری دنیا کو بہت غور سے دیکھا میں نے
میں نے گر دلنے ہیں اوراقِ کتابِ عالم
مجھکو معلوم ہے دنیا کی حقیقت کیا ہے
مرے ہر اشک نے کھائے ہیں تبسم کے فریب
میں سمجھتا ہوں کہ انجامِ مسرت کیا ہے
تری دنیا کو بہت غور سے دیکھا لیکن
مجھکو ہر شے میں کسی شے کی کمی آئی نظر

~~ ٭ ~~

عمران الارشد

کہتے ہیں جس کو عشق

چٹاخ ——— "بٹیلو اپڈ بیٹ" روما کی پیشانی پر بل پڑ گئے جیسے کسی نے رومال کے مقابل کونے پکڑ کے کھینچ لئے ہوں۔

اور وہ جھلا سی تو گئی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھی اس زور سے لڑکی کے طمانچہ رسید کرے کہ واقعی اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا جائے ——— اور جھٹکے تو اسے بھی زور سے تا کہ دن میں تارے نظر آ جائیں اور وہ مذاق میں بھی کہنا بھول جائے کہ ——— دن میں تارے کس طرح نظر آتے ہیں ——— یہی اس کی توہین تھی، صریحاً توہین ——— اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی، سردی میں پسینہ آجانا اس کے غصہ کی انتہا کو صاف نمایاں کر رہا تھا ——— اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا، بدن میں قدرے رعشہ آ گیا جیسے ہواسے کا نپتا ہو، پتہ۔ کانوں اور آنکھوں سے شعلے نکلتے ہوئے محسوس ہونے لگے ——— ہاتھوں کی رگیں تن گئیں ——— مٹھیاں خود بخود کس کے کھلنے اور بند ہونے لگیں۔ تنفس تو اس قدر تیز ہو گیا تھا کہ اس کی بھاپ بار بار نکلتے ہوئے بھی دکھائی دے رہی تھی ——— دانت ایک دوسرے سے ٹکرا کر جبڑوں میں درد پیدا کر چکے تھے۔ اس نے ایک بار پھر اس ہیتری کو دیکھا ——— ہلکی گلابی ساری میں ہلکا گلابی جسم ملبوس جیسے کسی گلاب کے پھول کے گرد دھنک سے گلابی رنگ نکل کر لپٹ گیا ہو ——— نیم عریاں بازو ——— جن کو دیکھ کر اس کا جی چاہا کہ زور سے کاٹ کھائے۔ جہاں دانتوں کے نشان اس طرح بن جائیں کہ ان میں سے سرخ سرخ چھوٹے چھوٹے سوتے پھوٹ پڑیں ——— ابھرا ہوا سینہ کچھ اس طرح معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی مسجد کا گنبد ہو ——— جھیل جیسی شفاف آنکھوں میں پتلیاں اس طرح رقصاں تھیں گویا جھیل میں کنول کا پتہ لرزاں ——— آنکھوں پر غلافی پلکوں کا سائبان سا جھکا ہوا بار بار جھپک رہا تھا۔ اس پر بہت سجی ہوئی بھی بھی تو تمام پلکیں اور بھی بھلی معلوم ہو رہی تھیں ——— دو لمبی کالی چوٹیاں جن میں نارنجی فیتے پھولوں کی شکل میں بندھے ہوئے تھے جو سینہ کے ابھار پر آ کر الگ دو سرے پر حملہ آور سی معلوم ہوتی تھیں۔

بار بار جھپکتی ہوتی سیاہ آنکھوں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ غصہ کے بعد ندامت محسوس کر رہی ہے اور اپنی اس غلطی کا اعتراف کرنا چاہتی ہے۔

اور پھر رمیش نے محسوس کیا کہ سیڑھیوں سے اترتے اور چڑھتے ہوئے طالب علم اپنی جگہ رک چکے ہیں پیچھے چلتے ہوئے لڑکے ان دونوں کو متجسس نگاہوں سے گھور رہے ہیں اس کو انکی نظریں چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں جیسے وہ کوٹ کو چھیدتی ہوئی اس کے بدن تک پہنچ رہی ہوں۔

کالج میں اس کی اس طرح توہین جس کے لئے وہ کسی قیمت پر بھی تیار نہ تھا ——— اور اگر وہ لڑکی نہ ہوتی تو رمیش ضرور اس کو مزا چکھا دیتا۔ مرد کی کمزوری عورت پر ہاتھ نہ اٹھانا بھی تو ہے ——— اور یہ عورتوں کے بھیس میں انسانیت کی توہین کرتی پھریں ——— جانور ! ——— وحشی !! اور اس نے اپنا پیر غصہ سے دوسری سیڑھی پر زور سے رکھا ——— کھٹ۔ اور تمام لکڑی کا زینہ کانپ اٹھا ——— پھر کھٹ کھٹ جس میں آواز سے زیادہ غصہ نمایاں تھا وہ اوپر چلا گیا ——— نہ جانے کیا سوچتا ہوا ——— اس کو محسوس ہو رہا تھا جیسے کالج کی عمارت اس کو کھائے جا رہی ہو ——— نگل نہ جائے۔ اور اٹھنے جانے والی نظریں اس کو اس طرح گھور رہی تھیں گویا وہ کالج میں ننگا ہی تو کھڑا ہے یا کوئی چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو ——— اور ہر اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک مسکنہ (؟) اس مرحلے میں ——— وہ دو دو کر کے سیڑھیاں پھلانگ کر جلدی جلدی

نیچے اتر آیا اور اپنی کار کی طرف اس تیزی سے بڑھا گویا کوئی اس کا پیچھا ہی تو کر رہا ہے اور پھر بیٹھتے ہی اس طرح کار کالج کی حدود سے نکل گئی گویا وہ کسی دشمن کے چنگل سے نکل بھاگا ہو۔

ادما نہ جانے کالج کے ایک کونے میں کھڑی کتنی دیر تک کیا سوچتی رہی — بے وجہ — یونہی — اور کار کے اسٹارٹ ہوتے ہی پر اس کی نظریں اس پر جا پڑیں — اس کی نظریں دور تک کار کا پیچھا کرتی رہیں — اور پھر اس نے کچھ سوچنا شروع کر دیا۔ یکایک وہ قریب کی آواز سے چونک پڑی۔

"یہ ادما کی بدمعاشی تھی رمیش کو سب کے سامنے ذلیل کرنا چاہا"

"وہ تو معلوم کیا سوچتا ہوا اوپر جا رہا تھا — نظریں نیچی کئے — اور وہ اپنی جوانی کے نشہ میں کھٹ پٹ کھٹ پٹ کرتی ہوئی اتر رہی تھی جیسے لائن کلیر سمجھ رکھا ہو — میں رمیش کے بالکل پیچھے ہی تو چل رہا تھا — دوسرے نے تائید کی

"نہیں بھئی ہم تو ادما کی ہی طرفداری کریں گے — آج اس کو اس نے ٹھیک ہی کر دیا ہم سب کی تحقیر کرتا تھا رئیس زادہ کہیں کا۔

"اچھا ہوا — بیٹا کو پتہ تو چلے کہ دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی" تیسرا انگلیوں کے چھلے کو نچاتے ہوئے بولا۔

"یہ کیا بات ہوئی — تم کس قدر جاہل ہو — پہلے نے اس کو حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم کو کچھ خبر بھی ہے کبھی اس کے قریب بھی گئے ہو۔ وہ خود کہتا ہے کہ بھائی میں بھی کتنا بدنصیب ہوں۔ امیر باپ کا اکلوتا بیٹا — جو صرف روپے اور نوٹ پر چل سکے — سو سکے۔ کھا سکے۔ پہن سکے۔ نوٹوں کی سرسراہٹ اور روپے کی کھنکھناہٹ سے ہی اس کے کان آشنا ہوں۔ کتنی مصنوعی زندگی ہے میری۔ انسان کو ذلیل کرنا میرا فرض بنایا جا رہا ہے۔ صرف اس لئے کہ میں ایک دولتمند کا بیٹا ہوں۔" تم نے سمجھا بھی ہے رمیش کو۔ پاس سرمایہ دار دیکھا اور بن گئے اس کے دشمن — کمیونزم کو اچھی طرح سمجھتے بھی ہو یا بطور فیشن کمیونسٹ بنے پھرتے ہو" — وہ اپنے مخاطب کو گھور رہا تھا تحقیر سے — جیسے وہ ایک جاہل گنوار ہو۔

"کیا مطلب — تمہارا —؟ اس نے پھر سوال کیا۔

"مطلب — ابھی تم یہ جانتے بھی نہیں کہ کمیونزم کا مقصد یہ نہیں کہ وہ کسی کو کھاتا پیتا دیکھ کر اس کو بھی اپنی طرح فقیر بنانا چاہے

بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہمارا طرز رہائش "Standard of Way" بھی بلند ہو جائے۔ سب پیٹ بھر کر کھا سکیں۔ سب ہی کو تمام قسم کی آسانیاں میسر ہوں۔ سب برابر ہوں۔ نہ کوئی چھوٹا نہ کوئی بڑا۔ اور آپ ہیں کہ ذرا سرمایہ دار کو دیکھا اور اس کے پیچھے پڑ گئے — یہ کیوں سرمایہ دار ہے۔ یہ کیوں ہم سے اچھی طرح رہتا ہے۔ اس کو سکون کیوں میسر ہے۔ ہم کو کیوں نہیں — ہم تین اس وقت یہاں موجود ہیں۔ ذرا بتلایئے کون ہندوستان کی اصلی غربت کی تصویر ہے۔ کوئی بھی نہیں — ہندوستان کے اصلی باشندے وہ ہیں جن کو دن میں پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی، اور وہی سب سے زیادہ کام کرتے ہیں۔ ہندوستان چالیس کروڑ باشندوں کا ملک ہے جہاں صرف پچاس لاکھ انسان ایسے بستے ہیں جو اطمینان اور سکون کی زندگی گزار رہے ہیں باقی ساڑھے انتالیس کروڑ بھوکے ننگے اور بے گھر ہیں۔ ہندوستان کی اصلی آبادی شہروں میں نہیں بلکہ ان گاؤں میں ہے جہاں وہ کسان بستے ہیں جو دن رات محنت کرکے اناج پیدا کرتے ہیں اور ان پچاس لاکھ انسانوں کو دے دیتے ہیں جو اس کے بدلے ان کے جوتے اور ٹھوکریں مارتے ہیں۔ ان میں صرف رمیش اور اس کا باپ ہی نہیں بلکہ ہم تم — ادما وغیرہ سب ہی تو ہیں" — اور پھر اس نے مخاطب کو اس حقارت سے دیکھا گویا اس کی کم علمی سے اس کو ایک ذہنی اذیت پہنچی ہو۔

"اچھا بابا — تم تو پیچھے پڑ گئے۔ مطلب صرف اس قدر تھا کہ غلطی کس نے کی؟" اس نے کھسیا کر کہا۔

"جی — رمیش کی نہیں بلکہ ادما دیوی کی غلطی ہے اس نے جان کر طمانچہ مارا تاکہ لڑکوں کی نظروں میں اپنی عظمت کا اظہار کرے۔ شاید شانتا آپٹے کی طرح اپنے پاکباز ہونے کا ڈھنڈورا پیٹنا چاہتی ہوگی — چھچھوری —"

ادما یہ سن کر جل ہی تو گئی — "پاکباز — چھچھوری!" اس کے کانوں میں الفاظ گونج گئے اور پھر وہ غصّہ میں کلاس میں داخل ہو گئی اور اس نے محسوس کیا جیسے تمام لڑکے لڑکیاں اس کو حقارت سے دیکھ رہے ہوں اور واقعی آج کی اس حرکت سے وہ ذلیل ہی ہو رہی تھی اور پھر وہ گھبرا کر درجے سے باہر نکل گئی۔

رمیش مسلسل تین دن تک ایک عجیب سی الجھن محسوس کرتا رہا — بس یونہی اس کو محسوس ہو رہا تھا کہ اب وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل ہی نہیں رہا، جیسے کسی طوائف نے غصّہ میں اس کی ناک کاٹ لی ہو، یا اس کے چہرہ پر کوئی بدنمائی آ گئی ہو جس کو وہ آئینہ تک میں گوارا نہ کر سکے — اس کا جی

چاہا کہ وہ ماں کو اتنا ہی ذلیل ہوتا دیکھے — بس کسی طرح — "بازار میں چلتے چلتے اس کے کپڑے ڈھیلے ہو کر گر پڑیں — یا وہ امتحان میں فیل ہو جائے اور ہوتی رہے، پھر کالج سے نکال دی جائے بلکہ اس سے بھی زیادہ کچھ — اس کو سیر بازار کوئی تانگے والا خوب گالیاں دے بلکہ ہو سکے تو مارے بھی۔ خوب چابک ہی چابک۔ اس کے کپڑے پھٹ جائیں۔ بدن سے خون بہنے لگے۔ تمام کالج کے لڑکے کھڑے ہو کر قہقہے لگائیں — نہیں بلکہ —" وہ اپنی ایک نئی تجویز پر مسکرا پڑا — "میں پیسے والا ہوں۔ ماتا جی سے کہہ کر اس کے گھر والوں سے اپنا بیاہ طے کرا لوں۔ بات پکی ہو جائے۔ اور برات کے عین وقت پر کوئی گندہ الزام لگا کر واپس کر دوں — ٹھیک —" اور وہ یہ سوچ کر مسکرا رہا تھا جیسے اس نے آدھا سے بدلہ لے لیا ہے — دھندلکوں میں آدھا کا مہندی لگا ہاتھ تھا — مہندی لگے ہاتھ — سیندور سے سرخ مانگ، افشاں چھڑکی ہوئی پیشانی — ڈھلتے ہوئے آنسو۔ ساری کے پلو میں ڈھانپتا ہوا چہرہ — دیکھ کر اس کا جی چاہا کہ زور سے قہقہہ مارے

آج تین دن بعد اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا — دس بجنے میں ۲۰ منٹ باقی تھے اور یونہی نیم شعوری طور پر اٹھا، کپڑے بدلے اور پھر کار کالج کی طرف دوڑانے لگا — یکایک ایک بار پھر اس کو خیال آیا کہ — "وہ انہی لڑکوں میں جا رہا ہے جہاں تین دن قبل ذلیل ہوا تھا —" اور غصے سے اس کی رگیں تن گئیں۔ خون کی گردش تیز ہو گئی۔ ہینڈل کو مٹھیوں میں سختی سے دبا لیا۔ سامنے کار کے شیشے میں سے پیچھے بھاگتے ہوئے درخت — جو سڑکوں کے کنارے مستقل کھڑے ہوئے تھے — لڑکے — بچے تانگے۔ سائیکلیں۔ غرض سب ہی اس کو منہ چڑھاتے ہوئے نظر آ رہے تھے — اور پھر اس نے — دور سامنے ایک نکتہ تانگے کی شکل کا دیکھا جو کار کی تیزی کے ساتھ ساتھ نزدیک آتا جا رہا تھا

"آ گیا —" اور اس کے دانت بھنچ گئے — آنکھیں شعلہ بار ہو گئیں — نتھنے پھول گئے۔ پنڈلیوں میں اینٹھن سی محسوس ہونے لگی — اور اس کا جی چاہا، تانگے کو اس زور سے ٹکر دے کہ وہ ہوا میں اچھلتی ہوئی دور جا گرے — بالکل گڑیا کی طرح، جیسے کسی بچے نے اچھال دی ہو — دانت نکلے۔ ٹانگیں اور ہاتھ مڑے ہوئے — خون سے لت پت۔ مکھیاں چہرے پر بھنبھناتی ہوئی — جا بجا کپڑے پھٹے ہوئے اور ایک ہجوم چاروں طرف — تانگہ جس کا ایک پہیہ کہیں دور جا گرا ہو، دوسرے میں تانگہ والا خود الجھا ہوا نیم مردہ حالت میں سسکیاں بھر رہا ہو — خون کے قطرے زمین پر ٹپ ٹپ گرتے ہوئے۔

"اور وہ گھبرا گیا اس منظر سے — اس کا جی چاہا کہ آنکھیں بند کر لے مگر وہ منظر واقعی سامنے تو نہ تھا۔ لیکن وہ اس تصویر کا پورا رخ دیکھے بغیر نہ رہ سکا — "بھیڑ میں سے ایک بڑھیا نکل کر تانگے والے سے لپٹ کر رونے لگی — تین معصوم بچے کھڑے ہوئے آہیں بھر رہے تھے — ظالم — جلاد — !! تجھے شرم نہیں آتی۔ ہم غریب — بے بس — تیرا کیا بگڑ گیا۔ پانچ دس ہزار دیئے اور چھڑا کر آرام کیا — لیکن ہم — ہماری کمائی — میرا سہارا — کتے ذلیل !! — خدا کرے تجھے موت آ جائے — تیرا گھر تیرا سب کچھ — ماں — باپ — بھائی — بہن — سب دانے دانے کو ترسیں" — اور وہ دھاڑیں مار کر رونے لگی — اور مجمع کا ہر شخص اس کو سوٹ میں دیکھ کر بھی لعنت کرنے لگا — "اندھے — رئیس زادے کہیں کے — آدمی کے بچے کار رکھتے ہیں جیسے سالے کے باپ کی سڑک ہے نا — ! بیٹا کو پھانسی ہونا چاہئے —" اور یہ سوچتے سوچتے اس نے دیکھا تانگہ واقعی اس کی زد میں آ گیا ہے — اور اگر وہ ایک سکنڈ پہلے ہوشیار ہو کر کار نہ کاٹتا تو واقعی یہی ہوتا جو وہ سوچ رہا تھا۔ دوسرے لمحے وہ آگے تانگے سے دور نکل کر ایک نکتہ بن گیا تھا۔

"سالے اندھے بن کر چلاتے ہیں — دیکھا مس صاحب — ابھی تانگہ الٹا ہوتا" اور تانگہ والا غصے میں اس کو دھیرے دھیرے گالیاں دینے لگا۔ لیکن آدھا نے تانگے والے کی بات سنی ان سنی کر دی۔ وہ کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔

اس کے خلاف کالج میں مذمت کا ریزولیوشن پاس ہونے کی اسکیم تیار ہو چکی ہے۔ اور اگر واقعی ایسا ہوا تو میں منہ دکھانے کے بھی لائق نہ رہ سکوں گی" — اور پھر اس کی آنکھوں سے نفرت کی ایک جھلک نمودار ہوئی اور پھر وہ تانگے کے نیچے سے دوڑتی ہوئی سڑک کو دیکھنے لگی۔ تیزی سے دوڑتی ہوئی جس پر دنیا بھر کی گندگی — جیسے کہ فلم کا ریل کھنچا چلا جا رہا ہو — پھر نیچے سے سفید موٹے موٹے حروف میں لکھا ہوا "Keep Left" تیزی سے نکل گیا — اور وہ چونک گئی۔ کالج قریب آ چکا تھا — دل دھک دھک کرنے لگا — "اب کیا ہو گا۔ یہ مذمت تو مجھے کہیں کا نہ رکھے گی — رشی معاف نہ کرے گا

اور یہ سوچتی ہوئی وہ تانگہ سے اتر گئی۔ سامنے کالج کے گھنٹے نے دس بجائے۔ قریب ہوسٹلوں میں سے سب لڑکے کیڑوں کی طرح نکل گئے۔ یکبارگی پھر اس کو اکی نظریں چبھتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ کسی نے اس کو چونکا دیا ——— "اوما مبارک ہو ———" ششی اس کے کمرے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر غیر معمولی مسرت جھلک رہی تھی۔ جیسے کوئی پرچہ آؤٹ نمبر "O" کر لیا ہو۔

"کیسی مبارکباد دے رہی ہو ———" اور ششی کے پیچھے اس کی نظریں رمیش کی کار پر جا پہنچیں جس کے پیچھے کیمسٹری ڈپارٹمنٹ کے سامنے Chemistry میں تین چار لڑکے کھڑے ان دونوں کی طرف کچھ اشارہ کر رہے تھے

"بھئی رمیش نے تم کو معاف کر دیا۔ جب اس کو پتہ چلا کہ خدمت کا ووٹ پاس ہونے والا ہے تو ابھی ہم سب کو اکٹھا کر کے استدعا کی کہ وہ ایسا نہ کریں۔ اوما کو خود اپنی غلطی کا احساس ہوگا اور وہ تجویز

"ہیں ——— اچھا ———" تو کیا اب کوئی میٹنگ میرے خلاف ہو گی؟" اس نے تعجب اور گھبراہٹ سے کہا۔

"ہوں ——— لیکن تم کو اس سے معافی مانگ لینا چاہئے۔ سوچو کتنا شریف لڑکا ہے ———" ششی نے تجویز پیش کی۔

"ہوں ———" اوما نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا ——— میں بھی کچھ یہی سوچ رہی ہوں۔" اس کی نظریں اب بھی کار پر گڑی تھیں۔

"میں ایک ترکیب بتاؤں ——— سنو تم اتوار کو وکٹوریہ پارک چلی جانا ——— بس وہاں وہ اسی وقت ۳-۱۱ بجے کے درمیان تفریح کرنے جاتا ہے ——— میرے خیال میں وہیں معافی مانگ لینا۔ اس کا اچھا ہی اثر پڑے گا اور ہاں ایک بات بتائے دیتی ہوں ——— وہ بڑی اسٹرانگ کیرکٹر کا ہے ——— کہیں عشق وشق نہ کر بیٹھنا ———" وہ مسکرانے لگی۔

"وکٹوریہ پارک ——— اچھا ——— بہتر ہے ———" اور وہ ہال ہلاتی ہوئی چلی گئی ——— اور اس کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ خود اپنی نظروں میں ذلیل ہو رہی ہو ——— اس کو اب ایک قلبی اطمینان تو تھا لیکن اب ضمیر نے لعنت ملامت شروع کر دی تھی۔ جیسے وہ کہہ رہا ہو ——— "دیکھی اس کی دریادلی! اعلیٰ ظرفی ———! اور تو تنگ دل۔ تنگ نظر چھچھوری ———" اور اس کو جی چاہا اپنے خوب طمانچے لگائے۔ تمام رخسار سرخ ہو جائیں اور پھر وہ سوچنے لگی۔ کتنا سخت بدلہ لیا۔ خود اپنی نظروں میں ذلیل ہو رہی ہوں ——— تو میں معافی مانگ ——— ؟"

بس یونہی ——— اس کا جی چاہا تمام کلینڈروں میں ایکدم تاریخ بدل جائے جمعرات، جمعہ، سنیچر سب پلٹ جائیں۔ بس اتوار ہو ——— بلکہ لندن سے ایک گھنٹہ کی کمی کی طرح پھر اعلان کر دیا جائے۔ کل بجائے جمعہ کے اتوار ہوگا اتوار کل ہی ہو جائے"۔ وہ رمیش سے معافی مانگ کر ایک سکون حاصل کر لے ——— یا پھر زمین اتنی تیزی سے گردش کرنے لگے کہ یہ تین دن ——— منحوس تین دن ——— جمعرات جمعہ اور سنیچر کالج اور مکان کا راستہ طے کرنے میں گذر جائیں اور وہ جب گھر پہنچے تو سنیچر الوداع کہہ رہا ہو ——— وہ ان تین دنوں میں یہی سوچتی رہی ——— مسلسل سوچتا ہر دم ——— ہر لمحہ۔ منٹ گھنٹہ غرض اسی میں گذر رہا تھا کہ ——— میں کس طرف اسے مخاطب کروں گی۔ ——— مسٹر رمیش مجھے افسوس ہے کہ ——— نہیں بلکہ دیکھئے جا کر کہوں ——— اوہ آپ ہیں، کہئے یہاں کیسے ——— اچھا ہاں آپ تو غالباً خفا ہوں گے اور ہونا بھی چاہئے ——— لیجئے معاف کر دیجئے ——— واقعی میں نے بڑی غلطی کی تھی ——— نہیں، یوں بھی نہیں ——— پھر اچھا اس طرح ایکسکیوز می مسٹر رمیش Excuse me Mr Ramesh کیا میں کچھ عرض کر سکتی ہوں ——— اور وہ کہے گا ——— جی فرمائیے ———! نہیں وہ اٹھ کر منہ پھلا کر چلا جائے گا تب ———!! اچھا تو یہی ٹھیک رہے گا ——— مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس دن آپ کی دل آزاری کی۔ اور میں واقعی اس دل سے پشیمان ہوں، مجھے کوئی موقعہ نہ ملا آپ سے معافی مانگنے کا۔ اور اگر اس نے ڈانٹ دیا ——— نہیں ڈانٹے گا تو نہیں ——— لیکن وہ اگر خفا ہی رہا تو ——— ؟" اور پھر جی چاہا کہ اس کے سرخ گلابی رخساروں پر اپنے ہونٹ رکھ دوں ——— یونہی رشوتاً ——— جیسی ——— !"

اور وہ ذہنی طور پر ایک بار پھر رمیش کے سامنے اپنے کو ذلیل دکھائی دینے لگی ——— اس کے باوجود اس کو محسوس ہوا کہ وہ رمیش کے لعاب دہن کی پیاسی ہے۔ اس کے ہونٹوں کی ہلکی ہلکی نمی جیسے کسی حسین دوشیزہ کے سرخ ناخن کا کٹا ہوا کنارا۔

اور اس نے ایک گہرا سانس لیا ——— ایک آہ ——— تنفس میں جیسے گرم گرم بھاپ ——— اس کو معلوم ہوا جیسے تمام جسم کی گرمی سانس کے ساتھ نکل گئی ہو اور وہ نڈھال ہو کر آرام کرسی پر جا لیٹی۔

اور جب اتوار کو صبح اٹھی تو کائنات کا ہر ذرہ شاداں نظر آ رہا تھا جیسے ذرہ ذرہ میں زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی ہو۔ ہر طرف مسرت اور میٹھا میٹھا سا نور ——— قدرے سردی میں بھی کمی آ گئی تھی ——— آدھ گھنٹہ

کی کوشش کے بعد اس نے گہری نیلی ساری کو پسند کیا۔ گورے گورے بدن پر گہری نیلی ساری بادلوں کو لپیٹے ہوئے ___ وہ کچھ نظر فریب دکھائی دے رہی تھی جیسے نیلے آسمان سے کوئی فرشتہ جھانک رہا ہو۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا ___ دھک! دھک!! اور اس کو ڈر لگنے لگا کہیں اس کے دل کی آواز کوئی سن نہ لے ___ اس کو محسوس ہونے لگا جیسے وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکے گی۔ ایک جملہ بھی اس کی زبان سے ادا نہ ہو سکے گا۔ حلق میں الفاظ ابھی سے پھنسے ہوئے معلوم ہو رہے تھے جیسے حلق کے باہر کرفیو آرڈر لگا دیا گیا ہو" یا وحشت ___ ! اور وہ اپنی حالت پر قابو پانے کے لئے آرام کرسی پر لیٹ گئی ___ اور پھر سوچنے لگی ___ "کیا کروں ___ ایک مصیبت ہو گئی ___" اور ایک بار اس کی نظروں کے سامنے رمیش کا معصوم چہرہ آ گیا ___ وہی حسین صورت جو طمانچہ کھانے کے بعد عجیب سی اداسی میں تبدیل ہو گئی تھی ___ جیسے کوئی سہاگن بیوہ ہو گئی ہو ___ یا جیسے کوئی بھرا مکان خالی ہو گیا ہو۔ ___ نہ معلوم کیا سوچ کر وہ میز پر جا کر کچھ لکھنے لگی ___ اس کے چہرہ پر ایک مسرت۔ ایک مسکراہٹ جیسے ساکن سطح آب پر لہریں پیدا ہو رہی ہوں۔ اور پھر وہ اپنا سُرمئی ہلکا اور کوٹ جسے وہ ہمیشہ پہنتی تھی کندھوں میں پھنسا کر دروازہ سے باہر نکل گئی۔

رمیش وکٹوریہ کے سفید سنگ مرمر کے مجسمے کے چبوترے پر انتہائی انہماک سے پنسل لئے کاغذ پر جھکا ہوا مصروف تھا کالے سوٹ میں وہ سفید سنگ مرمر پر کچھ اس طرح معلوم ہو رہا تھا جیسے چاندنی پڑھیا کا تصور ہو اکی خاموش لہروں میں جھولتے ہوئے بال آدما کو اس قدر بھلے معلوم ہوئے کہ بے اختیار ان پر اپنے ہونٹ رکھ دینے کو جی چاہنے لگا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا اور اس نے وہ پرچہ اپنے بلاؤز میں سے ہاتھ ڈال کر نکال لیا اور وہ اس کے قریب آہستہ آہستہ پہنچ گئی ___ پیٹھ کے پیچھے آ کر آہستہ سے وہ جھکی اور اس کی تیز نگاہیں اس کے شانے پر سے گذرتی ہوئیں اس کاغذ کی سطح پر پھیل گئیں ___ اور پھر وہ ایک دم چونک سی گئی۔ آنکھیں کشادہ ہو گئیں۔ استعجاب اور مسرت دونوں اس کے چہرے پر اس طرح اچھلنے لگے کہ اس کے رخسار سرخ ہو گئے۔ ہلکی سی شرم کی باریک لکیریں ہونٹوں کے دونوں سروں میں پیدا ہو کر رخسار تک جذب ہو گئیں ___ اور وہ سوچنے لگی ___ "میری تصویر ___ رمیش بنا رہا ہے ___ جس کو ابھی ایک ہفتہ قبل وہ طمانچہ مار چکی ہے

ذلیل کر چکی ہے اور پھر رمیش کو حسرت بھری نظروں سے اس نے دیکھا۔ دیکھا جیسے کوئی غریب بچہ کسی بڑی دکان پر کھلونا کو دیکھ کر ایک حسرت بھری نگاہ ہی جما دے ___ گہرا سانس ___ اور تنفس کی ہلکی سی گرمی نے اس کو چونکا دیا۔ رمیش نے اپنی چوڑی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر آنکھوں کو نیم وا کیا۔ نتھنے سکیڑ لیے اور ایک دم گردن موڑ دی۔

"ایں ___ آپ! یعنی کہ آپ ___" اور وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا ___ وہ سوچنے لگا ___ آج یہ سچ دیکھ کر کہاں نکل ___ پھر تو کہیں مرمت کرنے کا ارادہ نہیں وہ یونہی مسکرا دیا ___ ہاتھ میں اپنی بنائی ہوئی تصویر دیکھ کر ___ اور اس کو کھڑا ہوتا دیکھ کر اور بھی سکڑ گئی اور بالکل عمودی شکل میں ___ "میں اس لئے حاضر ہوئی تھی کہ اس دن جو مجھ سے" ___ اور اس کی نظریں رمیش کے ہاتھوں پر جا پڑیں جہاں ایک میں پنسل اور دوسرے میں کاغذ دبا ہوا تھا ___ جس میں اسکی مکمل تصویر تھی ___ مکمل اور عریاں ___ اور وہ جملہ پورا بھی نہ کر سکی غصّہ سے کانپ گئی ___ "تم نے ___ یہ تصویر بنائی ___" اس کے حلق میں جملے اس طرح اُلجھ رہے تھے جیسے حلق میں مچھلی کا کانٹا پھنس گیا ہو۔

رمیش اپنی بنائی تصویر کو اپنی نظروں کے سامنے لا کر بولا ___ "جی آپ کی تصویر ___ کوئی گناہ کیا ___؟"

"گناہ ___ ذلیل ___ آوارہ ___! تم پوچھتے ہو ___ تم کو شرم نہیں آئی اس قسم کی تصویر بناتے ہوئے ___ اور پھر میری ہی تصویر بنا کر کتنی دیدہ دلیری سے پوچھتے ہو ___ بے شرم ___ کمینے!! کتے!!!" اور وہ غصّہ سے کانپ گئی۔ اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں بار بار بھینچ بھینچ کر کھلنے لگیں اور وہ کاغذ اس کے ہاتھ میں گولی بن گیا۔ ساری کا پلو کندھے پر سے ڈھلک کر نیچے آ رہا۔ اور باوجود سردی کے اس کے چہرے پر پسینہ کی بوندیں جھلک آئیں۔

"دیکھئے ___ میں پھر عرض کئے دیتا ہوں ___ میں نے کوئی بے شرمی نہیں کی ___ کوئی ذلیل حرکت نہیں کی ___ اگر میں ایک دوشیزہ کی تصویر بناتا ہوں جو نہانے کے لئے کپڑے اتار کر انگڑائی لے رہی ہے تو اس میں بے شرمی کی کون سی بات ہے"۔ اور وہ زیر لب مسکرایا۔

"اچھا ___ بہت خوب ___ کون دوشیزہ ___ جو آپ کے سامنے کھڑی ہے ___ مجھے رسوا کرنے کے لئے یہ کچھ کم ہے ___" اس کے ہونٹوں پر ایک حقارت کی لکیر پیدا ہو گئی۔

"کم ــــ! اس نے طنزیہ کہا ــــ "محترمہ آپ نے میرے ساتھ
کیا برتاؤ کیا ــــ کچھ یاد ہے ــــ اس دن سب کے سامنے، ایڈیٹ ــــ
بے وقوف کہا ــــ ایک طمانچہ بھی مارا اور جس کی وجہ سے میں تین دن تک کالج
نہ آسکا ــ یہی نہیں بلکہ آج ذرا غور کیجئے آپ نے کیا کہا ــ کمینے ــــ! ذلیل!!
آوارہ ــــ!! بے شرم!!!! یہ سب کچھ کہہ کر بھی آپ مجھکو ہی مورد الزام
ٹھہراتی ہیں ــــ" اس نے مستقل مزاجی سے کہا۔
"جی ــــ میں نے اس وقت تنہائی میں سب کچھ کہا ہے ــ آپ کو
کسی کے سامنے ذلیل نہیں کیا ــ"
"بجا ــــ یہی چیز ہے جو مجھے عرض کرنا ہے۔ میں نے تصویر بنائی ہے
کسی کو دکھائی نہیں ــــ اگر میں نے اس تمام کوفت کا بدلہ اس طرح تنہائی
میں لے لیا تو کیا بیجا کیا ــــ!" اور رمیش اس کو اس کے ہی جواب پر پھانس کر
مسکرانے لگا۔
ادما نے بجائے جواب کے غصہ میں ہاتھ سے گولی زمین پر پھینک دی
اور تیز تیز قدم اٹھاتی چلی گئی ــ گویا وہ اس کے جواب سے مطمئن نہیں۔
"ارے سنو بھی ــــ!" اور وہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا ــ ادما کی طرف اسکی
نظریں اب بھی گڑی تھیں ــــ کو لمحے بار بار مٹک رہے تھے ــــ اور
پھر اس کی نظریں واپس چبوترے پر پھیل گئیں ــــ وہ سفید کاغذ
کی گولی اب بھی اس کے سامنے پڑی تھی ــــ جیسے کہہ رہی ہو ــــ
مجھے اٹھا لو ــــ پڑھ تو لو ــ دیکھو وہ کس مقصد سے آئی تھی ــــ
اور تم نے ــــ"
اور اس نے یونہی غیر شعوری طور پر گولی کو گھورا اور پھر اس
کو اس طرح پیار سے اٹھا لیا گویا کوئی ماں بچے کو ڈانٹنے کے بعد پیار
کرنے لگے ــــ ایں ــــ ارے یہ کیا ــــ وہ کاغذ پڑھ کر حیران
رہ گیا ــ وہ معافی مانگنے آئی تھی ــــ"
اور پھر وہ ادما کی سمت لپکا ــــ "ارے سنئے ــ سنو ادما
ــــ میں نے کہا سنئے تو ــ"
لیکن وہ تیز تیز قدم اٹھاتی رہی ــــ رمیش نے ایکبار زور
سے پکارا ــــ "ذرا سن لیجئے ــ" اس کو رکتا نہ دیکھ کر وہ اور تیز دوڑا
ــــ ہانپتے ہوئے ادما کا ہاتھ اس نے پکڑ لیا ــــ "میں نے کہا ــ!
میرا مطلب ہے ــــ کہ ــــ" وہ ہانپنے لگا ــــ "ٹھہرئیے ذرا سانس
ــــ ٹھیک ہو جائے ــ" اس نے دوسرے ہاتھ سے اشارہ کیا

اور وہ ہانپتا رہا ــــ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے ــــ چہرے پر
پسینہ کی کافی بوندیں نمایاں ہو گئی تھیں۔ بال بکھر کر پریشان ہو چکے تھے ــــ
آنکھیں بار بار جھک رہی تھیں ــ اور وہ اس کو یونہی دیکھ رہی تھی ــ جیسے
لطف اندوز ہو رہی ہو۔
"جی اب فرمائیے ــــ آپ نے اتنی محنت کیوں کی؟" ادما نے اپنا ہاتھ
چھڑانے کی رسمی کوشش کی۔
"جی ہاں ــــ میں ــ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آپ تو خفا ہو گئیں۔
ــــ چھوڑئیے اس خفگی کو ــــ کہیں یہ موسم خفا ہونے کا ہے ــ وہ
آپ کا پرچہ ــــ بس اب مجھے شرمندہ نہ کیجئے، ورنہ میں ــــ" اور
اس نے آہستہ سے اس کا ہاتھ دبایا۔
"کیا مطلب ــــ" اور پھر اس نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا ــــ
"میرا ہاتھ چھوڑ دیجئے۔"
"اوہ معاف کیجئے۔ مجھے خیال ہی نہ رہا ــــ ہاں تو مطلب یہ ہے کہ
اب لڑائی ختم ہوئی۔ میں نے آپ کو معاف کیا۔"
"لیکن میں نے نہیں کیا۔"
"بہت اچھا ــ آپ کی مرضی ــ" اب وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔
"آپ پریشان بہت کرتے ہیں ــــ" اس نے دلربایانہ انداز سے کہا
جو اس کا آخری حربہ تھا۔ اور پھر دونوں قدم ملا کر چلنے لگے

لڑائی ہی نہیں بلکہ سر چھٹی اور پھر سر دور وہ دونوں اسی طرح ملنے لگے
اور ان دونوں کو یہ محسوس ہونے لگا جیسے وہ ایک دوسرے کا جزو ہو کر رہ گئے
ہیں۔ کتنا عجیب تھا ان کا ملاپ ــــ ایک دن تو رمیش نے ادما کی گردن
میں باہیں ڈالتے ہوئے کہہ بھی دیا۔
"دیکھا ادما ــــ ہماری دوستی کی ابتدا کتنی تلخ ہوئی تھی اور انتہا ــ کاش
جو ہم چاہتے ہیں ویسی ہی ہو ــــ"
"کیا ــــ میں تو کچھ نہیں چاہتی ــ" اس نے انجان بن کر کہا۔
"کچھ نہیں ــــ یہ بھی نہیں کہ ہم دونوں ہمیشہ اسی طرح ملتے رہیں ــ"
"تو اس چاہنے اور نہ چاہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ملتے رہیں گے"
"کہہ دینا آسان ہے ــــ لیکن ایسا ہوا نہیں کرتا ــــ کم از کم ہندوستان
میں ایک لڑکا ــــ ایک لڑکی کبھی آزادی سے نہیں مل سکتے۔"
"کتنے کمزور ہیں آپ کے عزائم ــــ ہمت ہو ــــ اجان ارادے

ہوں ـــ !! عزم ہو ـــ !!! تو کوئی چیز ناممکن نہیں "

" اچھا چھوڑو ـــ ہاں یہ تو بتاؤ ـــ تم نے کبھی میری کمی بھی محسوس کی ہے ـــ !"

" کیا مطلب ـــ یہ آپ اکثر بے معنی سی گفتگو کیا کرنے لگتے ہیں "

" یعنی ـــ کہ تم کبھی یہ محسوس نہیں کرتیں کہ تم کو رشی کی کتنی ضرورت ہے ـــ بغیر رشی کے تم ـــ کبھی ـــ یوں سمجھو کہ ـــ کیا بتاؤں بھئی ـــ بس یہی کہ کمی محسوس کرتی ہو " اور وہ خود ہی شرما گیا۔

" نوازش کی تشریح فرما دیجئے ـــ ظاہر ہے میرے ساتھ نہیں رہتے تو کم ہوتے ہیں ـــ اور وہ مسکرا کر سینڈل سے ایڑی کے مرکز پر نصف دائرہ بنانے لگی۔

" عجیب بات ہے تم اچھی طرح سمجھتی ہو ـــ اچھا یوں سمجھو کہ جب میں تمہارے پاس نہیں ہوتا تو تمہارا کسی بات میں دل نہیں لگتا۔ اکثر رات کو لیٹے لیٹے چاند دیکھتے دیکھتے مجھے یاد کرنے لگتی ہو یا کسی دریا کے کنارے جا بیٹھنے کو دل چاہنے لگتا ہو کسی سے بات کرنے کو جی نہ چاہتا ہو ـــ بس اس کو ہی احساس کمی سمجھو ـــ " رشی نے اٹکتے اٹکتے کہا اور آما کی نظریں شرم سے گڑ گئیں۔

" جی ـــ یہ باتیں اٹھا رکھئے " آما نے جواب دیا۔

" دیکھو ـــ میں آج صاف کہہ دینا چاہتا ہوں تم اقرار کرو یا انکار کہ مجھے اب تمہاری ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ بلکہ صاف لفظوں میں ـــ یعنی کہ محبت ہی کرنے لگا ہوں " اور اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے کندھے دبا دیئے۔

آما نے تڑپتے ہوئے کہا۔ " ہاتھ ہٹا لیجئے "

" لیکن میرا جواب ـ ؟ "

" تو یہ سوال کیا تھا ـــ اس میں تو جواب دینے والی کوئی بات نہ تھی ـــ "

" دیکھو میرے جذبات کو اس طرح نہ روندو۔ ورنہ میں سمجھوں گا کہ تم نے مجھے ذلیل کرنے کا اب نیا ڈھنگ نکالا ہے "

" آپ ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے ہیں، بس یہی برا معلوم ہوتا ہے ـــ خیر ہوش میں لیجئے کہ آپ کی کمی مزید محسوس ہوتی ہے "

اور یہ کہتے کہتے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا شرم سے اور وہ آنچل کے کونے کو دانتوں میں دبا کر بل دینے لگی۔

" تو پھر ـــ طے " رشی نے آما کا ہاتھ کھول کر اس پر شرط باندھنے کے انداز میں ہاتھ مارا۔

" کیا طے ـــ " اس نے گھبرا کر پوچھا۔

" شادی ـــ " رشی نے مسکرا کر اس کے پلو کو اٹھا کر اس کے چہرے پر ڈالتے ہوئے کہا۔

" خیر میں ـــ اس سلسلہ میں پھر کسی وقت آپ سے گفتگو کروں گی " اور یہ کہہ کر وہ جلدی ـــ " الوداع ـــ "

پروفیسر کے سوال پر وہ چونک پڑی۔

" اس پیراگراف کی تشریح تم کرو ـــ " پروفیسر نے اپنا چشمہ ٹھیک کرتے ہوئے مکرر کہا۔

وہ سٹ پٹا گئی ـــ کون سا پیراگراف ـــ اس کو تو معلوم ہی نہیں، وہ نہ معلوم کس دنیا میں کھوئی ہوئی سی تھی سب سے بے خبر ـــ جیسے کسی گہرے مسئلہ کا حل سوچ رہی ہو اور وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی ـــ جی ـــ ؟

" میں آما یو لیو دی کلاس (you leave the class) "

اور پروفیسر پھر لیکچر دینے میں مصروف ہو گیا۔

تمام طلبا اور طالبات کی نظریں چند ساعتوں کے لئے اس پر جا پڑیں جہاں اب بھی ایک گہری سوچ اور تفکر کے آثار تھے۔ کوئی شرمندگی یا پشیمانی قطعی نہ تھی۔ اور وہ آہستہ سے اپنی نوٹ بک سنبھال کے کلاس سے باہر نکل آئی۔ اس کو محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بالکل کھوکھلی ہو گئی ہو۔ کسی نے اس کے جسم میں ہاتھ ڈال کر سب کچھ کھینچ لیا ہو ـــ اس کی روح تک کھینچ چکی ہو ـــ دماغ بالکل ماؤف تھا ـــ نیم غنودگی کا عالم ـــ اور وہ برگد کے نیچے بنچ پر بیٹھ گئی یونہی ـــ کلاک ٹاور پر نظریں جا ٹکیں ـــ جو بلندی سے اس کی طرف تحقیر آمیز نظروں سے اس کو گھور رہا تھا، اور پھر اس کی نگاہیں دوسری طرف ہوسٹل پر جا پڑیں جہاں دو لڑکے بیٹھے بستر باندھ رہے تھے۔ شاید مکان جا رہے ہوں۔ ان کے چہروں پر ایک مسکراہٹ تھی ـــ دلکشی، شگفتگی ـــ ان کو دیکھتے دیکھتے وہ پھر سوچنے لگی ـــ " مجھے کیا ہو گیا آج ـــ آخر دل اتنا اچاٹ کیوں ہے۔ ہر طرف اداسی ہی اداسی ـــ اور پھر اس کو رشی کے وہ الفاظ یاد آ گئے " تم کو ملال نہیں لگتا ـــ تو کیا واقعی بغیر رشی کے میں اداسی سی محسوس کروں گی۔ مسرت ـــ ہنسی ـــ سکون ـــ اطمینان ـــ یہ سب رشی کے ملنے پر منحصر ہیں۔ رشی، مجھے کیوں اس قدر یاد آ رہا ہے " اور اس کو معلوم

ہوا جیسے رشمی سامنے شہر کی سڑک پر کھڑا ہے اور مسکرا رہا ہو ۔ آج تم کو بہری مسرت محسوس ہوئی ۔ شیک اپنا تم کو مبارک ہو گئی ہے ۔ اور وہ یہ سوچ کر مسکرا دی ۔ محبت سے بڑی بات ہی جوان ہونے اور محبت کرنا شروع کر دی ۔ دل دھڑکنے لگا ۔ پسینے آنے لگے ۔ نگاہیں جھکنے لگیں اختلاج ہونے لگا ۔ نیند غائب ہو گئی ۔ جواب دیا ۔ بہت تکلیف دینے لگا بھی چاہنے لگا ۔" اس نے دانتوں سے نچلے ہونٹ کو دبا کر ایک ٹھنڈی سانس لی اور پھر اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے ۔ اور پھر کسی خیال سے روال روال کانپ گیا ۔ ایک جھرجھری سی آئی اس نے آنکھیں بند کر لیں ۔ اس کے تانگے کے آنے میں ابھی کافی دیر تھی ۔ وہ آہستہ آہستہ پیدل ہی گھر روانہ ہو گئی ۔ آفتاب اپنا نصف راستہ طے کر چکا تھا ۔ سردی کی وجہ سے ہلکی ٹھنڈی ہوا کی چادر نے اس کی کرنوں کو مضمحل کر دیا تھا ۔ قریب ہی ہوٹل میں بے فکر لوگ خوش گپیاں کر رہے تھے ۔ قہقہے اور ترنم ریزیاں چاروں طرف بکھر رہی تھیں ۔ ریڈیو پر دوپہر کے پروگرام کے مطابق کوئی فلمی ریکارڈ بج رہا تھا ۔ دلخراش دل سوز سا

اے درد ذرا دم لے کروٹ تو بدلنے دے

اس کی آواز میں درد تھا سوز تھا ۔ وہ گا رہی تھی ۔ اور اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی روح کھنچ رہی ہو ۔ اس کا روال روال تڑپ اٹھا ۔ آس پر اداسی اور گہری ہو گئی تاریک سایوں کی طرح ۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور اس کی آنکھیں ایک بار پھر ڈبڈبا آئیں ۔ رومال میں آنسو جذب کر کے وہ تیز قدم اٹھانے لگی ۔ اس درد بھری آواز کی لامحدود وسعتوں سے دور بہت دور ۔ وہ بھاگ جانا چاہتی تھی ۔ تیز تیز قدم اٹھاتے اٹھاتے وہ ہانپنے لگی اور گھر میں قدم رکھتے ہی وہ نڈھال ہو کر مسہری پر جا پڑی ۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی آنسو چھلک رہے تھے ، اور پھر کانپتے ہوئے قطرے رخساروں پر پھیل گئے ۔ غیر ارادی طور پر وہ ٹکٹکی باندھے سامنے دیوار کے جھولتے ہوئے رنگین پردے کو دیکھنے لگی ۔ پھر نہ معلوم کب نیند نے آ دبایا ۔

جب شام کو انگڑائی لیتی ہوئی وہ اٹھی تو سامنے گھڑی پر اس کی نظر ابھر کر رہ گئی ۔ چار بج چکے تھے اس کو پارک جانا تھا لیکن اس کو پھر ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ آج رشمی سے نگاہیں ملا بھی نہ سکے گی ۔ یہ بھی ایک شرم ۔ جھجک ۔ حیا ۔ لیکن وہاں نہ جائے یہ بھی مشکل تھا ۔ وہ سوچنے لگی "میں آج اس قدر متاثر کیوں ہو رہی ہوں ۔ رشمی مجھ پر اس طرح حاوی ہوتا جا رہا ہے ۔ کیوں ۔" اور بے ساختہ اس نے آہستہ سے گنگنایا سا

"یہ وہ نازک حقیقت ہے جو سمجھائی نہیں جاتی"

وہ گنگناتی ہوئی غسل خانہ میں جا کر منہ دھونے لگی ۔ سر میں ہلکا ہلکا بھاری پن بے وقت سونے سے مزید ہو گیا تھا لیکن ۔ اختلاج ۔ گھبراہٹ ، اداسی سب اس سے کوسوں دور تھے ۔ ایک غیر معمولی سکون ، طمانیت اور امنگ سی پیدا ہو رہی تھی ۔ اس کا جی چاہنے لگا کہ وہ دھیرے دھیرے گانے لگے عطر بیز ہواؤں میں رقص کرے ۔ مشک بیز فضاؤں میں اچھلے کودے ۔ اور پھر اپنے کو کسی کے حوالے کر دے ۔ گرم گرم ۔ نرم بانہوں میں کھو جائے اس کو موٹے موٹے دبلے ۔ ۔ ۔ اپنے ہاتھوں کے حلقہ میں لے کر اپنے جسم کی گرمی پہنچائے اور پھر وہ بدمست ہو کر اس سے لپٹ جائے اور وہ یہ سوچتے ہوئے کپڑے بدلنے لگی ۔ اور پھر رومال پر عطر حنا چھڑکتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گئی ۔

آج وہ بحث کرے گی شادی اور محبت ۔ ایک بار پھر اس نے سوچا ۔ "رشمی پر ثابت کر دوں گی محبت کے لئے شادی ضروری نہیں ۔ جسم فروشی اور محبت دو جدا چیزیں ہیں ۔ ایک نفسانی خواہش کی تکمیل کرتی ہے انسانی نسل برقرار رکھتی ہے اور دوسری روحی سکون مہیا کرتی ہے ۔ یہ سن کر وہ کتنا شاداں ہو گا خوش اور میں پھر اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہوں گی ۔ "میں تم سے محبت کرتی ہوں ۔ میرے دیوتا ۔" اور وہ یہ سوچتے سوچتے شرما گئی ۔

رشمی اس کو آتا دیکھ کر کچھ سوچنے لگا ۔ جیسے جملہ بنا رہا ہو "تم نے بڑی دیر کر دی ؟" اس نے سوال کیا ۔

"ہوں ۔ کہئے پھر ۔" اس نے ہوں کو کھینچتے ہوئے کہا اور پھر رشمی کی انگلیوں میں اپنی انگلیاں پھنسا کر وہ چلنے لگی ۔

"تم کالج سے آج جلدی چلی آئیں ۔ میں تمہارا انتظار ہی کرتا رہا ۔"

"ہاں پروفیسر صاحب نے کلاس سے نکال دیا تھا ۔"

"کیوں ۔ خیر تو ہے ؟"

"خیر چھوڑئیے ۔ اس وقت میرا دماغ حاضر نہ تھا ۔ بس ۔"

"کچھ طبیعت تو خراب نہیں ؟"

"بس اب چھوڑئیے ۔ آپ تو یہاں شرافت سے کوسوں دور نظر آ رہے ہیں ۔" اس نے تنگ آ کر کہا ۔ اور رشمی جھینپ گیا ۔

"معاف کرنا ۔ اور اس نے جھینپ مٹانے کے لئے اس کی انگلیوں میں سے اپنا ہاتھ نکال کر کمر میں ڈال دیا ۔

"اور ہاں — وہ کل والی ہماری گفتگو نامکمل ہی رہی —" اس نے موضوع بدلا

"آپ شروع کر دیجئے میں آپ کو مطمئن کر دوں گی —" اور وہ دونوں ٹہلتے ٹہلتے وکٹوریہ کے سفید مجسمہ کے نزدیک پہنچ گئے۔

"شروع اور ختم کو کوئی قصہ نہیں صاف بات تو یہ ہے کہ تم سے میں محبت کرتا ہوں۔ اور اسی وجہ سے شادی کا خواہشمند ہوں۔ اگر تم کو کوئی اعتراض نہیں تو طے کر لیں —" اور اس نے اوما کو اپنے برابر سفید چبوترے پر بٹھا لیا۔

"ہاں تو آپ کے نزدیک محبت شادی کا ایک جز و ہے۔ افسوس! لیکن میں اس نظریہ سے اختلاف رکھتی ہوں۔"

"کیا —! کیا مطلب تمہارا — کیا تم مجھکو پسند نہیں کرتیں؟" رمیش نے جلدی سے کہا۔

"پسند کا سوال نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ اگر ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں تو یہ لازمی نہیں کہ شادی بھی ضرور کریں —" اس نے دھیرے اطمینان سے کہا۔

رمیش نے اوما کی صورت حیرانی سے دیکھی — اس کے چہرے پر ایک سنجیدگی تھی — وہ سٹ پٹا گیا اور پکار اٹھا — "اوما یہ کیا کہہ رہی ہو — کیا تم مجھ سے شادی کرنے کے لئے تیار نہیں ہو —" اور وہ اٹھ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"آپ پھر شادی کہہ رہے ہیں۔ آپ میرا مطلب ہی نہ سمجھ سکے میری نظر میں محبت ایک پاک جذبہ ہے جو صرف دو روحوں کو ملاتا ہے۔ ایک دوسرے کو ہمیشہ قریب دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے دکھ سکھ، رنج و غم، ہنسی خوشی غرض سب کا حصہ دار بنتا ہے — لیکن شادی —! جس کا مقصد سوائے بقائے نسل انسانی۔ خواہشات نفسانی کے اور کچھ نہیں۔ میں نہیں کہتی میں شادی کو ناجائز نہیں تو جائز بھی قرار نہیں دیتی — میں صرف شادی کو اس لئے پسند کرتی ہوں کہ محبوب ایک دوسرے کے نزدیک ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہو جاتے ہیں لیکن محبت کے لئے شادی کرنا میری نظر میں محبت کی توہین ہے — سمجھے رمیش —!" اور وہ اپنی اس تقریر پر مسکرا پڑی جیسے کوئی نہایت کامیاب لیکچر دیا ہو اور بال سنوارتے ہوئے اس نے رمیش کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

"دیکھو اوما شرارت نہ کرو۔ بلکہ سب باتیں سنجیدگی سے کہہ ڈالو۔ میں اس تقریر کو سننے کے لئے قطعی تیار نہ تھا — میں خود تم سے اس سلسلہ میں گفتگو کرنا چاہتا تھا لیکن ہمیشہ شرم دامنگیر ہوئی — اور آج اس کو طے کرنا ہی ہوگا — اب یہ تمہارے اختیار میں ہے۔ مجھکو ایک مسلسل عذاب کا شکار کر دو یا لافانی مسرت کا ہار پہنا دو —" اور اس نے اداس ہو کر اپنی گردن ڈھیلی چھوڑ دی۔

"دیکھو رمیش میرا کہنا یہ ہے کہ — میرا نظریہ یہ ہے — یہ دوسری بات ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے ہمیشہ نزدیک اسی طریقہ سے رہ سکتے ہیں۔ محبت جسمانی لحاظ سے میری نظر میں محبت نہیں گناہ ہے —" اور وہ چپ ہو گئی جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو اور کہہ نہ سکتی ہو۔

"مجھے تم سے والہانہ محبت ہے — آہ! یہ پن ہے — آخر تم میرا امتحان کیوں لے رہی ہو —" وہ جذبات سے لبریز ہو کر گھٹنوں کے بل اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ ہاتھ کانپنے لگے اور دانتوں میں ہونٹ دب کر سرخ ہونے لگے۔

وہ رمیش کو اس طرح دیکھ کر گھبرا سی گئی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر اس کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ مرد کی آنکھ میں آنسو — یہ جب ہی آتے ہیں جب اس کی تمام قوتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اور یہ سوچ کر اس نے اس کے بازو پکڑ لیئے

"رمیش — ارے یہ تم کو کیا ہو گیا — اتنے گھبراتے کیوں ہو۔" اور اس نے اس کا سر اپنی نرم نرم باہوں کے اندر کر لیا۔

رمیش کی کنپٹی اس کے دھڑکتے ہوئے سینہ پر جا لگی۔ دو نرم نرم گرم گرم ابھاروں کے درمیانی خلا میں سے دھک دھک کی آواز اس کو صاف سنائی دے رہی تھی — اور اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی انتہائی سکون اور راحت کی جگہ میں آگیا ہو

اوما کہہ رہی تھی — مجھے تم سے محبت ہے — پریم ہے — عشق ہے — تم میری روح ہو سب کچھ ہو — ہم دونوں کبھی جدا نہیں ہو سکتے۔ بھگوان نہ کرے اگر ہماری شادی نہ بھی ہو سکی تو میری روح تمہاری رہے گی —" اور اس نے رمیش کا سر اٹھاتے ہوئے آہستہ سے اپنے سرخ ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے — آنکھیں بند ہو گئیں۔ رمیش کو محسوس ہوا جیسے سردیوں میں گرم گرم بھاپ لگ رہی ہو اور اس نے اس کو اپنی باہوں میں کس کے دباتے ہوئے اپنے ہونٹ اس زور سے ان پر رکھے کہ دانتوں تک کی سختی اس کو محسوس ہونے لگی اور اس کا جسم آگ کا ایک شعلہ بن گیا جیسے کسی نے پیر سے لے کر چوٹی تک اس کو دہکتی ہوئی آگ میں ڈال دیا ہو۔ پھر دوسرے ہی لمحہ دونوں ایک دوسرے

سے جدا ہو گئے — نگاہیں جھکی جھکی — اوپر اٹھانے کی کوشش کی لیکن جیسے ان پر کوئی وزنی پتھر رکھے ہوں اور وہ نگاہ نہ ملا سکے۔

~~~ ❊ ~~~ ❊ ~~~

"دوستو — ! آج ہم آپ صاحبان کو ایک عجیب و غریب خوشخبری سناتا ہوں لیکن قبل اس کے کہ وہ خوش خبری آپ لوگ سنیں ذرا سنبھل کر بیٹھ جائیے۔ ممکن ہے تعجب بجز تاثی — سے آپ اپنے آپے میں نہ رہیں اس کے ساتھ ہی میں صاحب صدر سے استدعا کروں گا کہ وہ مسٹر رشی اور مس ادما کو ڈائس کے سامنے تشریف لانے کا حکم دیں۔"

شکیل اسٹیج پر کھڑا تقریر کر رہا تھا اور اس کے اس آخری جملہ پر تمام ہال میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔

ادما اور رشی — "کیا آج پھر کوئی تماشہ ہونے والا ہے۔"

اور کسی نے جملہ چست کیا — غالباً آج کشتی کا انتظام ہوا ہوگا اور پھر سب کی نظریں رشی اور ادما کی جانب ہو گئیں۔

شکیل نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ذرا خاموشی سے بیٹھئے۔ ابھی سب پروگرام آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ ہاں تو صاحب صدر نے ابھی تک دونوں حضرات کو حکم نہیں دیا —"

رشی اور ادما جھکی جھکی نگاہوں سے اسٹیج پر رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اور ہال میں ایک شور مچ گیا۔ تالیاں بے پناہ — اور پھر یہ شور آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہو گیا۔ جیسے کسی نے ساکن پانی میں ایک کنکر پھینک دیا ہو اور لہریں پیدا ہو کر پھر آہستہ آہستہ پانی ساکن ہو جائے۔

خاموش — خاموش — ہاں تو اب آپ سب حضرات ایک خوشگوار حادثہ کی اطلاع سننے کے لئے تیار ہو جائیے۔ آپ سب کو اچھی طرح یاد ہوگا کہ مس ادما جب کالج میں داخل ہوئی تھیں تو کچھ عرصہ بعد ایک عجیب و غریب حادثہ سیڑھیوں پر پیش آیا تھا — مسٹر رشی سے ٹکر — اور مسٹر رشی اس حادثہ کے بعد ۳ دن تک کالج نہ آئے — نہ معلوم کیوں — بہرحال آج آپ سب صاحبان تعجب کریں گے کہ وہ حادثہ ایک نئے معاہدہ کی صورت میں تبدیل ہو گیا — یعنی ہر دو ساتھی اپنی زندگی کے آئندہ ... ایک دوسرے ... کے بعد ساتھ ہی گذاریں گے

"مبارک — ! مبارک !" (Congratulations)

"کانگریچولیشن۔ تھری چیرس فار مسٹر اینڈ مسز رشی۔" اور ہال ایک بار پھر شور سے بلند ہو گیا۔ باہر درخت کانپ گئے۔ سڑک چلتے ہوئے راہگیر ٹھٹک گئے — اور لڑکوں میں سے کسی نے اٹھ کر دونوں کے گلے میں گوٹے کے ہار ڈال دیئے — تالیاں پھر بلند ہوئیں۔ "خاموش رہئے" اور شکیل اپنی جگہ سے اتر آیا۔

صدر نے میز پر رکھے ہوئے پیپر ویٹ (paper weight) کو زور سے مارتے ہوئے کہا — "آرڈر — Order" مجمع پھر آہستہ آہستہ خاموش ہو گیا۔ جیسے ایک ہوا کا طوفان تھا جو آیا اور گذر گیا۔

"اب مسٹر جگدیش ایک ریزولیوشن پیش کریں گے۔" صدر نے کہا۔

ایک دبلے پتلے لمبے قد کا لڑکا اپنا چشمہ اور بال درست کرتا ہوا ڈائس تک آیا۔

"دوستو — ! میں کوئی خاص بات لے کر حاضر نہیں ہوا۔ ہمارا ایک مطالبہ ہے جس کی تائید کسی ایک کو نہیں بلکہ آپ سب کو کرنا ہوگی — میں پڑھ کر سناتا ہوں۔"

"طلبا کا یہ جلسہ عام رشی اور مس ادما کو ان کے اس نیک اقدام پر مبارکباد دیتے ہوئے اپنی دلی خواہشوں کا اظہار کرتا ہے اور ہر دو ساتھیوں سے پر زور مطالبہ کرتا ہے کہ کل شام مسٹر رشی اور مس ادما اپنی ہونے والی شادی کی خوشی میں اس جلسہ عام کو ایک شاندار پارٹی اپنے بنگلہ پر دیں۔ جس میں طلبا کے علاوہ کالج کے پروفیسر اور پرنسپل صاحب بھی شرکت کریں۔"

تالیوں کا شور پھر بلند ہوا۔ اور ایک ہوحق مچ گئی — ہر جگہ سے منظور۔ منظور کی صدا بلند ہونے لگی اور تمام لڑکوں میں ایک عجیب سی بحث چھڑ گئی۔ "دیکھا ابتدا — اور انتہا — یہی ہیں قدرت کے کھیل۔"

~~~ ❊ ~~~ ❊ ~~~

"دیکھا ابتدا طمانچے سے ہوئی اور انتہا — بوسوں پر۔ بلکہ —"

"چپ رہو — بدتمیز — آگے کچھ نہ کہنا — بعید از انسانیت ہے۔" اور شکیل کا جملہ ادھورا رہ گیا پیچھے سے جگدیش نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا — "ارے سنا تم نے بڑی ٹریجڈی ہو گئی۔"

"ٹریجڈی !" اختر اور شکیل ساتھ بول پڑے۔ جگدیش کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں — وحشت اور پریشانی —

"ایں — بولو — آخر تمہاری صورت کیوں اتری ہوئی ہے —" اختر نے جگدیش کے کندھے جھنجھوڑ ڈالے

رشی کی کل رات کار الٹ گئی۔ اس کی حالت بہت نازک ہے اور ایک پیر میں ضرب آئی ہے۔ ابھی تک ہوش نہیں آیا۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے اگر حادثہ کے ۸ گھنٹے کے اندر ہوش نہیں آیا تو پھر کوئی امید نہیں — اس کے پتا جی — وہ تو بالکل پاگل ہو رہے ہیں۔ اور ادما وہ بھی

رات سے ڈیپ سے۔ گم سُم بالکل چپ۔ نہ آنسو نہ آہ۔ رات بھر پلک تک نہ جھپکی۔ جگدیش کے منہ سے جملے اس طرح نکل رہے تھے جیسے وہ کچھ اگلنے کی کوشش کر رہا ہو۔

شکیل اور اختر سنتے رہے۔ آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اختر کی پلکوں پر نمی کا گچھا لپٹا ہوا تھا — اور وہ دونوں چونک پڑے — "کس اسپتال میں —؟ آؤ چلیں اختر —"

"بڑے اسپتال میں وارڈ نمبر ۴۔ لیکن وہ شاید آپریشن روم میں ہوں گے" جگدیش نے اپنے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر کہا۔

اور جب وہ دونوں ہسپتال پہنچے تو آشا باہر بنچ پر بیٹھی تھی۔ گم سُم جیسے مجسمہ۔ چہرے پر سرخی کی جگہ زردی نے لے لی تھی — جیسے وہ کئی دن سے بیمار ہو — سفید ساڑی — اترا ہوا چہرہ۔

"آشا دیوی —" شکیل نے بڑھ کر اس کو ہلایا — وہ کسی کونے کو تکتے تکتے نہ معلوم کیا سوچ رہی تھی اور وہ چونک پڑی — "آپ؟"

اور وہ پھر انکی صورت دیکھنے لگی — بے نور آنکھیں جن میں آنسو خشک ہو چکے تھے۔ گرد آلود بال جیسے کسی خزاں رسیدہ درخت کی سوکھی شاخیں۔ پپڑی جمے ہوئے سرخ ہونٹ جیسے برسات نہ ہونے کی وجہ سے سوکھی اور چٹخی ہوئی زمین — اور پھر وہ کھڑی ہو گئی دیوار کا سہارا لے کر۔ مدقوق اور کمزور مریض کی طرح — اس کے رخساروں پر سوکھے ہوئے آنسوؤں کے نشان تھے جیسے دیواروں پر برسات کا پانی بہہ کر سوکھ گیا ہو۔

"بیٹھ جائیے — آپ اس قدر پریشان نہ ہوں۔ خدا سب ٹھیک کر دے گا —" شکیل نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"باوجی کہاں ہیں —؟" اختر نے پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب اپنے ساتھ سامنے والے روم میں لے گئے ہیں"

اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور اختر اس سمت چل دیا۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ہم دونوں آپ کے ساتھ ہیں۔ انشاء اللہ وہ صحت مند ہو جائے گا۔ آپ اطمینان رکھئے —" اور شکیل نہ معلوم کتنی دیر تک آشا کو یونہی سمجھاتا رہا۔ لیکن اختر اور باوجی کو آتا دیکھ کر وہ ادھر متوجہ ہو گیا۔ باوجی کا چہرہ مرجھا کر چھوٹا سا ہو گیا تھا۔ بڑھاپے کے نقوش یکدم ابھر آئے تھے جھریاں اتنی نمایاں ہو گئی تھیں کہ ان کو با آسانی گنا جا سکتا تھا۔ وہ ہانپ رہے تھے — کانپ رہے تھے۔ تھکا ہارا [illegible]

چھلک رہا تھا۔ شکیل اور آشا ان کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ باوجی شکیل سے لپٹ کر رونے لگے — بالکل بچوں کی طرح۔ اکھڑی سانسوں بے ربط آہوں میں وہ کہنے لگے — "شکیل بیٹا۔ میرا رمیش۔ دیکھو اس کو کیا ہو گیا ہے۔ تم لوگ بچالو۔ میری ایک ہی اولاد ہے۔" اور شکیل کو محسوس ہوا جیسے اسکے کندھے پر گرم گرم پانی کی بوندیں گر رہی ہوں۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ اس کو اپنا کلیجہ منہ کو آتا ہوا معلوم ہوا جیسے وہ سینے سے نکل کر باہر آ جائیگا — اور اس نے سانس کو اس طرح پیا جیسے کوئی چیز نگل گیا ہو۔

"باوجی آپ آرام کیجئے سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس کے گلے سے جملہ اس طرح نکلے جیسے وہ کچھ اگل رہا ہو۔

"آپ اطمینان رکھئے۔ آپریشن کے بعد وہ اچھا ہو جائے گا۔" اختر نے ان کو بنچ پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"لیکن بیٹا — یہ آپریشن تو بہت مہنگا رہے گا — میرا رمیش — میری نسل — یہ کیسے ہو سکتا ہے —" انکے تار نفس میں زلزلہ سا آگیا۔ گرم گرم آنسو ٹپا ٹپ زمین پر گر کر بہنے لگے اور انکی نظریں بے اختیار آشا پر جا پڑیں جس کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔

"چلئے آپ دونوں کو پہنچا دوں گھر — اب آپریشن کے بعد مل سکتے ہیں۔ میں ٹیلیفون کر دوں گا — شکیل تم ٹھہرو میں آتا ہوں —" اور اختر ان دونوں کو اپنے ساتھ لے کر چلا گیا۔ شکیل تنہا بیٹھا رہا۔ سفید دیواروں اور سنگ مرمر کے سفید فرش پر اس کی نظریں گھومنے لگیں۔ کوئی شکستہ دل ادھر ادھر پھر رہا تھا — عجیب سی بو تمام اسپتال میں اس طرح پھیلی ہوئی تھی جس کا احساس بھی شاید جاتا رہا تھا — سفید چمکتی ہوئی دیواروں پر ایک ایسی حسرت برس رہی تھی جیسے کوئی جوان بیوہ اپنے شوہر کی لاش کے قریب کھڑی ہو — وہ سوچ رہا تھا — یہ در و دیواریں — یہ حسین دروازے — اور کھڑکیاں — جالی دار روشندان — خوبصورت ہونے پر بھی کس قدر تکلیف دہ ہیں — رمیش اور آشا کی نئی امنگیں۔ نئے جذبات۔ لٹی محبت۔ سب ایک مسلسل غم ہو کر رہ گئے ہیں" اور کبھی کبھی اس کے خیالات کو کسی مریض کی دردناک گونجتی ہوئی چیخ — رونے کی دلخراش آواز یا کھانسی — ہلکا ہلکا گونجتا ہوا شور — منتشر کر دیتے۔ وہ پھر یہ محسوس کرتا کہ وہ اسی بنچ پر بیٹھا ہے — اور نہ معلوم وہ کیا سوچنے لگتا — انسان بھی کتنا مجبور ہے — ہنسی مذاق اور لطف اندوز ہونے کے وقت — وہ قہقہے لگاتا ہے — گاتا ہے —

چلتا پھرتا اور اچھلتا کودتا دیکھ کر وہ رنج نہیں کرتا لیکن غم اور تفکرات میں سوائے سوچنے یا کبھی کبھی بے کار پانی بہانے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا۔ یکایک اس کو اختر نے چونکا دیا —— وہ دونوں کو چھوڑ کر واپس آچکا تھا —— وہ غیر ارادی طور پر کھڑا ہو گیا ——

"ڈاکٹر شکیل چلیں"

"کہاں؟"

"دیکھیں آپریشن ہو چکا ہوگا —— خدا اس کو صحت دے" —— اور اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری —— نہ معلوم کس خیال سے شکیل اور اختر کانپ گئے۔ ایک جھرجھری آئی، رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کنپٹیاں سن ہو گئیں اور تمام جسم پر چونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

"کٹ کٹ کٹ کٹ —— کی باریک اور بھیانک آواز پر دونوں چونک پڑے۔ سرخ و سفید رنگ۔ گداز نیم عریاں پنڈلیاں مخصوص سفید لباس میں نرس ان دونوں کے نزدیک مسکراتی ہوئی رک گئی اور ان کو ایسا معلوم ہوا جیسے جنت سے مریم اتر آئی —— وہ کہہ رہی تھی —" کانگریچولیشن (Congratulation) آپریشن کامیاب رہا آپ دونوں اب مل سکتے ہیں—" اور کٹ کٹ کی باریک آوازیں اس کے سینڈل کی نوک دار ایڑی سے بند ہو کر آہستہ آہستہ اداسی میں مل گئیں —— دونوں کے چہروں پر مسرت کے ہلکے ہلکے آثار پیدا ہوئے۔ آنکھوں میں چمک، ہونٹوں پر تبسم اور چہرے پر توانائی کی ہلکی سی جھلک نمودار ہوئی اور دونوں آپریشن روم جا پہنچے۔ لیکن ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ چہرہ فق ہو گیا۔ منہ کھلے رہ گئے اور بشاشت کی جگہ اداسی چھا گئی —— وہ اس ماحول کو دیکھ کر سٹپٹا سے گئے — کریپ کی بے شمار پٹیاں رتیش کے ہاتھ، کمر اور ٹانگ پر لپٹی ہوئی تھیں۔ جن میں کہیں کہیں جمد کا ہوا خون جذب ہو کر دھبوں کی صورت میں پھیل گیا تھا — ڈاکٹر —! نرسیں —! کمپوڈر —!!! سب ہی تو سفید کفن پوش نظر آ رہے تھے — ایک ناقابل برداشت بو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ میز کے نیچے بے شمار سرخ اور سفید دھجیاں پانی کی بالٹی میں پڑی تھیں —— نئے نئے نشتر چمکتے ہوئے سیدھے اور خمدار آلات —— منہ پھاڑے ہوئے قینچیاں میز پر —— جن کے پیچھے سرخ۔ سفید۔ زرد دواؤں کی شیشیاں کھلی اور بند بے ترتیبی سے رکھی تھیں۔

ڈاکٹر نے اشارے سے دونوں کو روک دیا اور وہ وہیں رک گئے — ایک ... دوسرے کی طرف یونہی غیر ارادی طور سے دیکھا اور پھر ان کی نظریں چاروں طرف اسٹریچر اور آئیں پر جم گئیں جو آپریشن ٹیبل پر سے رتیش کو ...... اسٹریچر پر وارڈ میں پہنچانے کے لئے سہارا دے کر اٹھا رہے تھے

〰〰 ❖ 〰〰 ❖ 〰〰

"ایک مہینے سے زیادہ ہو گیا۔ تم نے میرے لئے دن رات ایک کر دیا! اس خود غرض زمانے میں جبکہ ماں، باپ، بھائی، بہن اور دوست کوئی بھی کسی کا ساتھ نہیں دیتا —— تو آپ اپنی عمر کے کسی حصے میں بھی تمہارے اس احسان کو نہیں بھول سکتا۔ میری یہ دوبارہ زندگی صرف تمہاری ہی وجہ سے ہوئی ہے"

"دیکھئے آپ روز اسی قسم کی باتیں کیا کرتے ہیں" پھر اس نے شرم سے ساڑی کے پلو کو مروڑتے ہوئے کہا۔ "میں یا آپ کوئی الگ تو ہیں نہیں —— میں نے جو کچھ کیا اپنے لئے"

"لیکن اوما تم دیکھتی ہو میری ایک ٹانگ بے کار سی ہو رہی ہے۔ میں اب تمہارے قابل کہاں ہوں۔ کاش تم سمجھ سکتیں"

اور رتیش نے سانس لے کر اس طرح ٹھنڈی آہ بھری جیسے اس کی کوئی شے کھو گئی ہو — اس نے اپنے ہونٹ کو دانتوں میں دبا لیا۔ ایک قطرہ اس کی کنپٹی پر بہہ گیا۔

"آپ پریشان کیوں ہیں — آپ کو اسی وقت ایک صحیح دوست کی ضرورت ہے ایک سہارا — میں آپ کا سہارا ہوں۔ رتیش بابو، شاید آپ کو یاد ہوگا میں نے آپ سے کئی مرتبہ کہا ہے۔ محبت جسم سے نہیں روح سے کی جاتی ہے اور شاید آپ اب یہ سوچتے ہوں گے کہ آپ کے پیر کی اس بے نمائی کی وجہ سے میں کترا جاؤں گی — کاش آپ سمجھ سکتے۔ وہ دوسرے ہوتے ہیں جو جسم کی بناوٹ اور صورت پر جاتے ہیں۔ میرے یہاں محبت نفس پرستی کا نام نہیں۔ میری تو صرف یہ خواہش ہے۔ صرف یہ کہ آپ کے نزدیک رہوں۔ آپ کی خدمت کرتی رہوں۔ آپ کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھا کروں۔ میں آپ کو ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ آپ اتنے افسردہ کیوں رہتے ہیں ہنسئے — بولئے۔" اور اوما نے جذبات میں اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں دبا لیا گرم گرم ہتھیلیوں میں —

"اوما —— کیا بتاؤں —— کاش میں کہہ سکتا —" اور اس نے خلا میں نظریں پھینک دیں۔

"آپ کچھ نہ کہئے — بس خاموشی سے سو جائیے۔ ڈاکٹر نے زیادہ سوچنا منع کر دیا ہے۔ شکر ہے کہ اب آپ ایک ہفتہ بعد اسپتال چھوڑ دیں گے۔

کسی کے سہارے چل سکیں گے، اور پھر خود چلا کریں گے۔ میں آپ کو روز پارک میں سہارا دے کر چلایا کروں گی — آپ کو کیا یہ پسند ہے — ہر طرف دواؤں کی شیشیوں کے ٹوٹنے کی آوازیں چٹیاں — یہ دردناک چیخ اور پکار — اچھا لگتا ہے — یہ ماحول — میرا تو دم گھٹا جاتا ہے —" اور وہ کھڑکی میں سے ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھنے لگی۔ سرخ سرخ کرنیں بادلوں کے سفید ٹکڑوں کے کناروں کو رنگین بنا رہی تھیں، اور وہ آہستہ آہستہ رنگتے ہوئے سرخ و سفید ٹکڑوں کو گھورنے لگی — یونہی گھورنا، اور پھر سوچنے لگنا بے مقصد — اور اسی طرح اس نے بہت سے دن بھی گذار دیئے — اور جب ڈاکٹروں نے کہا۔

"اب آپ جا سکتے ہیں لیکن کسی کے سہارے روز ۵ منٹ کھلے میدان میں پھرنا ضرور پڑے گا"

تو اوما کے چہرے پر ایک عجیب سی لہر دوڑ گئی، گھبراہٹ آمیز خوشی — بالکل اس پردیسی کی طرح جو ایک عرصہ بعد اپنے گھر واپس جا رہا ہو اور ریل میں بیٹھے بیٹھے منزلِ مقصود قریب آنے پر کھٹ پٹ کرتی ہوئی پٹریاں — بوسیدہ اور پرانی عمارتیں اس کے سامنے تیزی سے نکلنے لگیں — اور اس کا دل دھڑکنے لگے۔

اور شام کو جب اوما رمیش کے پاس پہنچی تو اس کے چہرے پر اداسی سمٹ آئی تھی — جیسے سورج غروب ہونے کے بعد ہر طرف پھیل جاتی ہے اور اس کو محسوس ہوا جیسے رمیش بالکل پروفیسر بوس کی طرح ہے جو فلسفہ کی طرح خشک ہے — اس کا جی چاہا کہ رمیش کے چہرے پر ایکبار خم اور شکنیں دیکھے جن میں صدہا شرارتیں پوشیدہ ہوں، مسکراہٹ اس کے چہرے پر ہلکے ہلکے حسین گڑھے پڑجائیں اور تین دانت نچلے ہونٹ پر جھک گئے تھیں۔ بالکل اس دوشیزہ کی گوری گوری انگلیوں کی طرح جو کواڑ بھڑنے کے وسط دروازے میں سے باہر نکل آتی ہیں۔

" اوہ آپ تو ابھی تیار بھی نہیں ہوئے" ذرا جلدی ہو جائیے نہیں تو دیر ہو جائے گی"

"کہاں —" رمیش کے چہرے کی اداسی شکنوں میں تبدیل ہو گئی۔

"پارک — آپ کو میرا سہارا لے کر ۵ منٹ چلنا ہی پڑے گا — دیکھتی ہوں آپ کیسے نہیں چلتے"! اس نے اپنی پوری رعنائیوں کو اس کے سامنے واضح کر دینا چاہا — اس وقت وہ بالکل حسین معلوم ہو رہی تھی — اور وہ تو آئی تھی قیامت برپا کرنے کے خیال سے بجلیاں گرانے کے انداز میں — لیکن — !

اور سامنے بابوجی کو دیکھ کر وہ سمٹ گئی — نئی دلہن کی طرح — "نمستے"! اور پھر وہ ساری کے پلو سے کھیلنے لگی۔

بابوجی نے اس کو دیکھ کر رمیش پر ایک پرحسرت نظر ڈالی، آنکھوں میں دو ننھے ننھے موتی چمک اٹھے اور دوسرے لمحے وہ رومال میں جذب ہو گئے — "جیتی رہو —" انکی آواز بھرا گئی" دیکھو رمیش تم کار نہ چلانا، ٹرام پکڑ لینے جاؤ —" اور یہ کہتے ہوئے وہ چلے گئے۔

رمیش نے اوما کی طرف دیکھا جیسے وہ دوا کی کڑوی شیشی ہو اور پھر اس نے ایسی صورت بنائی گویا یہ دوا اس کے حلق میں اتر گئی —

اور اب وہ دونوں کارسکے نرم دبیز گدوں پر اچھلتے ہوئے سڑک پر دوڑ رہے تھے۔ اوما رمیش کے اور نزدیک سرک گئی۔ اس کا ہاتھ اپنے نرم ہاتھوں میں لے کر سہلانے لگی — نہ جانے کیوں اس کو اس کے کھردرے بال دار سخت ہاتھ کو چھونے میں کیا لطف آتا تھا۔ یکایک اس نے دیکھا رمیش کی خشک آنکھوں میں نمی آگئی ہے اور وہ حیران رہ گئی۔ اس کو محسوس ہوا رمیش اس سے قطعی دلچسپی نہیں لے رہا۔ اس کے چہرے پر ایک منٹ کے لئے بھی شگفتگی نہیں آتی — اور وہ سوچنے لگی — کیا میں اس پر زبردستی مسلط ہو گئی ہوں — یہ آخر کیوں — مجھ سے مسکرا کر باتیں کرنا۔ ہر وقت مجھے دیکھ کر مسکرا دینا آخر یہ سب کچھ کیوں تھا۔ اور اب یہ اتنا کیوں بدل گیا ہے — کیا میں اس کو پسند نہیں ہوں میری کمر میں ہاتھ ڈال کر ملنا جلنا کیا اب اس کو پسند نہیں رہا — کیا میرے ہونٹوں میں اب کوئی چمک باقی نہیں رہی — اور موٹر کے رکنے پر وہ چونک پڑی اور جھٹکے سے اس کا سر رمیش کے سینے سے جا ٹکرایا — اس کے بالوں کی ایک لٹ اس کے بٹنوں میں الجھ گئی۔ رمیش نے مسکراتے ہوئے اس کے بال نکال دیئے — اور وہ بھی اس کو دیکھ کر مسکرا دی — آج کتنے ہفتے بعد وہ مسکرایا تھا اور وہ بھی چند ساعتوں کے لئے۔

اوما اس کو سہارا دے کر اتارنے لگی۔

رمیش کو محسوس ہو رہا تھا کہ اوما میں اب کوئی دلکشی نہیں۔ اس کا ابھرا ہوا سینہ — رس بھرا دل اور گداز بازو — رسیلے ہونٹ منور نگاہیں — پتلی کمر — ان میں اب کوئی کشش اور جاذبیت نہیں —!

نہ معلوم کیوں اس کو وہ ایک عام انسان نظر آنے لگی۔ صرف ایک ملاقات تھی۔ اس کا دل بالکل اچاٹ ہو گیا ــــــ اس کے ساتھ پھرنے اس کی خواہشات کو پورا کرنے سے ــــــ یہی کہ اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے ــــ کبھی کبھی چھیڑ خانی کرے ــــ چٹکے لے۔ ہلکے سے اس کے گالوں پر چپت مارے ــــ یا پھر لے اختیار ہو کر چوم لے ــــ اپنے جسم سے پیوست کر لے ــــ اس کے ادھ کھلے ہونٹوں پر اپنا مد ملا کر بیٹھے ــــ اور اس کو محسوس ہونے لگا جیسے وہ بیمار ہے۔ بخار میں مبتلا مریض جس کو منہ کی بدمزگی کی وجہ سے اچھے سے اچھا کھانا بھی پسند نہ آتا ہو ــــ!

اور یہی خلا ارما محسوس کر رہی تھی ــــ کتنی تبدیلی ہو گئی ہے رمیش میں ــــ وہ ہنسی ــــ دل لگی ــــ شوخی ــــ اور اس کو اپنی کمر میں ایک کریہہ سی محسوس ہوئی ــــ جیسے وہ کسی کے ہاتھ کی منتظر ہو ــــ اپنے بازوؤں میں خلش سی۔ جیسے ان کو کوئی مضبوط ہتھیلی مسلنے کے لئے بڑھ رہی ہو ــــ اور وہ ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگتی ــــ اور کبھی کبھی وہ اپنے ہونٹ کو دانتوں کے نیچے زور سے دبا لیتی۔

آخر ایک دم اس نے رمیش کو سنگ مرمر کے چبوترے پر ٹہلتے ہوئے ٹوک کر کہہ ہی دیا

"تم اتنے بدل گئے ہو ــــ اب تم میں وہ جذبات نہیں ــــ وہ امنگیں نہیں ــــ تم اتنے روکھے پھیکے کیوں نظر آنے لگے ــــ ہر وقت معلوم ہوتا ہے جیسے رونے والے ہو ــــ کیا تم کو مجھ سے پہلی سی محبت نہیں ــــ کیا مجھ سے خفا ہو ــــ آخر کیوں ــــ ــــ بولو ــــ رمیش!" اور اس کا سانس پھول گیا۔ آواز بھرا گئی سینہ کا اتار چڑھاؤ تیز ہو گیا۔ ایک ہاتھ کی مٹھی کس کے بند ہو گئی اور دوسرے ہاتھ سے رمیش کو ہاتھ کو زور سے دبانے لگی۔

لیکن رمیش نے جذبات سے بغیر متاثر ہوئے کہا۔

"نہیں ارما میں بتا سکتا۔" اور اس کی آنکھوں سے دو موتی لڑھک کر بغیر پیہہ گئے۔ ہونٹوں کو اس طرح زبان پر پھیرا جیسے وہ طویل مدت سے پیاسا ہو ــــ چہرے کی رہی سہی رونق جاتی رہی۔ نتھنے پھولنے لگے ــــ اس نے ایک ٹھنڈی سی آہ بھری اور پھر اس نے سانس کو سنگا نیچے ہونٹ کو دانتوں میں دبا لیا۔ اس کو محسوس ہوا جیسے اس کے رونگٹے کھڑے ہو کر مرجھاتی ہوئی گھاس کی طرح گر گئے ہوں اور اس نے بڑے ضبط سے اپنے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے میں کس کے دباتے ہوئے کہا۔

"میں تمہارے لائق نہیں۔"

"جی ــــ کیا ــــ کہا ــــ؟" جیسے اس کے کان کھڑے ہو گئے ہوں۔ کلیجہ ... نکلتا ہوا محسوس ہوا ــــ سینے میں جیسے زلزلہ آ گیا ــــ آنکھیں کھلی رہ گئیں ــــ سانس گھٹتی ہوئی محسوس ہوئی اور وہ بالکل بے حس و حرکت ہو گئی ــــ پھر اس کی گردن ڈھیلی ہو کر اس طرح گر پڑی جیسے کسی نے پھول مسل کر پھینک دیا ہو

"ہاں ــــ میں انسان ضرور ہوں ــــ لیکن دیکھنے کا ــــ چلنے کا ــــ پھرنے کا ــــ بولنے کا ــــ اور کھانے پینے کا آدمی ــــ لیکن مجھ میں ــــ"

اور جیسے اس کے حلق میں کچھ اٹک گیا ہو اور وہ رک گیا، وہ پھر اس نے جیسے کچھ ضبط کرتے ہوئے کہا ــــ

"لیکن مجھ میں اب وہ حس نہیں۔ جو انسان، حیوان، اور سب جاندار میں برابر ہوتی ہے۔ کاش! تو جی مجھے مر جانے دیتے ــــ ایسی زندگی سے تو موت بہتر" اور اس کی ہچکی سی بندھ گئی۔ اس نے شرم سے گردن جھکا کر آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ گرم گرم بھاپ اور آنسوؤں نے اس کے چہرے کو بھگو دیا۔

ارما نے رمیش کو دیکھا ایک حسرت سے اور وہ ساکن ہو گئی۔ جیسے اس کا گھر اجڑ گیا ہو۔ اور پھر اس کو محسوس ہوا رمیش میں کوئی دلکشی نہیں ــــ کوئی جاذبیت ــــ اور نہ معلوم کیوں دل کی گہرائیوں سے کسی کونے سے نفرت کا ایک ہلکا سا جذبہ ابھرتا ہوا محسوس ہوا ــــ اور پھر اس نے رمیش کو اس طرح دیکھا جیسے کوئی اپنے بچے کے کھلونا ٹوٹنے پر بچے کو دیکھا کرتا ہے۔ ایک دم اس کو خیال آیا جیسے اس نے اس کی تیمارداری میں اتنا ان کی پرواہ نہ کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے ــــ بے کار وقت ضائع کیا ہے۔ اس نے رمیش کو عجیب نگاہوں سے دیکھا ــــ جہاں اس کو اتنا بڑا جسم ــــ خالی ــــ اور کھوکھلا نظر آیا۔ جیسے کسی لکڑی کو دیمک اندر ہی اندر چاٹ گئی ہو۔ بے کار ــــ! ناکارہ!!

اپنوں کی حکومت

الطاف مشہدی

مجھے کہنی ہے اک ایسی کہانی — سنی میں نے جو اشکوں کی زبانی
تمہیں بھولا نہ ہوگا وہ زمانہ — کہ تم تھے ایک حسرت زا فسانہ
زمیں پر بھوک اگتی تھی ہر اک سو — فلک روتا تھا خوں آلود آنسو
برستی تھی فلاکت جھونپڑوں پر — نقاہت حکمراں چھوٹے بڑوں پر
دیارِ سرخوشی دار المحن تھا — ہر اک کھیتی پہ طاری بانجھ پن تھا
پیا عصمت کا خوں زرداروں نے — جھکائیں گردنیں ناداریوں نے
تجوری تھی خداوندِ زمانہ — شرافت بن چکی تھی اک فسانہ
بہی کھاتہ کی زنجیریں تھیں اور تم — پریشاں حال تقدیریں تھیں اور تم
تمہیں تاکا تھا ذلت کی قضا نے — مقدر ہو چکے تھے جیل خانے
تمہارے لب تھے محروم تبسم — بھلا بیٹھے تھے تم طرزِ تکلم
جہالت چار سو منڈلا رہی تھی — فلاکت موت بن کر چھا رہی تھی

اُسے کیا واسطہ رُت کی پھبن سے
بہاریں چھن چکی ہوں جس چمن سے

مگر اک وقت یہ بھی تم پر آیا — کہ تم سے زیست نے پنجہ ملایا
لگے آنے مسرت کے پیامی — تمہیں دولت نے دی جھک کر سلامی
زمینوں نے اگل ڈالے خزینے — بہے افلاس کے رُخ پر پسینے
بیاباں میں بہاریں مسکرائیں — نشیلی ندیاں ملہار گائیں
جنے صحراؤں نے انمول موتی — گئی غربت یہاں سے خون روتی
مگر کس نے تمہیں جینا سکھایا — جھنجھوڑا، خوابِ غفلت سے جگایا

تمہارے در پہ سب کا سر جو خم ہے
یہ اپنوں کی حکومت کا کرم ہے

انجم صہبائی۔ بی۔ اے

زنداں

شہر کے شور و شغب ..... گھڑ گھڑ .... شر رر زرر .... زرر کو چیرتی جاتی، ٹیکسی کسی ہونق ہرنی کی طرح فرّاٹے بھرتی نامپلی اسٹیشن کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ کشادہ سڑک تارکول کی کالی اوڑھنی اوڑھے سو رہی تھی۔ دونوں بازؤں پر دو منزلہ، سہ منزلہ عمارتیں میرے سامنے سے یوں بھاگی جا رہی تھیں جیسے میں بائیسکوپ کا تماشہ دیکھ رہا ہوں، کہیں لامبے لامبے ٹیڑھے میڑھے تاڑ کے درخت کھڑے اپنے ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے خدا حافظ کہہ رہے تھے اور رہ رہ کر مجھے یہ خوف کھائے جا رہا تھا کہ کہیں میں late نہ ہو جاؤں: اتنے میں ٹیکسی ایک جھٹکے کے ساتھ اسٹیشن کے خوردیدہ سر احاطہ میں رُکی، ٹرین چھوٹنے میں آٹھ منٹ باقی تھے —— بہ وقت تمام انور نے ٹکٹ خریدا اور میں نے سیکنڈ کلاس میں اپنا بستر بچھا دیا۔ اٹیچی کیس اوپر والی برتھ پر رکھکر رسالوں کی دو تین کاپیاں ریشمی تکیے پر پھینک کر میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں افریقہ کے تپتے ہوئے میدانوں میں سانس لے رہا ہوں، پلیٹ فارم چیخ و پکار اور شور و غوغا کا مارکیٹ بنا ہوا تھا۔ اور عجیب گھما گھمی کا منظر! انگڑائیاں لے رہا تھا، ہر شخص زاد راہ قلیوں کے سر پر لادے نشست حاصل کرنے کی دوڑ دھوپ میں غلطاں و پیچاں تھا ان کے اس انہماک، تیز گامی، اور زبوں حالی کو دیکھکر مجھے اپنی خستہ حالی کا خیال آیا۔ میں نے اپنے آپ پر ایک چھچلتی ہوئی نظر دوڑائی۔ سفید سفید ازار بند میری پنڈلیوں کو چوم رہا تھا، شیروانی کے بٹن جلد بازی میں کھلے کے کھلے رہ گئے تھے اور جیب میں سے میرا فونٹین پن رکوع کی حالت میں جھکا ہوا تھا۔ قصہ کوتاہ میری حالت صحرا نورد مجنوں سے کیا کم تھی —— میں نے اپنے آپ کو چہرے مہرے سے درست کیا، اتنے میں ریل کے ناخدا نے سیٹی بجائی —— فیروز اور انور نے مجھے خدا حافظ کہا۔ میں ناگپور جا رہا تھا جہاں میرے چچا سخت بیمار تھے، راج پھوڑا انکے خون کو جونک کی طرح چوس رہا تھا اور جسم کو دیمک کی طرح چاٹے جا رہا تھا۔ چھک چھک ...... چھک چھک کی آوازیں مجھے ایک لطیف نغمہ انگڑائیاں لیتا محسوس ہو رہا تھا —— نغمہ کے لفظ پر میرے خیالوں کے دروازے پر ستار کی ٹوم .... ٹوم نے دستک دی، موسیقی سے مجھے والہانہ عشق ہے، ستار، سرود، رباب بربط، دلربا، شہنائی، بانسری یا پھر کسی آتش نوا مطرب کے کیف ریز نغمے سُن کر میں جھوم جھوم اُٹھتا ہوں —— مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ شہد سے بھی میٹھے سُریلے بول کان کی راہوں سے میرے دل میں اُترے جا رہے ہیں اور روح میں گھُل مِل جاتے ہیں میری نس نس میں مسرت ناچ اُٹھتی ہے اور میں خیال و تصور کے ایک نغمہ بر دوش میں سانس لینے لگتا ہوں سرود و کیف کا عجیب و غریب جذبہ میرے روئیں روئیں سے لپٹ جاتا ہے۔ فنون لطیفہ یوں تو انسانی حس کو جھنجھوڑنے، دربان پر طلسم ہوشربا جا کر چھا جانے کی قوت لا یموت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ لیکن فنون لطیفہ کی اس شاخ ..... موسیقی کا میرے جسم اور روح پر ایسا سرور انگیز اثر ہوتا ہے جسکو میں الفاظ کی زبان میں بیان نہیں کر سکتا ..... چھک چھک، زندگی کی ریل گاڑی ..... انسان ایک مسافر چھک چھک .... چھک چھک کوئی دو تین اسٹیشن چلکر اپنا سفر زندگی ختم کر دیتا ہے —— کوئی دس بارہ ..... کوئی دو تین جنکشن اور —— طول طویل سفر —— طول طویل زندگی۔ چھک چھک ...... چھک چھک —— اتنے میں کھوں کھوں .... کی آواز نے میرے تخیلات کی مال گاڑی کو سگنل دے دیا۔ اب میں نے اپنے ماحول کا جائزہ لیا، ایک سن رسیدہ بزرگ سفید پوش، مخملی دو پلی ٹوپی اوڑھے، چڑھاؤ زرکار جوتیاں پہنے زربفت سے کاڑھے

ہوئے بٹوے سے پان نکال کر کھا رہے تھے پھر میری نظر اُن کے V for victory - ۷ سی ٹھوڑی پر لٹکے ہوئے خضاب آلودہ چکور کے کٹے سے اُلجھ پڑی ..... مونچھوں کا میلوں پتہ نہ تھا ان بزرگ کو دیکھ کر حاتم طائی کی قلمی تصویر میں کھینچ آئی جیسے چہرے سے یہ حاتم کے جڑواں بھائی معلوم ہو رہے تھے اور اپنی بھونڈی اور غیر شاعرانہ آواز میں مرزا غالب کا یہ شعر گنگنا رہے تھے ؎

گر سیہ بخت ہی ہونا تھا نصیبوں میں مرے
زلف ہوتا ترے رخسار پہ یا تل ہوتا

میں نے محو حیرت ہو کر کہا "اُف یہ سن و سال اور یہ رنگین خیالی" ـــ پھر وہ امیر احمد مینائی کا دیوان "صنم خانۂ عشق" اپنے بازو سے لگا کر اپنے برتھ پر نیم دراز لیٹ گئے، اس لئے نواب کے پاس کوئی اور جاگتا ہوا نہ تھا ـــ کونے میں ایک سوبچہ ٹانگیں پھیلائے عجیب بے ہنگم انداز میں محو خواب تھا نیند میں اس کا ایک ہاتھ نیچے لٹک آیا تھا۔ جیسے پولیس والا سائڈ دکھا رہا ہو۔ ادھر والی برتھ پر ایک ادھیڑ عمر کے لالہ صاحب اپنی دھرم پتنی کے ساتھ براجمان تھے وہ سرگوشیوں میں اپنی بیوی سے باتیں کئے جا رہے تھے۔ جیسے عاشق و معشوق کسی کنج میں بیٹھے راز و نیاز میں مصروف ہوں ـــ اب میں نے دریچہ سے اپنا سر باہر نکالا، تاکہ فطرت کا روپ دیکھوں ـ میں فطرت کا جنون کی حد تک پرستار ہوں ورڈزورتھ کی طرح ـــ اونچے اونچے ریت کے تودے کالی کلوٹی پہاڑیاں چھوٹی موٹی جھیلیں، چیل سنتھ کے جھنڈ کے جھنڈ الغوزہ جھاڑیاں ـــ نیم، کیکر، شہتوت ببول۔ اعلیٰ کے دیو قامت درخت، ٹیڑھی میڑھی بل کھاتی رقص کرتی پگڈنڈیاں جانے کس کی تلاش میں دیوانہ وار بھاگی جا رہی تھیں۔ میری نظروں کے آگے سینکڑوں منظر اُبھرتے اور ڈوبتے جا رہے تھے، بنجر زمین، لہلہاتے کھیت، موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے سیم وش پانی سے بھرے ہوئے جل تھل جن میں اپنا مکھ دیکھ کر چاند ستارے سنگھار کرتے ہیں کالی راتوں کی طرح سیاہ پہاڑ، یونانی خداؤں جیسے دیو قامت درخت ـ یہ مصور فطرت کی بنائی ہوئی تصویریں ہیں ـ غرض میں فطرت کے اس لامتناہی البم کا ماہرانہ مطالعہ کر رہا تھا ـ کہ ہوا کے دوش پر مجھے کچھ براق ایسے سفید مٹیالے اور چتکبرے جنگلی کبوتر تیرتے نظر آئے ـ کتنے آزاد ہیں یہ پنچھی ـ آزادی کے تصور پر میرے دماغ میں ہندوستان کی بدقسمت غلامی کا خیال

ابھرا ـ جیسے کسی نے میری روح کے سینے میں انگن کا دہکتا ہوا گولہ رکھ دیا ہو میں غیر شعوری طور پر چیخ اٹھا میری چیخ ریل کی چھک چھک میں گھل مل گئی ـ ہم ہندوستانی کتنے سیاہ بخت ہیں ڈیڑھ صدی سے غلامی کے زنداں میں مبتلا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر سسک سسک کر دم توڑ دیتے ہیں۔ کہتے ہیں قربانیاں محنتا اور آہ و زاری ایک نہ ایک دن ضرور رنگ لاتے ہیں، پیر فلک کا کلیجہ شاید لاکھوں ہندیوں کی قربانی لیکر، سیروں خون چوس کر، منوں گوشت پوست اور ہڈیاں چبا کر ابھی ٹھنڈا نہیں پڑا۔ اگر ان کی قسمت میں، ابد تک غلامی ہی لکھی ہے تو پھر آج ہی ہمالیہ کیوں نہیں ٹوٹ پڑتا۔ تباہ کن زلزلے ان غلاموں کے سینوں میں جلتے ہوئے لاوے کو منوں مٹی کے نیچے کیوں نہیں دفن کر دیتے یا پھوٹ لیتے سندھ، ستلج، برہم پتر، گنگا اور جمنا کے سینوں سے سیلاب کے شرارے چھوٹ کر ـــ طوفان نوح بپا کر ان محکوم زندہ لاشوں کو اپنی گہرائیوں میں آسودۂ خواب کیوں نہیں کر دیتے ـ آزادی کے الفاظ ہندوستانیوں کے لئے سراب اور خواب بے تعبیر سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے ..... پھر میرے تصور کے اسٹیج پر مہاتما جی اُبھر آئے جو عدم تشدد کی دھوتی پہنے سوراج اور آزاد ہند کے نعرے لگا رہے تھے ـ دوسری طرف قائد اعظم ابھر آئے ـ وہ پاکستان کا وظیفہ پڑھ رہے تھے ـ ان دونوں کے بیچوں بیچ راجہ جی کھڑے مسکرا رہے تھے اور اپنے فارمولے کی ایک ایک کاپی دونوں رہنماؤں کو دکھا رہے تھے، ادھر کچھ فاصلہ پر مہاسبھائیوں نے کانگریس کے خلاف ایک الگ ترنگ بجا رکھی تھی ..... لیگ، قوم، اکالی، سکھ اور دوسرے اقلیتوں کے لیڈر اپنے اپنے مفادات کی حفاظت کے لئے سیاسی دنگل میں کودنے کے لئے تیار کھڑے تھے ـ اور ادھر مشرق بعید سے نیتا جی آزاد ہند فوج کے ساتھ ہندوستان کے دل کی طرف بڑھتے چلے آ رہے تھے ـــ اف یہ خیالات و تصورات کی لہریں کیجا ہو کر بہیں گی اور کب یہ چالیس کروڑ غلاموں کا سیلاب تسبیح کے دانوں کی طرح متحد ہو کر آزادی کی جھلمل جھلمل کرتی راہوں پر گامزن ہوگا ـ غلامی آزادی ..... آزاد پنچھی اور غلام ہندوستانی ـــ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ خیالوں کے اگن بم سے میرے جسم میں سر تا سر آگ لگی ہوئی ہے۔ چھک چھک ..... چھک چھک ......"آپ پان نہیں کھائیگا" ان لکھنوی نواب نے میری جانب ایک سنہری ڈبیہ بڑھاتے ہوئے کہا ـــ شکریہ ـــ میں نے ایک پان لے لیا ..... زردہ؟ ...... جی شکریہ! وہ اپنے کا نوالہ میں ایک چھوٹا سا لاؤڈ اسپیکر ایسا آلہ لگائے میری گفتگو سن رہے تھے "کہاں جا رہے ہیں جناب عالی" میں نے جھینپتے ہوئے ان نواب صاحب سے

دریافت کیا" جی میں ایک دوست کی شادی میں دہلی جا رہا ہوں ــــ بڑا اصرار کیا تھا بیچارے نے اب یہ طول طویل سفر کرتے ہی بنے گی ــــ اور آپ جی میں ناگپور جا رہا ہوں۔ جہاں میرے چچا سخت بیمار ہیں" "اچھا جی" انھوں نے عجیب مضحکہ خیز انداز میں کہا۔ میں نے معاوضتاً انھیں سگار پیش کیا۔ انھوں نے معذرت چاہی ــــ سگرٹ سے مجھے یوں بھی نفرت ہے۔ اکثر سگریٹ نوشوں سے میں نے سنا ہے کہ افکار و تخیل میں غلطاں و پیچاں انسان کا یہ بہترین مونس و غمگسار ہوتا ہے۔ مجھے تو یہ بات کچھ مضحکہ خیز سی معلوم ہوتی ہے۔ تین انچ کی سفید ململ رسی کاغذی نلی جس کے پیٹ میں بدبودار تمباکو بھرا ہوتا ہے ــــ جسے لوگ اسکو اپنے ہونٹوں سے چپکائے ہونٹوں میں گرفت ڈال ڈال کر کثیف سا دھواں اپنے ناک، منہ اور پیٹ میں بھر لیتے ہیں اور بڑے عجیب عجیب زاویوں سے صاف و پاک ہوا میں پھونک مارتے ہیں ــــ اور شاید اس دھوئیں میں لپٹی لپٹائی کئی ناکام و نامراد عاشقوں کی آہ و زاری اور آنسوؤں کے آبشار اور گنگا جمنا چھپے ہوتے ہیں۔ جو ابر باراں میں تبدیل ہو کر برس پڑتے ہیں ــــ میں کبھی کبھی سگار پی لیتا ہوں ــــ جانے کیوں۔ اس موٹے بھدے سے سگار کو منہ میں رکھ کر تھوڑی دیر کے لئے میں اپنے آپکو چرچل محسوس کرنے لگتا ہوں۔

اب خراماں خراماں دوس بھاگتی ہوئی کائنات پر تاریکی کے پردے گرتے جا رہے تھے، جیسے ہر چیز کا منہ کالا کیا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہر طرف تیرہ و تار تاریکی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ میری نظریں اس تاریکی کو چیرتی ہوئی آسمان کے جانب اٹھیں جہاں لاکھوں کروڑوں ننھے ننھے ستارے جھلمل جھلمل کر رہے تھے، جنکو شاعر عاشق کے دل کے داغ کہتے ہیں، اہل سائنس کی دوربین نگاہیں ان میں ایک نئی دنیا تلاش کر لیتی ہیں۔ کبھی کبھی ان ستاروں سے جھڑتی ہوئی ہلکی روشنی مسافروں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئی ہے ــــ کسی کو ان جھلملاتے جگنوؤں کو دیکھ کر کسی کی ستاروں جیسی آنکھیں یاد آ جاتی ہیں ــــ دور فراق ان ستاروں کو دیکھ کر خود سے یوں سوال کرتا ہے ــــ مگر یہ مہر و مہ و انجم ہیں منقش قدم کس کے ہیں۔ لیکن مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ غریبوں اور مفلسوں کے نالہ و فریاد میں نہائے ہوئے آنسوؤں کے قطرے ہیں ــــ جو دل کے دہکتے ہوئے آتشدان سے چنگاریوں میں متشکل ہو کر مظلوم فریادی کی طرح ساتویں آسمان کی جانب پرواز کرتے ہیں۔ لیکن فلک نیلی فام کے کنگوروں سے ٹکرا کر نامعلوم و نامراد ــــ فضائے بسیط میں لٹک جاتے ہیں ــــ اور دیکھو ہم تاریک راتوں کے سناٹوں میں ہوتے ان سگاروں سے ابھرنے والی موسیقی کی لہروں کو سننے کی کوشش کی تو میں نے سنا کہ سینکڑوں ماتم کناں آوازیں مرثیہ خواں ہیں

ع ــ غریبوں کا بھی کوئی آسرا ہوتا تو کیا ہوتا!

یونہی جھلمل جھلمل کرتے سماوی بندوں کے متعلق خیال آرائی کرتے ہوئے میرا سر کندھوں پر ڈھلک آیا ــــ اور پھر تھک ہار کر لمبی تان کر سو گیا ــــ صبح سویرے میری آنکھ اسوقت کھلی جبکہ ستارے چراغ سحری کی طرح مدھم ہوتے جا رہے تھے۔ اور پھیکی پھیکی روشنی کی کرنیں۔ دوشیزہ فطرت کے چہرے سے سیاہ آنچل اٹھا رہی تھی ــــ یکایک میری نظروں کے آگے لہلہاتے کھیت دوڑنے لگے۔ پھر کچھ کسان نظر آئے۔ اور آناً فاناً نقش بر آب کی طرح غائب ہو گئے ــــ سوکھے جسم ــــ جیسے ہسپتالوں میں رکھے ہوئے انسانی ڈھانچے، ہمارے سماج و سوسائٹی کا سب سے مظلوم فرد ــــ جو قرض کے انبار تلے دبا روتا جھینکتا رہتا ہے ــــ طوفان باد و باراں، شعلے اگلتی ہوئی دھوپ، کٹکٹاتے جاڑوں کی سرد ہوائیں۔ اسکے لئے سب یکساں ہیں ــــ ننگا جسم، سر پر ایک بڑا سا شملہ ــ رام نام کی دھوتی ــــ اور ہڈیوں سے جسم پر کالی کلوٹی کمبل ــــ اس کی زندگی کی طرح تاریک ــــ ساہوکار اور زمیندار کا ادنیٰ کھلونا ــــ درمیانی افراد، کچے آڑھتی، پکے آڑھتی اور دلال جسکی بوٹی بوٹی نوچ لیتے ہیں اور جو کچھ اسکے پاس بچ جاتا ہے اسکو سرکار لگان کی صورت میں ہڑپ کر جاتی ہے۔ اور اسطرح پھر اسکی جھولی خالی کی خالی رہ جاتی ہے۔ جیسے بنگال کے فاقہ زدہ انسان کا پیٹ اور پھر اسکی زندگی اور اس کا پیشہ کسقدر غیر یقینی جیسے تیلی راجہ کا نجوم ــــ یہ اس زمین پر ہل چلاتا ہے۔ جہاں بارش یا خدا کی رحمت خال خال ہوتی ہے۔ جہاں کی زمین سے زرخیزی کے عناصر عنقا ہیں ــــ جانے کیوں سینکڑوں بدقسمتیاں اس سرزمین پر لوٹتی پھرتی ہیں۔ کہیں ہند کی یہ بدقسمت سرزمین اس دوزخ سے جس سے ہمکو قید حیات سے چھوٹنے کے بعد واسطہ پڑے گا۔ قریب تو نہیں ہے۔ ہمارا کسان ــــ ہمارا کاشتکار، ناگر نکبر چلا کر۔ خون پسینہ ٹپکا کر امید کے بیج بوتا ہے۔ اسکے ہاتھ بروقت کھجور کے درختوں کی طرح ایک ایک قطرہ پانی کے لئے دست بدعا رہتے ہیں۔ اور اسکے اندھے کنوئیں کی طرح گہری آنکھیں نیلے آسمان میں دھنسی رہتی ہیں ــ اور پھر طرفہ تماشہ یہ کہ اکثر و بیشتر وہ خود بھوکا رہتا ہے۔ جو اپنے جسم و دل و دماغ کو خون و پسینہ کر کے غلہ پیدا کرتا ہے اسکی یہ درگت بنتی ہے ــ اور

میرے جلتے ہوئے ہونٹوں پر اقبال کا یہ شعر ابھر آیا

ع جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اف یہ ظلم اب تک روا رکھا جا رہا ہے۔ ان کی قسمت کا پانسہ کب پلٹے گا۔ انکی امید کب بر آئیگی۔ انکی گھر دیواں کب رچے گی۔ انکے سوکھے ہوئے ہونٹ کب ہنسیں گے۔ انکے جسموں میں مسرت کب ناچ اٹھے گی کب وہ بے چین و سکھ کی نیند سو سکیں گے۔ کب آخر کب...... یکایک میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹا ــــ ٹرین بلہار شاہ جنکشن پر آرکی ــــ گرم چائے، پان بیڑی سگریٹ، تازہ اخبار کی چیخ پکار سے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ سینکڑوں انسان ملکر ایک بے ہنگم سا کورس الاپ رہے ہیں، پھر میں نے اپنے ڈبے سے اتر کر ــــ "Dining compartment" میں جاکر ناشتہ کیا واپس اپنے ڈبے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ سولہ برس کا بندر سالال منہ کالا کر چکا تھا۔ سیٹھ جی اور انکی پتنی پوری کچوری سے اپنی موٹی موٹی توند بھر رہے تھے۔ میں نے سیٹھ کی دھرم پتنی کو ذرا غور سے دیکھا تو وہ مجھے مشہور ظریف ہارڈی کی جیپ نظر آنے لگیں۔ رنگیلے نواب کے پاس کوئی سفید سفید سی چادر میں تیم لپیٹا گٹھری بنا بیٹھا تھا۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا یہ کون ــــ پھر میں نے بآواز بلند نواب صاحب سے دریافت کیا ــــ انھوں نے لاؤڈ اسپیکر ایسا آلہ اپنے کانوں سے چمٹا لیا ــ "جی یہ میری نئی نویلی بیگم ہیں" ــــ "اف خدایا" یہ الفاظ میرے حلق میں اٹک کر رہ گئے انھوں نے لجاتے شرماتے اپنے جسم سے چادر نکال پھینکی ــــ شعر و تخیل کا ایک رنگین مجسمہ برف کی طرح سفید اور گلاب کی طرح سرخ میرے سامنے ابھر آیا۔ شربتی آنکھیں، سڈول جسم اور انکو دیکھکر یہ شعر میرے خیالوں کو چوم گیا۔

ع سینہ ہے کہ لہروں پہ کنول ناچ رہے ہیں
زلفیں ہیں کہ لہرائی ہے ساون کی جوانی

انکی نظریں آہستہ آہستہ میری نظروں سے چار ہوئیں۔ جو اس وقت انکے وجود کا جائزہ بہ نظر غائر لے رہی تھیں ــــ جیسے میں مصر کے حسن کے بازار سے کسی حسینہ کو خرید رہا ہوں ــــ میری چبھتی ہوئی نظروں کو محسوس کر کے انکے چہرے پر سرخی دوڑ گئی ــ جیسے کسی نے سفید برقی ہنڈے میں چمک سے روشنی کر دی ہو ــ سفید سفید سے چہرے پر سرخ سرخ لہریں ــــ مجھے بہت بھلی معلوم ہو رہی تھیں ــــ یہ بوڑھا کھوسٹ پچاس سالہ نواب اور یہ سولہ سالہ دوشیزہ ــــ اف کیا یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے ــــ قرون وسطیٰ کے حسن کے بازاروں میں جہاں لڑکیاں لونڈیوں کی حیثیت سے بیچ دی جاتی تھیں ــــ اور آج سوسائٹی اور سماج کے اس سلجھے سلجھائے جگمگاتے موتیوں کی طرح چمکتے دمکتے بازار میں کون سا بڑا فرق ہے۔ وہاں دھلم کھلا فروخت کی جاتی تھیں اور یہاں سوسائٹی کے گھڑے ہوئے کچھ قیود و رسوم ظاہری ڈھکوسلوں اور چند مضحکہ انگیز قوانین کے تحت بیچی جاتی ہیں ــــ ان بازاروں کی طرح یہاں بھی روپیہ پیسہ ہی سے سودا کیا جاتا ہے۔ رشتہ ناتہ جوڑا اور توڑا جاتا ہے ــــ بڑھاپا بآسانی نقرئی اور طلائی [illegible] کے ذریعے سیکڑوں جوانیوں کو ڈنک مار مار کر انکی زندگیوں میں غموں اور آنسوؤں کا زہر پھیلا سکتا ہے۔ اور اس کاٹے کا علاج موت ہے ــــ یہ دنیا ایک مہذب مارکٹ نہیں تو اور کیا ہے۔ سماج اور سوسائٹی کا یہ زنداں نہیں تو اور کیا ہے۔ پھر انسان اپنے آپ کو تہذیب یافتہ کہتا ہے لیکن اسکے قواعد و قوانین کے اینٹوں اور قبیح رسوم و روایات کے پتھروں سے بنائے ہوئے اس زنداں میں اگر جھانک کر دیکھا جائے اس میں وہی ابتدائے آفرینش سا وحشی پن چشم و ابرو سے ٹپکا پڑتا ہے۔ سینکڑوں جوانیاں بیوائیں اور یتیم بچے سماج و سوسائٹی کے ان اندھے ذہنوں کی قتل گاہ پر قتل کئے جاتے ہیں۔ ان بوڑھوں کے ذہن و دماغ شل کیوں نہیں ہو جاتے ــ ان کے ہاتھوں اور پیروں سے کوڑھ کیوں نہیں لپٹ پڑتا ــــ انکے دل کی دھڑکنیں یکلخت بند کیوں نہیں ہو جاتیں جو ایسی اندھی رسوم کا سہارا لیکر پروانہ وار ایسے اقدامات پر لبیک کہتے ہیں اور کئی بہاروں کو خزاؤں سے ہمکنار کر دیتے ہیں۔ کئی ہنستی مسکراتی فردوس بہ آغوش زندگیوں کو دوزخ کی آگ میں گھسیٹ لیتے ہیں۔ اور ان ماں باپ کا رونا کون روئے جو جانتے بوجھتے اپنی لڑکیوں کو بوڑھے کھوسٹ وحشیوں کی چند روزہ دنیا میں ڈھکیل کر انکی زندگی کے آنچل سے آنسوؤں اور آہوں کا خزانہ باندھ دیتے ہیں ــــ اف میرے دماغ میں سیسہ کھولنے لگا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو نواب صاحب نیند کی آغوش میں بے سدھ پڑے سو رہے تھے۔ ان کے ادھ کھلے منہ سے چین میں مصنوعی دانتوں کا چوکٹا مقید تھا۔ خر خر کی آوازیں فضا میں دوڑتی پھر رہی تھیں ــــ ٹرین بلہار شاہ جنکشن چھوڑ چکی تھی ــــ میں نے بہت

کہ کے اس مظلوم لاش کو مخاطب کیا ۔" کیا میں اپنی ہم سفر کا نام دریافت
کر سکتا ہوں ——— جی مجھ بدنصیب کو طلعت کہتے ہیں ——— پہلے ہی میٹھے
میٹھے طنز کی بو سی آنے لگی ۔" لیکن یہ اٹیل اور بے جوڑ شادی ....
میں نے زبان کو لگام دے لی ! " جی یوں سمجھئے کہ ہندوستانی لڑکی کی
قسمت میں یہی کچھ لکھا ہے ۔" میں ایک اوسط گھرانے کی بدقسمت
لڑکی ہوں جو ناز و نعم و قہقہے اور مسرت کی پھلجھڑیوں میں پلی بڑھی ———
لیکن میری جوانی کے ساتھ موسم بہار کی بجائے موسم خزاں میرے وجود
سے لپٹ پڑا ۔ مجھ سے دو اور بڑی بہنیں تھیں ——— جو جہیز کے انبار تلے
لدلدا کر جوں توں کر کے اپنے سسرال چلی گئیں اس قدر شاندار جہیز ابا میاں
کو اُن کی شادیوں میں قرض لیکر دینا پڑا کہ شاید اب ہماری سات پشت بھی
قرض کے اس بار سے گلو خلاصی حاصل نہ کرسکیں گی ؟ تیسرا میرا اپنا نمبر
تھا ۔ میرے والدین نے مجھے اپنی بہنوں میں سب سے زیادہ یعنی انٹرمیڈیٹ
تک تعلیم دلوائی اور اس علم نے میرے احساس کی قوت کو لطیف تر بنا کر مجھ پر
الگ ظلم ڈھا رکھا ہے ——— امی ..... دو سال پہلے ٹائیفائڈ کا شکار
ہو گئیں ——— عجیب عارضہ ہے یہ ——— ہڈیوں کا بخار ——— اس میں انسان
کا خون رگوں میں شاں شاں کرتی آگ سے سوکھ جاتا ہے ——— اور گوشت
پوست گل جاتا ہے ——— دس بارہ دن کے بخار میں انسان دق کے مریض
کے ہم شبیہ ہو کر آہستہ آہستہ برف کی طرح ٹھنڈا ہو جاتا ہے" ——— اسکی
آنکھوں سے آنسوؤں کے تار ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے جنکو اُس نے اپنے گلابی
ڈوپٹہ میں سمیٹ لیا ——— "ایک سال بعد ابا میاں کو میری شادی کی فکر
دامنگیر ہوئی ۔ میرے لئے کئی پیغامات آتے اور جاتے رہے ۔ یعنی میرا
سودا ہونے لگا ۔ یا میری بولی پکاری جانے لگی ۔ سب سے اہم سوال جہیز کا
تھا ۔ جو قارن کی طرح ابا میاں کے ناسوروں کو کریدرہا تھا ۔ زندگی کی تمام ضروریات
جو کہ عام طور پر لڑکیوں کا نادر اوہنی رہتی ہیں کسی نے ٹی وی نت توڑے ، دس
جوڑے ، سونے کے پازیب ، گلوبند وغیرہ وغیرہ کا مطالبہ کیا ۔ بعض خریداروں
نے تو جہیز کے علاوہ نقد رقم طلب کی ——— اخلاق و کردار ، صورت و
سیرت کے لازوال زیورات وہ ہم میں تلاش نہیں کرتے بلکہ ہماری وساطت
سے شاندار جہیز اور سونے چاندی کے انبار کے خواہاں رہتے ہیں ———
اُف اہل دنیا کتنے مادہ پرست اور زر کے پجاری بنتے جا رہے ہیں میرے
ابا میاں اب اس قابل نہ تھے کہ قرض کا ایک اور ہمالیہ اپنے سر پر
اٹھاتے ۔ اور اب انہیں کوئی قرض دینے والا بھی تو نہ تھا ۔ ۔ اتفاق سے قریب

و دوالیہ نکل چکا تھا ——— پھر میں ان دولت مند نواب کے پلے باندھ دی
گئی ——— بھلا میں اپنے اچھے ابا کو برباد ہوتے کیسے دیکھ سکتی تھی ———
لیکن مستقبل کے بھیانک خواب میری نظروں کے آگے لہلہا کر میری زندگی
اجیرن کئے دیتے ہیں ——— میں اپنے آپکو اس زمین کے پیٹھ کا ایک بوجھ
تصور کئے ہوئے ہوں" ——— کس قدر دردناک اور المیہ پرور ہے یہ داستان
میں نے اس کی ڈھارس بندھائی " آپ ایک ہی تو سماج و سوسائٹی کے
اس قبیح زنداں میں مقید نہیں ۔ اس زنداں میں تو سیکڑوں ہندوستانی
لڑکیاں کا ——— پرانے قیدیوں کی طرح پڑی سڑ رہی ہیں ۔ جو اُف تک نہیں کر سکتیں
اور جب ہم پرانے رسوم ، قیود ، جو جانے کب سے ہمارے شادی بیاہ کی
محفلوں میں کس بس گئے ہیں جڑ سے اکھیڑ کر پھینک دینا چاہتے ہیں ان کے
خلاف احتجاجی آواز بلند کرنا چاہتے ہیں تو رجعت پسند لوگوں کے چہرے لگ جاتے
ہیں اور جو ان قبیح رسومات سے لطف اُٹھانا چاہتے ہیں انکے دلوں پر تو آرے
چل جاتے ہیں ۔ اس صف میں بوڑھے کھوسٹ حضرات بھی شریک ہو جاتے ہیں
——— اور ہمیں دنیا بھر کی گالیاں سنانے لگتے ہیں ——— یہ نئی تہذیب کے
چھوکرے ——— دہریت کے علم بردار ، اشتراکیت کے پجاری ہمیں نیا سبق
پڑھانے چلے ہیں ——— وہ رسوم و روایات جنکو ہمارے مقدس آبا و اجداد صدیوں
سے نبھاتے آئے ہیں یہ لونڈے انکا منہ چڑانا چاہتے ہیں ——— فاتر العقل کہیں
کے ——— اس نئی روشنی کی تعلیم نے انہیں کہیں کا نہ رکھا" ——— اتنے میں
میری نظر نواب صاحب پر پڑی جو معجون فلک سیر کھائے کسی افیونی کی طرح
بے سدھ سو رہے تھے اور اپنے ادھ کھلے منہ سے کتے کی طرح خر خر کر رہے تھے
اسوقت وہ نیم سے سفر کی نمائش گاہ میں رکھی ہوئی فرعون کی ممی کی طرح
نظر آ رہے تھے ۔ اُف یہ ممی ——— بے جان ..... کھوکھلا نیم کا درخت ———
اور دوسری طرف شراب ، شباب و حسن سے بھرپور پیمانہ ——— وہ قبرستان
میں پاؤں لٹکائے ہوئے ہے اور ادھر اس نے ابھی اس رنگ و بو میں کھلی
ہوئی دنیا کو معصوم بچے کی طرح دیکھنا شروع کیا ہے ——— اور کچھ ہی دنوں
بعد جب یہ بڈھا کھوسٹ نواب عدم آباد کی ٹرین کا ٹکٹ کٹائے گا ——— تو اس
بدنصیب کا کیا بنے گا ——— بہاروں میں قدم رکھتے ہی اس کی دنیا اُجڑ جائیگی ،
——— عین بہار میں اسکے بال و پر نوچ لئے جائیں گے ——— بیوگی
کا سفید پیرہن اسکے بلوریں جسم کو کاٹ کھانے دوڑ پڑیگا ——— اس کی
زندگی روتے اور آنسو بہاتے کٹ جائے گی ——— شمع کی طرح ———
واہ وہ بلند ... کے سکنے اُڑان بھر اسکے ممہ ... وجود پر ... پھینک ...

وہ جلتی رہیگی مانند چنار ـــــ یہی تو اس کا شیوہ ہے کہ اس عالمِ کون وفساد سے اکالی کلوٹی قسمت کا رونا چپکے چپکے رو کر ـــ گھل گھل کر اس آب وگِل میں گھل مِل جائے ـــ یہ دنیا ان رسوم وروایات کا ایک زنداں نہیں تو اور کیا ہے ـــ جہاں جسم سے پروبال نوچ نوچ کر تخیلات کے محلوں کو مسمار کرکے روح کے ہیولی کو آگ لگادی جاتی ہے ـ یہ شمشان بھومی نہیں تو اور کیا ہے جہاں ہر مجہ زندہ لاشیں جلائی جاتی ہیں ـــــ اور جب میں نے کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ باہر ہر چیز جل رہی ہے ـــ ڈبے کے اندر ہر ایک شے خود میرا اپنا وجود بھی قلابازیاں کھاتا نظر آنے لگا ـ اتنے میں ایک کرخت آواز میرے دل ودماغ کو چیر گئی "ناگپور جنکشن" یہی تو میری منزل تھی ـــ نواب صاحب اپنی گہری نیند سے جاگ چکے تھے ـــ انھوں نے اور مظلوم طلعت نے مجھے خدا حافظ کہا ـــــ سیٹھ کی بڑی بڑی موچھوں سے مسکراہٹ جھانک پڑی ـــ اسنے ایک دو فرلانگ لمبی چوڑی ڈکار لیتے ہوئے ـــــ اپنی گول مول تربوز ایسی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ستیہ دشمبھو ـــ شبد شمبھو کہا ـــــ "یہاں اتر پڑوگے مہاشے ـــــ تو پھر رام رام بھیا ـــــ اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مہاتما جی اور قائد اعظم دور کھڑے ہنس رہے ہیں ـــ ٹارڈی کی چچی بھی مسکرا رہی تھی ـــــ جیسے وہ کہہ رہی ہو "جے رام جی کی پدھارو باپو جی ـــــ پھر وہی چیخ وپکار ـــ اور گھماگھمی ـــــ میں غالب کا یہ شعر گنگناتے ہوئے پلیٹ فارم پر اُتر پڑا

ع قیدِ حیات وبندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ـــــ پھر میرے خیالوں میں یہ الفاظ چکری کی طرح گھومنے لگے ـــــ بڈھا کھوسٹ ـــــ البیلا نواب ـــــ مظلوم نوجوان طلعت ـ ہمارے شادی بیاہ ـــــ جہیز ـــ ظلم سماج وسوسائٹی ـــــ کے گنگ رسوم وقواعد کا یہ سنگین زنداں ـــــ ہمارا کسان کالی کلوٹی قسمت کی چڑیل ـ غلامی کے سلاسل ـــــ آزادی کے جھلملاتے سنہرے خواب ـــــ پھر ریل کے ناخدا نے سیٹی بجائی ـــ فرررر ...... سگنل رکوع کی حالت میں جھک پڑا ـــــ ٹرین کھسکی، رینگی اور آہستہ آہستہ دوڑنے لگی چھک چھک چھک چھک ...... زندگی کی ریل گاڑی ـــ انسان ایک مسافر چھک چھک چھک چھک ـــــ کوئی دو تین اسٹیشن چلکر اپنا سفر ختم کردیتا ہے ـ کوئی دس بارہ ـــــ کوئی دو تین جنکشن بعد ـــــ طول طویل زندگی طول طویل سفر ...... چھک چھک ...... چھک چھک ...... !!!

نوائے راز

راز مراد آبادی ایم اے

راز کیا کہیے ابھی تک لطف کیوں جینے میں ہے ــ یادگارِ عشقِ رفتہ اک خلش سینے میں ہے
کوئی ساعت کوئی لمحہ غم سے خالی نہیں ــ جیسے غم کا اک خزانہ دل کے گنجینے میں ہے
عشق حشرِ آرزو ہے، آرزو مرگِ خودی ــ ہائے وہ لذت کہ خونِ آرزو پینے میں ہے

ماتمِ شباب

ماہر القادری

(ایک حسین عورت خوابِ جوانی سے بیدار ہونے کے بعد)

کششِ حسرتِ دیدار کہاں سے لاؤں — مستیٔ نرگسِ بیمار کہاں سے لاؤں
حسنِ رنگینیٔ افکار کہاں سے لاؤں — اب میں وہ نطقِ گہربار کہاں سے لاؤں
وقت نے چھین لیا ساقِ بلوریں سے گداز — اب میں وہ شوخیٔ رفتار کہاں سے لاؤں
اب نہ آنکھوں میں چمک اور نہ عارض میں نمک — آہ! وہ بارشِ انوار کہاں سے لاؤں
اب نہ باتیں مری دلچسپ نہ آوازیں لوچ — یعنی وہ نرمیٔ گفتار کہاں سے لاؤں
ہائے! وہ جوشِ جوانی وہ امنگوں کی بہار — اب میں وہ دولتِ بیدار کہاں سے لاؤں
آہ! وہ موجِ ہوس جس نے مجھے لوٹ لیا — ہائے! وہ عصمتِ کردار کہاں سے لاؤں
چشمِ میگوں ہے کہ ویران نظر آتی ہے — حاصلِ خانۂ خمار کہاں سے لاؤں
دل میں گرمی نہ رہی شوق میں تیزی نہ رہی — شعلۂ آتشِ رخسار کہاں سے لاؤں
جس نے کچھ روز زمانہ میں خدائی کی ہے — آج وہ حُسن کا پندار کہاں سے لاؤں
وہ تبسم کی جھلک ہے نہ وہ ابرو کی لچک — اب میں چلتی ہوئی تلوار کہاں سے لاؤں
اب نہ وہ زخمۂ مضراب نہ جذبات کا ساز — اثرِ نغمۂ کہسار کہاں سے لاؤں

نہ وہ شوخی نہ امنگیں نہ وہ اندازِ خرام
اب میں پازیب کی جھنکار کہاں سے لاؤں

دُولھن کے سنگار کیلئے عجیب و غریب فیشن ایبل تحفے



عورتیں اپنی آرائش کیلئے زیورات کو بحد پسند کرتی ہیں چونکہ زیور ہی سے ان کے حسن و جمال میں چار چاند لگتے ہیں۔ آپ بھی اپنی شریک زندگی کے ... میں جبکہ سونا انتہائی گراں ہے اسپیشل ایمی ٹیشن گولڈ کے بنے ہوئے خوش وضع ۔ خوش قطع ۔ دل پسند ۔ دیرپا اور ... زیورات منگائیے جو کم خرچ بالا نشین ہیں جن سے سینکڑوں روپیوں کی ضرورت معمولی رقم میں پوری ہو جاتی ہے۔ رنگ روپ اور رکھ رکھاؤ میں اصلی سونے سے بہتر ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ بڑے سے بڑے تجربہ کار سنار بھی ان کو دیکھ کر بغیر کسوٹی لگائے کیا مجال جو شناخت کر جائے۔ زیادتی استعمال کے باوجود ... میں دس سال تک فرق نہیں آتا۔ ہر زیور پر قیمت اور نمبر درج ہیں فرمائش میں نام ... زیور کا نمبر تحریر کیجئے فوراً مال ارسال ہوگا۔ قیمت کے علاوہ ایک روپیہ آٹھ آنے (ڈیڑھ روپیہ) محصول و خرچ پیکنگ علیحدہ ہے۔ اکٹھا آرڈر دینے پر جن کی مجموعی قیمت چالیس روپے یا اس سے زائد ہو کی تمام خریداروں ، دکانداروں ، ... عورتوں کو جو محض برائے تجارت مال منگاتی ہیں چالیس روپے کا مال تیس روپے میں دیا جاتا ہے۔ تجارت کرنے والوں کے لئے ... موقع ہے

چیف ایجنٹ :- فرینچ ناولٹی ایمپوریم پوسٹ بیگ نمبر ۲۴ - دہلی

ضبط ایم۔اے

ہمارا تمدّن اور اُس کا تحفّظ

دنیا کے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مسلمان بھی بجا طور پر ایک قدیم تہذیب و تمدن پر فخر کر سکتے ہیں اس تمدن میں ان کی شاندار تاریخ، ان کے بے مثل کارنامے اور فتوحات، نیز دنیائے ادب و انشا، دنیائے سیاست، دنیائے معاشیات اور فنون لطیفہ میں ان کی نمایاں ترقیاں شامل ہیں۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ان ترقیوں میں سب اسلام کا اثر عام ہے۔ اسی اثر نے اختلاف میں موافقت و موانست پیدا کر دی دنیا کی مختلف مذاہب کے منتشر اور جنگجو قوموں کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ ان میں اُخوت و محبت کی لہر دوڑا دی اور ان میں ایسا اتحاد و اتفاق قائم کیا جس کی نظیر ملنی نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ اس دور کے مسلمان شمع اسلام کے پروانے اور اسلامی تعلیم، اصول و احکام پر سختی سے کاربند تھے۔ اس لئے انہیں غیر معمولی ترقیاں بھی حاصل ہوئیں۔ یہ ضرور ہے کہ آج مختلف ملکوں کے مسلمانوں میں کچھ فرق ہے اور اس فرق کے خدوخال ان کے تمدن، تہذیب و معاشرت کے آئینے میں نظر آتے ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس اختلاف سے اسلامی اتحاد و یکتائی کی روشنی تاریک تو کیا دھندلی بھی نہ ہو سکی شروع اسلام سے آج تک عالمگیر اتحاد کی روشنی سے دنیائے اسلام منور ہے اور اس نے کبھی مقام ماحول کے اثرات کو قبول نہیں کیا

مسلمانوں کا اتحاد

مسلمانوں کی جہانگیر اخوت مصنوعی یا تخیلی نہیں۔ اگر ہم دنیا کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کا اتحاد ایک مسلمہ حقیقت ہے جس کا سینکڑوں مرتبہ جائزہ لیا جا چکا ہے اب اس کے ثبوت و شواہد کی ضرورت نہیں رہی عرصہ ہوا کہ دنیائے اسلام میں عام طبعی رجحان تھا کہ اسلامی اتحاد و اخوت کا جذبہ دلوں سے مٹا کر جو قابل تاریخی نقطہ نگاہ سے انیسویں صدی کی پن اسلامی ر) تحریک کا ردِعمل تھا، اس کی جگہ وطنیت، ماحول کی خصوصیات اور مقامی تمدن پر زور دیا جائے خوش قسمتی سے وہ تحریک ہمیشہ کے لئے ختم ہوئی اور اسے ختم ہونا بھی چاہیئے تھا ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ کوئی بھی نہیں نکلا۔ اس لئے یہ بات ثابت ہو گئی ہے اب ہم اسے محسوس بھی کرتے ہیں کہ یہ ایک فاش غلطی ہوگی اگر ہم اسلامی تاریخ کے تیز دھارے کے رخ کی طرف نہ کہ اسے دوسری طرف موڑنے کی کوشش کریں اپنے کو اسلامی اخوت سے دور رکھنا نہ صرف غلط بلکہ مضر بھی ہے خصوصاً موجودہ زمانے میں۔ برطانیہ کی نام نہاد سلطنت جمہوریہ جس کی نشوونما خالص مصنوعی طور پر ہوئی ہے دعویٰ کرتی ہے کہ وہ دنیا میں امن و امان اور آزادی کی فضا پیدا کرنے کی ضامن ہے لیکن اس دعویٰ کی کوئی دلیل نہیں نہ اس میں ذرہ برابر بھی صداقت ہے ابھی ابھی جو جنگ عظیم ختم ہوئی ہے اس کے نتائج و اثرات ہمارے سامنے ہیں۔ سچ پوچھئے تو مسلمان اور صرف مسلمان ہی ایسا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ اسلام ہی اتحاد و محبت کا ایک قدرتی ذریعہ ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر اسلامی مذہب و تمدن کے ذریعے مسلمانوں میں اتحاد قائم کیا جائے تو وہ روحانی، حقیقی اور ابدی اتحاد ہوگا۔ جسے دنیا کی کوئی طاقت مٹا نہیں سکتی بالفاظ دیگر یہ اخوت امن آزادی اور جمہوریت کا ایک ایسا قلعہ ہوگی جس میں کوئی خارجی طاقت رخنے نہیں ڈال سکتی۔

اسلامی برادری کے رکن ہونے کی حیثیت سے ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی تمدن کا ایک بیش بہا خزانہ ورثے میں پایا ہے اس میراث کو سنوارنے اور اسے پروان چڑھانے میں وہ زمانہ ماضی میں نمایاں حصہ لے چکے ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ مستقبل قریب و بعید میں بھی وہ اسے ترقی دینے میں کافی خدمات انجام دیں گے۔ ان کی سب سے اہم میراث یہ احساس ہے کہ وہ ایک شاندار تمدن کے مالک ہیں، عربوں کا فیثاغورثی فلسفہ، ایرانیوں کی فصیح و بلیغ

شاعری جس کا عکس اردو شاعری کی صورت میں ہندوستان میں ہے ہسپانی، مسلمان ان بنگالوں کی یادگار عمارتیں، عباسیوں کی سیاست اس میں شامل ہیں۔ خوبصورت گنبد اور بانکے محراب غیر فانی یادگاریں ہونے کے علاوہ ثابت کرتے ہیں کہ مسلمان فرمانروا بے انتہا روادار، فراخدل اور وسیع المشرب تھے یہ رواداری کی حد نہیں تو اور کیا ہے کہ وہ ہندوستانی باشندوں کے مذہبی مسائل میں مداخلت کرنے کی بجائے ان کے مذاہب کی سلامتی اور ترقی کی خاص خاص تدبیریں کرتے تھے ایک ایسے مذہب کے لئے جو ان کے مذہب سے بہت مختلف بلکہ اس کا مخالف تھا۔ اگر ہم اپنے تمدن و تہذیب پر غور کر کے ان کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اس میں چند خاص خصوصیات اور اصول ہیں جو دنیا کے دوسرے مذاہب کے اصولوں سے بالکل مختلف ہیں ان اصولوں پہ مسلمان شروع اسلام ہی سے کاربند تھے اور چند اسلامی اصول تو ایسے ہیں جن کے مسلمان آج بھی سختی سے پابند ہیں ان کی انفرادیت انہیں زریں اصولوں سے قائم ہے اور دنیا کی کوئی قوم ان معاملات میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

دراصل یہ اصول تعمیر اسلامی کی مستحکم بنیادیں ہیں۔

(١) انفرادی خودداری

(٢) جہانگیر مساوات

(٣) ملی و سیاسی جمہوریت

(٤) صداقت کا شوق و تحسین

اسلام نام ہے زندگی کے عملی قوانین کا اگر ہم اس کی عملی تعلیموں پر غور کریں جو روحانیت کے دقیق مسئلوں سے لیکر ضروریات زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل تک پھیلی ہوئی ہے تو ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ اسلام انسانیت کو روحانی، اخلاقی اور جسمانی نکتہ ہائے نگاہ سے ایک نئے اور ارفع و اعلیٰ مقام پر پہنچانے کے لئے آیا تھا۔ اسلام ہمیں ان معاملات میں بھی تعلیم دیتا ہے جنہیں دوسرے مذاہب نے دقیق اور معمولی باتیں سمجھ کر کوئی اہمیت نہیں دی اور نہ انہیں مذہب کے دائرے میں رکھنا ضروری سمجھا۔ اسلام کے قوانین اور اصولوں کی جامعیت، افادیت و اہمیت سے کسی غیر مسلم کو بھی انکار نہیں ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دوسرے مذاہب کے پیرو بھی اسلام کے نافذ کردہ احکام و اصول پر عمل پیرا ہیں۔ اسلام کا بنیادی قانون جس پر تعمیر اسلامی کا انحصار ہے یہ ہے کہ زندگی چند مختلف حصوں اور ٹکڑوں میں تقسیم نہیں ہو سکتی دوسرے مذاہب کی تعلیم کے خلاف اسلام ہمیں سکھاتا ہے کہ ہم اپنی زندگی کو جامع و مکمل سمجھیں۔ دوسرے مذاہب میں ایسے مسئلے ہیں جن میں ایک فرد کو پوری آزادی ہے کہ وہ اپنی رائے اور مرضی کے مطابق تمام کام انجام دے سکتا ہے لیکن اسلام میں وہ ملی مسئلے سمجھے جاتے ہیں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں فرد کی شخصیت اسی وقت تک قائم ہے جب تک وہ ملت اسلامی کے ساتھ ہے اور اسلامی اصول کے تفوق کا اقرار کرتا ہے اس ملت کا وہ ایک سرگرم کارکن ہے جس طرح فرد کا یہ فرض ہے کہ وہ کسی صورت میں بھی ملت سے علیحدہ نہ ہو ٹھیک اسی طرح ملت بھی اس کے جائز حقوق کو نظر انداز نہیں کرتی۔ دوسرے مذاہب میں فرد اور ملت کا یہ ربط باہمی نام کو بھی نہیں ہے ان کے اصول اسلامی اصول سے مختلف ہونے کی حیثیت سے کامیاب بھی نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر عیسائیوں کو لیجئے ان کے یہاں اخلاق کے دو مختلف معیار ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عیسائی ملکوں میں بھی عیسائیت کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔

انفرادی حقوق

اسلامی ملت فرد کی عزت کرتی ہے اس کے وجود، اس کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتی ہے لیکن اس کو اتنی آزادی نہیں دیتی کہ وہ ملت کو چھوڑ دے یا اس کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جائے اس نے اس کے لئے ایک ملی عمارت تعمیر کر دی ہے جس کے حدود میں رہ کر وہ ممکن حد تک زیادہ سے زیادہ آزاد ہے۔ بہرحال ملت کی عظمت کا اعتراف اور اسلامی اصول کے تفوق کا اقرار کرنا اس کے لئے بہت ضروری ہے۔

فرد کو اسلام کی دی ہوئی نعمتوں میں ایک یہ بھی ہے کہ اسے مذہب کے معاملے میں پوری آزادی ہے اسے پورا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق بغیر کسی شخص کی مداخلت کے خدا کی پرستش کر سکتا ہے ہندوؤں کے یہاں پجاری ہیں اور عیسائیوں کے یہاں پادری۔ دوسرے مذاہب کے تعصب اور تنگ نظری نے فرد کو اتنی آزادی نہیں دی۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ کوئی شخص ہی کیوں نہ ہو اگر وہ اسلامی قواعد و ضوابط جانتا ہے تو وہ مذہبی احکام ادا کر سکتا ہے اس کے برعکس دوسرے مذاہب کے اکثر و بیشتر معاملات و احکام میں فرد کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے اسلام نے پجاری اور پادری کے عہدہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ اس نے ایک جماعت کے اس دعویٰ کو وہ انسان اور خدا کے سلسلے کی درمیانی کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں باطل کہہ کر ہر فرد کو اعلیٰ اعلیٰ مقام پر پہنچایا ہے ضرورت ہے کہ ہر مسلمان کو اس کا احساس ہو ممکن ہے کہ دوسرے حضرات اس مسئلے کو اتنی اہمیت نہ دیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے

کر انسانوں کو پجاریوں اور پادریوں کے ناقابلِ برداشت ظلم سے نجات دلانا ایک انقلابِ عظیم کا ذریعہ سے کم نہیں۔ چنانچہ آج بیسویں صدی میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس میں پجاریوں اور پادریوں کا ظلم نام کو بھی نہیں ہے۔ ہمیں افسوس ہی نہیں تعجب بھی ہے کہ اسلام کے اس احسان کا احساس بہت سے مسلمانوں کو بھی نہیں ہے اور یہ دیکھ کر بے حد تکلیف ہوتی ہے کہ اسلام میں بھی ایک روحانی جماعت پیدا ہو گئی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس جماعت کے مختلف خاندان کے افراد میں سلسلہ وار نسب در نسب روحانی طاقت منتقل ہوتی رہتی ہے۔ ایک بیٹا جو اپنے باپ کی مسندِ خلافت کا وارث ہوتا ہے روحانی حیثیت سے بھی اس کا خلیفہ ہے اس قسم کی جماعتیں آج بھی موجود ہیں لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ان نام نہاد روحانیت کے عام پڑھے لکھے مسلمانوں نے کبھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا اور خاندانی پیر پیشہ ور پیروں کے اثرات صرف ان لوگوں پر ہیں جو جاہل ہیں۔ وہی ہیں جن کا عقیدہ باطل ہے اور جنہیں اپنے حقوق کا احساس نہیں ہے۔

مساوات اسلامی

اسلام نے نہ صرف افراد کے حقوق کی تشریح کی ہے بلکہ ان کی محافظت کا ذمہ بھی لیا ہے ایک ایسی عمارت بنا دی ہے جس کی بنیادیں افراد کے حقوق ہیں کیا اس سے کوئی انکار کر سکتا ہے کہ سب سے پہلے اسلام ہی نے مساوات اور جمہوریت کی نہایت جامع و مانع تشریح و تعریف بیان کی۔ ایسے وقت میں جبکہ دنیا کی دوسری قومیں تقریباً اندھی تھیں اور مساوات و جمہوریت کے خیالات ان کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتے تھے سب سے پہلے مسلمان ہی اس مساوات پر سختی سے کاربند ہوئے اس مقصد کی تکمیل کا آلہ مسجدیں ہیں جن میں مراتب کا فرق اور امتیاز نہیں اور جہاں مرتبہ، دولت وغیرہ کے فرق کو مٹاتے ہوئے ایک ہی صف میں امیر و غریب، بادشاہ و رعایا، بوڑھے اور بچے نمازیں ادا کرتے ہیں ہو سکتا ہے کہ آج ملتِ اسلامی میں بھی دولت حیثیت یا مرتبہ کے لحاظ سے جماعتیں ہوں لیکن اس قسم کی جماعتیں بہت زیادہ نہیں برائے نام ہیں کیونکہ مسجدوں میں مکمل مساوات کا خیال رکھا جاتا ہے اور وہاں کسی کروڑپتی کے لئے یورپ کے کلیساؤں کی طرح کوئی خاص جگہ محفوظ نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کے ملی تعلقات پر اس مساوات کا بہت زیادہ اثر پڑا اس کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ اسلام میں ذات کا سلسلہ نہیں ہے یا کم از کم ہندو سماج کی طرح "اچھوت" یا نیچ قوم نہیں ہیں ایک فرد چاہے وہ کتنا ہی نیچ قوم سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو مسلمان ہونے کے بعد

دوسرے پیدائشی مسلمان کے سے حقوق کا حقدار ہو جاتا ہے اور دوسرے مسلمان اسے اپنا بھائی سمجھتے ہیں اسے اتنے حقوق حاصل ہو جاتے ہیں کہ تبدیلِ مذہب سے پہلے وہ ان کا خیال بھی نہ کر سکتا تھا اگر اس نقطۂ نگاہ سے مسلمان یہ دعوے کریں کہ وہ دنیا کی ترقی یافتہ جمہوریت پسند قوم ہیں تو یہ بیجا نہیں ہو گا۔

اسلام میں عورتوں کا مرتبہ

اب عورتوں کو لے لیجیے غیر مسلموں کا عموماً اور عیسائی پادریوں کا خصوصاً مسلمانوں پر یہ اعتراض ہے کہ انہوں نے اپنی ملت میں خواتین کو ایک بہت ہی نیچا درجہ دیا ہے لیکن یہ اعتراض ان کی زبان سے کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا جن کی عورتوں کو مسلمان عورتوں کی طرح آدھا حق بھی حاصل نہیں ظاہری تصنع ہمیں اکثر فریب میں ڈال دیتا ہے اور یہ ناممکن نہیں ہے کہ ہم باطل کو حق سمجھنے لگیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مغرب کی نام نہاد آزاد عورتوں کو رقص و حرکت کی آزادی کے سوا کوئی آزادی یا حق حاصل نہیں۔ سب سے پہلے اسلام ہی نے عورتوں کو اتنا حق دیا کہ وہ جائیداد کی وارث ہو سکیں۔ آج تک یورپ کی عورتوں کو اتنا حق بھی حاصل نہ تھا کہ وہ وارثِ جائیداد ہوں۔ آج چودہ سو سال کے بعد انہوں کی آنکھیں کھلی ہیں اور ابھی حال ہی میں مغرب کے چند ملکوں میں خواتین کے اس جائز حق کو تسلیم کیا گیا ہے لیکن اس میں بھی بہت سی رکاوٹیں ہیں۔ رشتہ داروں کی وجہ سے یہ حق اکثر منسوخ ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں مسلم خواتین جائیداد خرید سکتی ہیں فروخت کر سکتی ہیں اور ان معاملات میں انہیں اتنی آزادی ہے کہ ان کی مغربی بہنوں کو خواب میں بھی نصیب نہیں ہو سکتی۔ دراصل مغرب عورتوں کو ایک ثانوی حیثیت دیتا ہے کہتے ہیں کہ ایک فرانسیسی عورت پرست ہوتا ہے لیکن یہ غلط اور محض غلط ہے [illegible] مرتبہ گذشتہ سال یعنی ۱۹۴۵ء میں وہاں کی خواتین [illegible] بڑھ کر اور کیا ظلم ہو سکتا ہے کہ یورپ [illegible] شادی شدہ عورت اپنی مرضی سے چیک پر دستخط کر کے اسے بھنا بھی نہیں سکتی ان سب مجبوریوں اور پابندیوں کے باوجود بھی مغرب کی عورتیں آزاد کہلاتی ہیں۔ کیا خوب!

شادی کا مسئلہ اور اس سے پیدا ہونے والی پیچیدگیاں آج تک یورپ اور دوسرے غیر مسلم ممالک کے لئے مصیبت و تکلیف کا باعث ہیں وہ شادی کو ایک کھیل سمجھتے ہیں وہ اس میں کوئی خاص [illegible] نہیں سمجھتے وہ اس فریب میں مبتلا ہیں کہ رشتۂ ازدواج [illegible] ہے جس کا توڑنا بہت مشکل ہے۔ حالانکہ اس غلط نظریہ کے بہت خطرناک نتیجے

دقوع میں آچکے ہیں یا یوں سمجھ لیجئے کہ عیسائی لوگ کے یہاں زن و شوہر کے رشتہ میں فریقین وقت کے لئے عارضی معاہدہ کرتے ہیں اور دونوں کی مرضیات پر علیحدہ، نہایت آسانی سے ٹوٹ سکتا ہے شادی کے متعلق ہوئے ان کے نظریے میں آسمان زمین کا فرق ہے ان سب واقعات کے پیش نظر یہ کہا اور بہت کہا ہے کہ جہاں تک خواتین کے حقوق کا تعلق ہے ہم مغرب کو بہت کچھ سکھا سکتے ہیں اس سے کچھ سیکھ نہیں سکتے۔

صداقت کی تلاش اور رواداری

اسلام کے دوسرے اصولوں میں صداقت کی تلاش اور رواداری بہت اہم ہیں یہ کہنا بہت بڑا ظلم ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں نے اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا ہے اور ان میں رواداری نام کو نہیں حقیقت یہ ہے حقیقت اس کے برعکس ہے مسلمانوں کی ایک ہزار سال کی حکومت کے بعد بھی یہاں ہندو اکثریت میں ہیں اور مسلمان اقلیت میں۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کے دارالسلطنت اور خاص خاص تہذیبی و سیاسی مراکز میں بھی ہندو بہت زیادہ ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان فرمانرواؤں کی مسلمہ پالیسی یہ تھی کہ ہندوستانی باشندوں کے مذہبی مسائل میں ہرگز مداخلت نہ کی جائے یہی وجہ ہے کہ آج ہندو ہندوستان میں بہت زیادہ ہیں اگر وہ چاہتے تو ہندو مذہب کو صفحۂ ہندوستان سے حرف غلط کی طرح مٹا دیتے کیونکہ ازمنۂ وسطی کے مسلمان بادشاہوں کے لئے یہ ناممکن نہ تھا لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اسلام نے ان کو ایسی تعلیم نہیں دی تھی اگر وہ ایسا کرتا تو ان کا یہ فعل اسلامی رواداری کے منافی ہوتا۔ ہسپانیہ میں بھی مسلمانوں نے صدیوں حکومت کی تعجب کی بات ہے کہ آج وہاں صرف عیسائی قوم آباد ہے اور صرف چند کھنڈر اور ٹوٹی پھوٹی عمارتیں جو امتداد زمانہ سے بچ گئی ہیں مسلمانوں کی عظمت رفتہ و شوکت گذشتہ کی یاد دلاتی ہیں۔

اسلام میں کوئی ٹرینٹ کی کونسل (COUNAL OF TRENT) نہیں جس کی وجہ سے اسے ندامت ہو۔ مذہب اسلام سے انکار کرنے کی صورت میں کبھی کسی کو سزا دی گئی نہ ہلاک کیا گیا۔ مسلمان عام طور سے مذہبی معاملات میں مداخلت کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ اسلام کی اشاعت و ترقی کے لئے بالکل مختلف ذرائع اختیار کئے گئے تھے۔

اسلامی تعلیم اور اصول

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ وہ کونسے اسباب تھے جن کی وجہ سے دنیا کی مختلف قومیں اسلام کی طرف کھنچی چلی آتی تھیں اس کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں نے کبھی ظلم و ستم کے ذریعے اپنا مذہب پھیلانے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ اسلام کے محاسن اس کی تعلیم اس کے اصول، اس کے وضع کئے ہوئے قوانین نے لوگوں کو گرویدہ بنا لیا اور یہ مقبول خاص و عام ہو گیا۔ اسپین میں اور دنیا کے دوسرے حصوں میں مسلمانوں کی قومی درسگاہیں تھیں جہاں ہر قسم کے علوم و فنون کی تعلیم دی جاتی تھی یہ وہ مراکز تھے جہاں سے اسلامی اصول اور تعلیم کی نشر و اشاعت بھی ہوتی تھی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جب اسلام نے علم و ادب کی روشنی پھیلائی تو مغرب میں جہالت کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی اور یہ مسلمان ہی ہیں جنہوں نے یونان اور روم کے علم و ہنر کو دنیا کے دوسرے اقوام تک پہنچایا اگر وہ ایسا نہ کرتے تو وہ جواہر پارے ہمیشہ کے لئے ضائع ہو جاتے۔ رسول اکرم نے تعلیم دی تھی کہ وہ علم حاصل کریں اس لئے انہوں نے یونان اور روم کے علم و ہنر کو مسترد نہیں کیا بلکہ ان میں ترقی کی حالانکہ وہ غیر مسلموں کی محنت کا نتیجہ تھے اگر وہ غیر مسلموں کے علم و ہنر کو حاصل نہ کرتے تو یہ اسلام کی تعلیم کے خلاف ہوتا۔ اسلام کی اس اسپرٹ نے دوسرے اقوام میں بھی اکتساب علم و ہنر کی اسپرٹ پیدا کر دی ہے اور آج دنیا میں جتنی تحریکیں بھی شروع ہو رہی ہیں چاہے وہ تمدنی ہوں یا کچھ اور ان میں اسلامی اسپرٹ ضرور ہوتی ہے

اگر مسلمان اپنے شاندار ماضی اور قدیم تہذیب و تمدن پر فخر کریں تو بیجا نہیں ہے وہ مسلمان جو ہسپانیہ کے جامعوں میں علم و ادب، ہنر اور سائنس کو ترقی دینے میں ہمہ تن مصروف تھے وہ مسلمان جنہوں نے یوروپ کی بیداری . . . . . (RENAISSANCE) کی بنیاد ڈالی تھی وہ مسلمان جو علم و ادب کے دیوانے تھے اور جو اکتساب علم کے لئے تکلیف و مصیبت برداشت کر کے دور دراز کا سفر کرتے تھے وہ مسلمان جو سیاست داں بھی تھے اور جنہوں نے عرصۂ دراز تک مختلف مذاہب پر نہایت کامیابی کے ساتھ حکومت کی وہ مسلمان جنہوں نے فن تعمیر میں بھی کمال حاصل کیا اور جن کی یادگاریں دنیا کے طول و عرض میں ایسی عمارتیں ہیں جن کی مثال نہیں مل سکتی۔ وہ مسلمان جنہوں نے سمندروں اور دریاؤں کے بے انتہا مصائب کے باوجود جہاز رانی میں بے نظیر کمال حاصل کیا ان میں چند ایسے اولیائے کرام اور مشائخ عظام بھی تھے جنہوں نے اپنے اخلاق اور اپنی صلح کل (UNIVERSALLOVE) کی نیک تعلیم سے لوگوں کے دلوں کو موہ لیا اور اسلام کی نشر و اشاعت کی خصوصاً ہندوستان میں اولیائے کرام نے اسلام پھیلانے میں بڑی مدد دی۔ یہی لوگ اسلام کے علم بردار تھے جن کے افعال و اقوال سے ہمیں سبق حاصل کر کے ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

دراصل پاکستان کا مطالبہ مسلمان قوم کی جد و جہد نے اپنے شاندار ماضی

اور یہ عظمت تہذیب و تمدن کو محفوظ رکھنے کی اس شاندار ماضی اور قدیم تمدن سے ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ہم ایک مختلف اور علیحدہ قوم کی حیثیت سے ہیں۔ یہاں کی دوسری قوموں سے ہمارا اتفاق و اتحاد نہیں ہو سکتا بنگال بہار اور بمبئی کے حالیہ فسادات، خانہ جنگی اور قتل و غارتگری سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ ہندوستان جس دور سے گزر رہا ہے اور مسلمان دشمنی پر دوسری قومیں جس طرح اتری ہوئی ہیں وہ اظہر من الشمس ہے ——

لیکن خوش قسمتی یہ ہے کہ مسلمان اب بھی بے خبر ہیں اس میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا کہ اگر ہم دشمنوں کی چال اور ان کے حملوں سے محفوظ رہ کر اپنی انفرادیت قائم رکھ سکیں تو پاکستان کے مطالبے کی جدوجہد کرنی بڑے فخر کی ہو سکتا ہے کہ راستے میں بہت سی دشواریاں ہوں اور ہمارا سفر خطرناک اور صبر آزما ہو لیکن آخر میں ہماری کامیابی یقینی اور لازمی ہے۔

ان دنوں

اثر جلیلی

دل شکوہ سنجِ گردشِ دوراں ہے ان دنوں
شیرازۂ حیات پریشاں ہے ان دنوں

ہر شب حریفِ طولِ قیامت ہے بالیقیں
ہر روز غیرتِ شبِ ہجراں ہے ان دنوں

اک یاس بے نہایت و اک رنجِ بے کنار
افسانۂ حیات کا عنواں ہے ان دنوں

تھی جس پہ کل نزاکتِ گلبرگِ تر گراں
وہ زیرِ بارِ خارِ مغیلاں ہے ان دنوں

وہ دل کہ صدرِ انجمنِ حسن و عشق تھا
مانوسِ کوہ و دشت و بیاباں ہے ان دنوں

خلاقِ رنگ و نور کبھی تھی جو چشمِ شوق
ناآشنائے سنبل و ریحاں ہے ان دنوں

وہ سینہ تھا جو مشرقِ خورشیدِ لازوال
اس پر گمانِ کلبۂ احزاں ہے ان دنوں

بادِ بہارِ صبح جسے ناگوار تھی
وہ زیرِ مشقِ صرصر و طوفاں ہے ان دنوں

مٹنے لگا ہے ذہن سے پندارِ برتری
جو جور بھی ہے شاملِ احساں ہے ان دنوں

اقلیمِ دو جہاں کو جو گردانتا نہ تھا
مداحِ اوجِ تختِ سلیماں ہے ان دنوں

کیا پوچھتا ہے مشغلہ ہائے اثر ندیم!
مصروفِ شکوۂ غمِ دوراں ہے ان دنوں

چلمن سے جو نیاں جھانک رہی ہیں

چلمن

رفیق غازی سیالکوٹی کے افسانوی ادب کا شاہکار جس کے ہر حرف سے جوانی، زندگی، فطرت، حسن ادا، نزاکت خیال ادبی لطافت اور پاکیزہ فن کاری کی پریاں جھانک رہی ہیں مشہور پبلشنگ ہاؤس کی تازہ ترین پیش کش ہے۔ ان افسانوں میں سماج پر گہری تنقید، زندگی کا نفسیاتی تجربہ اور فن افسانہ نگاری کی حقیقی تکمیل پہلو بہ پہلو نظر آتی ہے۔ آنسو ہیں مگر مسکراہٹوں کی قوس قزح رنگین مسکراہٹیں ہیں مگر آنسوؤں کے موتیوں سے لبریز یہ ۱۹۴۶ء کی یادگار

افسانوی شاہکار

زندگی اور صداقت سے لبریز، کتابت
معیاری طباعت نفیس اور خوشنما
گرد پوش
عنقریب منظر اشاعت پر آنے والا ہے

قیمت
فی جلد دو روپے (عار)

میں جھوم رہا ہوں تو جہاں جھوم رہا ہے

میکدہ علم و ادب اور خمخانۂ شعر و شباب کے چھلکتے ہوئے

پیمانے

گردش میں آگئے

ہر پیمانہ۔ ادب و انشا کی شراب ناب سے لبریز ہے ہندوستان کے مشہور شاعر اور مایہ ناز ادیب حضرت ماہر القادری کا افسانوی مجموعہ کا ہر افسانہ نفسیات انسانی کا آئینہ۔ فن افسانہ نگاری کا شاہکار۔ علم و ادب کا جواہر پارہ۔ ترتیب و تدوین اور اسلوب بیان کے اعتبار سے بے نظیر ہے۔ ان افسانوں میں زندگی ہے لطافت ہے۔ واقعیت پسندی ہے اور سماج کے دل کی دھڑکنیں ہیں۔ ماہر کی زبان اردوئے معلیٰ کا دلپذیر نمونہ ہے۔ اس مجموعہ میں ماہر القادری کا افسانوی آرٹ پوری تکمیل کے ساتھ نظر آتا ہے۔ طباعت نظر نواز کتابت نظر فریب اور ترتیب نظر افروز ہے۔ کیا آپ کتب خانہ اب تک اس انمول ادبی تحفہ سے محروم ہے

قیمت
فی جلد دو روپے (عار)

ملنے کا پتہ

مشہور پبلشنگ ہاؤس اردو بازار دہلی

سلوٹیں

اشعر ملیح آبادی

تم نے پھر مجھ سے کیا ہے وہی بے ربط سوال
"تم جب آتے ہوئے پاس۔ مجھے دیکھتے ہو
میں سمجھتی ہوں کہ خوش ہوگے۔ ہنسو گے شاید
تم مگر جیسے۔ فسردہ سے نظر آتے ہو
سلوٹیں سوچ کی ڈالے ہوئے پیشانی پر
میں سنوں ۔!! مجھ کو بتاؤ کہ تمھیں غم کیا ہے؟"

ہاں مری مونس و غمخوار! محبت کی امیں!
بارہا تم نے کیا مجھ سے یہ بے ربط سوال
اور کچھ سوچ کے ہر بار میں خاموش رہا
اب سنو!! تم کو بتاتا ہوں مجھے غم کیا ہے
آج تک میں نے کئی بار محبت کی ہے
نوجواں، پاک امنگیں مرے دل میں بھی اٹھیں
آہ لیکن یہ زمانہ! ۔ یہ زمانے کے خدا
سب نے ہر بار مرے عشق کو بدنام کیا
اور انجام!! وہی یاس ۔ وہی تنہائی
اور اب شدتِ احساس سے ہوں نالہ بلب

میری دنیا میں مسرت کی کرن ہے معدوم
بے بسی چار طرف سے مجھے جکڑے ہے ابھی
یہ مرے گرد روایات کہن کے حلقے
یہ رسومات کی ہر بات میں ٹیڑھی چالیں
گردِ اوہام میں لپٹی ہوئی اندھی دنیا
مجھ سے دیکھے نہیں جاتے یہ زمانے کے چلن
سوچتا ہوں کہ بدل جائے یہ فرسودہ نظام
اور اس رات کی تابندہ سحر سے پھوٹے
مسکراتی ہوئی ہنستی ہوئی اک سرخ کرن

تم سے مل کر مجھے تسکین تو ہو جاتی ہے
پھر بھی میں سوچتا ہوں سوچتا رہتا ہوں مدام
پھر نہ یہ پاک محبت کہیں رسوا ہو جائے
جس کا انجام جدائی ہو ۔ فراموشی ہو
تم نہ افسردہ ہو! شکوہ نہیں مجھ کو تم سے
سلوٹیں ہیں مرے ماتھے کی ۔ تفکر کا نشاں
آتشِ زیست کے بھڑکے ہوئے شعلوں کا دھواں

انتظار

الطاف پرواز

آج کا دن بھی اسی طرح گذر جائے گا
آج کے دن بھی نسیمی کو نہیں آنا ہے
آج بھی میرے مقدر کو ستم ڈھانا ہے؟
لذّتِ درد کا شیرازہ بکھر جائے گا؟
ایک منصوبہ خیالات میں مر جائے گا!

بارہا وقت کے جھونکوں نے بجھائے ہیں چراغ
بارہا ٹوٹتے دیکھے ہیں ستارے میں نے
پائے ہیں سرمئی آنچل کے اشارے میں نے
جگمگایا ہے کئی بار مرا کنجِ دماغ
ہاں مگر آج نہ پاؤں گا نسیمی کا سراغ

پاٹ کر تیرہ خلاؤں کو چلی آتی تھی
اپنی آغوش کو کھولے ہوئے مانندِ نسیم
مسکراتی ہوئی بل کھاتی ہوئی میری ندیم
خواب بن کر مرے ماحول پہ چھا جاتی تھی
شمع بن کر مرے لمحات کو چمکاتی تھی

اُس کے حالات بدلتے ہوئے دیکھے تو نہیں
کون سی مصلحتِ تازہ نے آ گھیرا ہے؟
اس کے احساس پہ چھایا ہوا اندھیرا ہے؟
انقلابات سنبھلتے ہوئے دیکھے تو نہیں
تیر سینے سے نکلتے ہوئے دیکھے تو نہیں

سوچتا ہوں کہ بدل سکتی ہے تقدیرِ نظر
پھر نسیمی مرے ماحول پہ چھا سکتی ہے
روح، پھر گیت مسرت کے سنا سکتی ہے
شب کے پُرہول مکاں سے نکل آئے گی سحر
یا ابھی دور رہے گا مری آہوں سے اثر

(۶)

غنچے خاموش ہیں، افسردہ ہے پھولوں کی قطار
آج کا دن بھی اسی طرح گذر جائے گا

اصغر علی بی اے

حشرات الارض

اور آخر کار مجھے وہ مکان چھوڑنا پڑا جیسے کوئی خودکشی پر مجبور ہو جائے

وہ ایک خاصی بڑی عمارت تھی جسامت کے لحاظ سے اور شاید عمر کے لحاظ سے بھی کیونکہ اس کی دیواروں پر لپی ہوئی چکنی چکنی سمنٹ بھر بھری ہو کر گرتی جا رہی تھی اور دیواروں کے نچلے حصے کی سمنٹ تو گر کر کب کی ریت میں رل چکی تھی، اور اس کے نیچے سے ٹیڑھی ترچھی اینٹوں نے دانت دکھانے شروع کر دیئے تھے۔ اینٹوں سے چمٹی ہوئی مٹی اپنی طویل ہم آغوشی سے اکتا کر اب جدا ہو جانا چاہتی تھی اور ان اینٹوں کے دانت روز بروز بڑھتے جا رہے تھے جیسے کسی فاقہ کش کے سینے کا گوشت سوکھ کر پسلیاں ابھر آئیں۔

عمارت دو منزلہ تھی، نچلی منزل میں اکثر تانگے والے رہتے تھے اور انہوں نے اپنی اکثریت کے بل بوتے پر صحن کو اچھے خاصے اصطبل میں تبدیل کر لیا تھا، مغربی گوشے والی کوٹھڑی ایک بوڑھے مداری نے کرایہ پر لے رکھی تھی وہ پنجاب کے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا اور اپنی بیوی، ایک جوان لڑکی اور ایک چھوٹے لڑکے کے ساتھ دو سال سے اس کوٹھڑی میں رہ رہا تھا۔ لڑکے کی عمر دس گیارہ سال کے لگ بھگ ہوگی محلے کے بچے اسے جمہورہ کہتے تھے۔ ماں باپ نے تو کوئی اچھا سا نام رکھا ہوگا۔ شاہ دین، وزیر علی یا کوئی اور ایسا ہی باوقار سا نام، مگر نام تو انسان کے مرتبہ، پیشہ اور ماحول کے اعتبار سے بنتے بگڑتے رہتے ہیں تلاش کرنے سے سینکڑوں ایسے آدمی مل جائیں گے جو بچپن میں کلو تھے لیکن جب پڑھ لکھ کر دفتر میں ملازم ہوئے تو کلیم الدین احمد بن گئے اور ہو سکتا ہے کہ ہاری بازی پھانکنے والے یہ کرانہ مرچنٹ جناب سیٹھ الھنگت رام بنے بیٹھے ہیں اور بلیک مارکیٹ سے کمائے ہوئے لاکھوں روپیوں کی خوشی میں پیٹ کے حجم کو نہایت فیاضانہ طور پر پھیلائے چلے جا رہے ہیں۔ آج سے دس سال پہلے کسی گاؤں میں ایک میلی کچیلی دوکان پر بیٹھے گڑ سے مکھیاں اڑاتے ہوں اور گاؤں والے حقارت سے انہیں منگو دوکاندار کہتے ہوں، اس لئے شاہ دین یا وزیر علی کا صرف جمہورہ بن کر رہ جانا کوئی عجیب بات نہیں تھی اور کون جانے اس بوڑھے مداری نے جس کی کمر نقاہت کے سبب روز بروز کمان کی طرح جھکتی جا رہی تھی اور جس کے لمبے لمبے مٹیالے بال ہر وقت اس کی تیلی تیلی لرزتی ہوئی گردن کو ڈھانپے رہتے تھے۔ اسی جمہورے کی ذلیل سی شخصیت کے گرد کتنے ہی سنہرے سپنوں کے جال نہ بن لئے ہوں گے۔ پچھلے چھ سات ماہ سے بوڑھے مداری نے تماشہ دکھانا چھوڑ دیا تھا صبح جب اس کی بیوی اور جوان لڑکی اپنی زنبیل سنبھال کر شہر میں بلسری کے منتروں اور جادو کے ڈنڈے کی مدد سے روپیہ بنانے چلی جاتیں تو وہ اپنی تاریک کوٹھڑی میں بیٹھ کر رسیاں بٹنے لگتا۔ اس کی آنکھوں سے ہر وقت گدلا گدلا سا پانی رستا رہتا تھا اور ان میں سے ایک خواب آلود کیفیت جھلکتی تھی۔ جیسے پنجاب کے سرسبز میدانوں کے جھنکڑوں رنگین خواب سمٹ کر ان میں آ بسے ہوں۔

—— اور وہ لڑکی چڑھتے ہوئے دریا کی طرح جوان ہو رہی تھی۔ بچپن میں چیچک نے جو چھوٹے چھوٹے دانے اس کے چہرے پر بنا دیئے تھے ان کے کناروں پر خون کی ہلکی ہلکی لہریں جھلکنے لگی تھیں اور دوپٹہ تو نہ جانے کیوں بار بار اس کے سینے سے ڈھلک جاتا تھا۔ اس کی دائیں آنکھ ہمیشہ کچھ دھندلی سی رہتی تھی یہ بھی شاید چیچک کی یادگار تھی لیکن شام کو جب وہ جامع مسجد کے مجمع میں تماشا دکھانا شروع کر دیتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ اس آنکھ میں ہزاروں جادو انگڑائیاں لے کر بیدار ہو گئے ہیں لوگوں کا ٹھٹ کا ٹھٹ اس کے گرد جمع ہو جاتا۔ جیسے وہ اس جادو کی زد میں آ گئے ہوں جو پہلی مرتبہ اسے دیکھتے ہی یہ سمجھ بیٹھے کہ آنکھ مار رہی ہے۔ بے حیا کہیں کی مگر چڑھتے ہوئے دریا کو کون روک سکتا ہے اس کے ڈھلکے ہوئے دوپٹے اور چشم نیم باز نے کئی پروانے اپنے گرد جمع کر لئے تھے اور تانگے والے تو اسے اچھی خاصی لڑکی محض سمجھتے تھے حتیٰ کہ منوا اپنے گھوڑے کے لئے گھاس دانا لانے کی بجائے اپنے لئے

دھاری دار پشمین تہبند مخملی واسکٹ اور وارنش کا جوتہ خریدنا زیادہ ضروری سمجھنے لگا تھا اور پھر دو چار پیسے جمہوریت کے لئے بھی اس کی جیب سے نکل ہی جاتے تھے۔

مداری کی کوٹھری کے عین برابر میں ایک اور کوٹھری تھی جس میں ایک فقیر رہتا تھا۔ بڑا باتونی گستاخ اور تنگ مزاج، وہ جمنا کے کنارے کے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا اگست کی ایک رات کو جب چاند بادلوں سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا اور جوار اور باجرے کے کھیتوں سے گھرے ہوئے گاؤں پر نیند کی پریوں نے اپنے پنکھ بکھیر رکھے تھے تو جمنا کے بپھرے ہوئے پانی نے پھیل کر اس گاؤں کے باسیوں کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا تھا اس کی بیوی، بچے اور تمام اثاثہ اس سیلاب کی ہلاکت آفرینی کی نذر ہو گئے تھے اور وہ خود بہتا بہتا ایک درخت سے الجھ گیا تھا اور کئی دن تک وہاں بھوکا پیاسا الجھا رہا تھا اور آخر ریلیف کیمپ کی کشتی نے آ کر اس کی جان بچائی تھی وہ ایک بڑا زمیندار تھا اور اپنے گاؤں میں کئی سو بیگھے زمین کا مالک تھا گھوڑوں کے تانگے سے بچی ہوئی سوکھی گھاس کے الاؤ کے پاس بیٹھ کر وہ کبھی کبھی اپنی کہانی سنایا کرتا تھا پھر سسک کے لمبے لمبے گھونٹ لے کر وہ دھوئیں کے بادلوں کو گھورنے لگتا جیسے ماضی کے کہروں میں لپٹی ہوئی زندگی کے سنہرے سپنوں کو ایک بار پھر جھانک کر دیکھ لینا چاہتا ہو مگر تانگے والے اس کی ڈینگوں میں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ ہو گا وہ بڑا زمیندار کسی زمانے میں اب تو بس وہ ایک فقیر تھا مداری کے برابر والی کوٹھری میں رہنے والا ایک فقیر جو دن بھر ٹوکریاں بناتا تھا اور شام کو کھونٹی پر لٹکی ہوئی جھولی اٹھا کر بھیک مانگنے نکل جاتا تھا اور کیونکہ چرس پیتا تھا اس لئے تانگے والے اسے شاہ جی کہنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔

عمارت کی اوپر والی منزل گویا سماج کا متوسط طبقہ تھا میرے کمرے کے عین سامنے والے کمرے میں وحید رہتا تھا ایک سر تا پا اشتراکی نوجوان کئی سال پہلے اس نے شاید میٹرک پاس کیا تھا یہ وہ زمانہ تھا جب بی۔ اے پاس نوجوانوں نے پتلون کی بجائے دھوتیاں اور بالو بہ شو کی بجائے باٹا کی چپلیں پہننا شروع کر دی تھیں کیونکہ ملازمت کی جستجو میں کولتار کی سخت و سنگین سڑکوں پر ادھر ادھر آوارہ پھرنے سے جوتوں کے تلے گھس جاتے تھے اور اس نقصان عظیم کا مداوا صرف باٹا کی چپلیں ہی کر سکتی تھیں اور دھوتیوں کو پتلون کی طرح ہر تیسرے چوتھے روز استری کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی صرف چار پیسے کا صابن ڈیڑھ سو بلکہ ازکم ایک ہفتہ تک ان کی وضع و شان کو قائم رکھنے کے لئے کافی تھا اور یوں بھی یہ دفتر ٹین کمپنی کی جنگلیوں پر بیٹھنے والے محرر اپنی قلیل سی آمدنی سے جو چادر بنا سکتے تھے اس میں اس سے زیادہ پاؤں پھیلانا ممکن بھی نہ تھا وحید اسی زمانے کے ان مثالی نوجوانوں میں سے تھا جنہوں نے اپنی حوصلہ شکن بیکاری سے تنگ آ کر جوتوں پر پالش کرنا شروع کر دیا تھا اور خواہ مخواہ عوام کی توجہ اپنی طرف منعطف کرائی تھی جب ہٹلر نے ہندوستان کے ان بیکاروں پر رحم کھا کر یورپ کو ہڑپ کر لیا تو وحید بھی جی۔ آئی۔ پی میں ملازم ہو گیا لیکن بیکاری کے زمانے کی ناقابل فراموش گہرے ناسور اس کے دل و دماغ میں پڑ گئے تھے ان کا مندمل ہونا آسان نہ تھا اور اسی زمانے سے اشتراکی ادب میں اس کی دلچسپی بڑھتی چلی گئی تھی حتیٰ کہ کارل مارکس نے اسے اپنے دام خیال میں جکڑ لیا اور اشتمالیت اس کا جزو ایمان بن کر رہ گئی وہ عام اشتراکیوں کی طرح جوشیلا اور جذباتی نہ تھا جب وہ گفتگو کرتا تو ایسا محسوس ہوتا گویا ابھی تمام انگریزوں کی گردنیں پکڑ کر بحر ہند میں ڈبو دے گا لیکن اس روز جب امپیریل سکریٹریٹ کے سامنے کلرکوں کے ایک پر امن جلسے میں چند لال پگڑیوں نے یکایک نمودار ہو کر نفرت اور بغاوت کی ہلکی ہلکی ابھرتی ہوئی لہروں کو اپنے روایتی تشدد کے سنگ گراں سے روک دینے کی کوشش کی تھی تو وحید کا جوش حباب کی طرح بیٹھ گیا تھا اور خوف و سراسیمگی کی لپکتی ہوئی موجوں نے اس کے خون میں کچھ ایسی بوکھلاہٹ پیدا کر دی تھی کہ وہ بے تحاشا بھاگ کر حوض میں گر پڑا تھا۔ بیچارہ وحید جو عقیدۂ و تخیل کی دنیا میں ایک کٹر اشتراکی تھا لیکن زندگی کی چنگھاڑتی ہوئی تلخیوں کے درمیان محض ایک کلرک، ایک بے کس و مجبور کلرک؀

اشتراکی کے برابر والے کمرے میں ایک شاعر رہتا تھا اقبال اور ٹیگور کا مداح ہی نہیں بلکہ عاشق جو کسی سرکاری پریس میں مکینک تھا اسے نئے رسالے اور نئی کتابیں خریدنے کی دھت تھی اور بعض اوقات تو مجھے اس پر رشک آتا تھا کہ یہ ستر اسی روپے کمانے والا مکینک جس کی زندگی سے ایک ماں، ایک دو بہنیں اور ایک آدھ بھائی ضرور جونک کی طرح چمٹے ہوئے ہوں گے، یو۔ پی کے کسی دور افتادہ قصبے میں ہر مہینے کی پہلی تاریخ گزر جانے پر ڈاکئے کی آواز پر کان لگا کر بیٹھ جاتے ہوں گے کس طرح اپنے ادبی ذوق کو زندہ رکھنے پر مصر ہے اور نئے رسالے خریدنے کی بجائے اپنے لئے اونی مفلر خریدنے کو ترجیح نہیں دیتا تاکہ جب وہ صبح سردی میں ٹھٹھرتا ہوا ڈیوٹی پر جائے تو اس کی گردن اور کان ہوا کے سرد جھونکوں سے محفوظ رہیں لیکن اس کا خیال تھا کہ ادب و شعر کی لطافت کے بغیر زندگی مسجد کے اس ویران گنبد کی طرح ہے جو کسی شیریں نغمے کی ہلکی ہلکی میٹھی مترنم لہروں کی شہد آگیں جھنک سے آشنا نہ ہو اور جب جب بات کو طول دیتا تو وہ کہا کرتا تھا کہ جنگلوں کے پرندوں کی پر شور چہچہاہٹ کو غنیمت سمجھو وہ کہا کرتا تھا کہ گیت

زخم خندہ دیگی ان بہرام کا کام کرتے ہیں اور ظلم و تشدد سے کچلے ہوئے انسان کو فطرت کی ان امنگوں اور سپنوں کی دنیا میں لے جاتے ہیں جہاں بزلہ سنج و شکوت کے لا متناہی خواب بکھرے پڑے ہیں اور اقبال، وہ تو ایک چمکتا ہوا شعلہ ہے جو بہار کی مسکن ... اور دمکتی ہوئی سماج کے ہر بوسیدہ اثاثے کو جلا کر خاک کر دینا چاہتا ہے۔ اقبال کے شعر خون بہار کے انجکشن ہیں جو حقیقت اور صداقت کی مردہ رگوں میں حیات تازہ کی تخلیق کرتے ہیں شاعر اکثر اسی جوش کے ساتھ اپنی عقیدت کا اظہار کیا کرتا تھا۔ ایک سرکاری پریس میں کام کرنے والا مکینک، جس کی زندگی سے چمٹی ہوئی چار پانچ جونکیں یو۔ پی کے کسی دور افتادہ قصبے میں ہر مہینے کی پہلی تاریخ گزر جانے پر ڈاک کے منی آرڈر کا انتظار کیا کرتی تھیں۔

میرے کمرے کے بائیں جانب برابر والے مکان میں ایک دوکاندار اپنے تین چار بچوں اور خوبصورت بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ دبلا پتلا مریل سا۔ ایک بد صورت سا دکاندار اس عمارت میں وحید کے بعد یہ دوکاندار ہی شاید سب سے زیادہ خوش پوش آدمی تھا اس کے لباس کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا ذرا مشکل تھا کہ وہ ایک معمولی سا دکاندار ہے ایک ایسی مڑی سی دکان کا مالک جس کی کل کائنات سگریٹ کے چند ڈبوں، دس بارہ بیڑیوں کے بنڈلوں اور اسی قسم کی دو چار اور بیکار سی چیزوں سے زیادہ کچھ نہیں اور واقعہ بھی یہ ہے کہ وہ دکان تو برائے نام ہی تھی۔ اس کا پیشہ تو دراصل قمار بازی تھا۔ سارے سارے دن محلے والے اور مالک مکان اس کے گھر میں بیٹھے جوا کھیلتے رہتے تھے پہلے پہل تو مجھے یقین نہ آتا تھا کہ مالک مکان بھی اس دکاندار کے مکان میں آ کر جوا کھیل سکتا ہے وہ اچھا خاصہ صاحب حیثیت آدمی تھا اور اس کے چہرے سے ایک معصوم سا وقار ٹپکتا تھا ایک مختصر سی کچھ کم داڑھی اور سفید چمکتی ہوئی پیشانی پر سجدوں کے نشان، کون کہہ سکتا تھا یہ شخص جوا کھیلتا ہے لیکن جب میں نے اسے اکثر اس مکان میں آتے جاتے دیکھا تو یقین کر لینا پڑا اور پھر محلے کی روایت تو یہاں تک تھی کہ یعقوب کے گھر کا سارا خرچ یہ مالک مکان ہی چلاتا ہے اور یہ بات تو تقریباً سب ہی کو معلوم تھی کہ اس کی بیوی رنگیل ہوٹل میں ملازم ہے۔

جب رات کو منوا حقہ پینے کے بہانے مداری کی کوٹھڑی میں جا بیٹھتا اور شاعر اپنے کمرے میں اقبال کی کوئی غزل قوالی کی طرز پر گانے لگتا اور وحید لیمپ کے سامنے بیٹھ کر کمیونسٹ پارٹی کے الیکشن مینی فیسٹو کو زور زور سے پڑھنا شروع کر دیتا اور شاہ جی چرس کے دھوئیں کے بادلوں میں ماضی کے کھوئے ہوئے خوابوں کو ڈھونڈنے لگتا تو میرے ذہن پر خیالات کے پرسے کے پرسے یورش کرنے میں لحاف میں منہ چھپائے سوچنے لگتا کچھ ایسی ہی بے معنی سی باتیں، میں سوچتا، یہ صحن میں رینگنے والے حشرات الارض، یہ تانگے والے، جو گالیاں بکتے ہیں اور جوا کھیلتے ہیں، یہ شاہ جی جو ٹوکریاں بناتا اور بھیک مانگتا ہے اور چرس پیتا ہے یہ منوا جو ہر روز مخملی واسکٹ پہن کر حقہ پینے کے بہانے مداری کی کوٹھڑی میں جا بیٹھتا ہے اور مداری کی لڑکی کو بھگا لیجانے کے منصوبے باندھ رہا ہے یہ مداری جو پنجاب کے سرسبز میدانوں کے خواب دیکھتا دیکھتا ایک روز اسی کوٹھڑی میں مر جائے گا، اور مداری کی یہ لڑکی جو شریر ندی کی طرح جوان ہوتی جا رہی ہے اور کسی نہ کسی دن اس منوا کے ساتھ کہیں بھاگ جائے گی اور پھر ایسے ہی دو چار منوا پیدا کر کے ہندوستان کے حشرات الارض کی تعداد بڑھا دیگی اگر میرے پاس کوئی ایسا جادو ہو کہ میں ان سب کے دلوں میں اس آرزو کی قندیل روشن کر دوں جس آرزو کے نشے میں سرشار ہو کر روس کی غیرت نے نازیت کا گلا گھونٹ دیا تھا جس آرزو نے چین میں فسطائیت پرست جاپان کی توپوں کے دانت کھٹے کر دئے تھے اور اسی آرزو کا شعلہ ان حشرات الارض کے دلوں میں بھڑک اٹھے تو کیا ہو، کون جانے کسی روز یہی حشرات الارض لال پگڑیوں کو دیکھ کر حوض میں گرنے کی بجائے انگریزوں کو گزدنوں سے پکڑ کر ہند ساگر میں ڈبو دیں کتنا بے معنی سا خیال تھا اور مجھے خود اپنے آپ پر ہنسی آنے لگتی، اتنے میں شاعر کوئی دوسری غزل چھیڑ دیتا۔ باگیسری کی طرز میں، نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب سحر خیزی اور مجھے محسوس ہونے لگتا جیسے کسی نے اس پرانی اور بوسیدہ عمارت کو یوروپ کے کسی شہر میں اٹھا کر رکھ دیا ہے اور میرے کمرے کے عین سامنے والے فلیٹ پر شاہ جی بہترین سرج کا سوٹ پہنے ٹہل رہا ہے اور مداری کی لڑکی اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھی پیانو بجا رہی ہے اور بوڑھا مداری جیسے برنارڈ شاہ اپنی سٹڈی میں کسی شاہکار ڈرامے کا آخری منظر لکھنے میں منہمک ہو اور پھر برابر سے یعقوب کے کسی بچے کی چیخ میرے کانوں میں گونجنے لگتی اور یہ طلسم خواب ٹوٹ جاتا۔

اور ایک روز جب میں آخری شو دیکھ کر واپس آیا تو مداری کی لڑکی شاعر کے کمرے سے نکل کر جا رہی تھی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے شاعر نے اقبال اور ٹیگور کی گردنیں پکڑ کر ان کے سروں کو ایک دوسرے سے ٹکرا دیا ہے اور کارل مارکس وحید کے کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر کہہ رہا ہے اپنی ملکیت کو مناسب دامون پر بیچ دینا کوئی گناہ نہیں، گناہ تو یہ ہے کہ ضروریات کی چیزوں کا ذخیرہ جمع کر کے عوام کو قحط کی لعنت میں مبتلا کر دیا جائے اور اس لڑکی کے لئے تو سب ہی برابر تھے کیا منوا، کیا شاہ جی اور کیا شاعر، اچھا صرف وہ ہے جو مال کھرے دامون خریدے نیچے کوٹھڑی میں شاید بوڑھا مداری بڑبڑا رہا تھا، بابو جی حیران کیوں ہوتے ہو

مجھے دیکھو۔ میری اس لرزتی ہوئی گردن کو دیکھو اس کمان کی طرح جھکی ہوئی کمر کو دیکھو اور پھر تم جاسوسی ہی بتلا تم ہی بتاؤ اس مہنگائی میں کیسے گزارہ ہو سکتا ہے ؟

اس واقعہ کے بعد تین چار روز تک میرے سر میں کچھ ہلکا ہلکا سا درد ہوتا رہا۔ فاصر پریس سے چھٹی لے کر اپنے وطن چلا گیا تھا۔ نواب استو مدارن کی، کوٹھڑی میں بیٹھا کرتا تھا اور اب تو شاہ جی نے بھی ان کی رقابت کا دم بھرنا شروع کر دیا تھا لیکن کچھ دن کھینچا تانی کے بعد ان میں شاید سمجھوتہ سا ہو گیا تھا اشیاء روز بروز مہنگی ہوتی جا رہی تھیں اور یعقوب نے اپنے قمار بازی کے کاروبار کو کافی پھیلا لیا تھا اور اب مالک مکان کبھی کبھی رات کو بھی یعقوب کے مکان میں آنے جانے لگا تھا اور یعقوب کی بیوی اب بھی دن بھر گھر سے غائب رہتی تھی۔

شاید اتوار کا دن تھا میں اور وحید اپنے اپنے کمروں کے سامنے بیٹھے دھوپ تاپ رہے تھے کہ اچانک یعقوب کے زینے پر بھاری قدموں کی آواز سنائی دی اور چند ہی لمحوں میں تھانیدار دروازے کے کواڑ توڑ کر مکان میں داخل ہو چکا تھا اور پھر دھپا دھپ، دھپا دھپ جیسے کوئی سڑک کوٹ رہا ہو۔ مارو پاجی کو، جوا کھیلتا ہے بدمعاش تجھے شرم نہیں آتی خبیث نے سارے محلے کو گندہ کر رکھا ہے جو پیسے کے لئے بند نہ کیا ہو تو میرا نام ٹھاکر سنگھ نہیں، پاجی، بے شرم، تھانیدار کی آواز پوری گرج کے ساتھ گونج رہی تھی محلے کے بہت سے لوگ تماشہ دیکھنے کے لئے جمع ہو گئے تھے اور تھانیدار کی ہر گالی کے ساتھ ایک ٹھوکر یعقوب کی کمر میں پیوست ہو رہی تھی اس کی بائیں آنکھ سوج گئی تھی اور گالوں پر انگلیوں کے نشان صاف دکھائی دے رہے تھے سپاہیوں نے تینوں تانگے والوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دی تھیں اور پاس ہی مالک مکان ایک اونی شال اوڑھے کھڑا تھا، دروازے کی دیوار کے قریب یعقوب کا بڑا لڑکا کھڑا کانپ رہا تھا، باقی تینوں بچے بھوں بھوں رو رہے تھے اور ان کی ماں رنگیلی ہوٹل میں ڈھیلے کیا کر رہی تھی۔ ان کانپتے ہوئے روتے ہوئے بچوں سے بے خبر، جنہیں وحید اپنے کمرے کے سامنے کھڑا ہوا ابھی ابھی نظروں سے تک رہا تھا جیسے سوچ رہا ہو، انگریز ہندوستان کو چھوڑ کر چلے بھی جائے تو کیا ہے، ان کی پیدا کی ہوئی سماج کو بگڑتے مٹتے ابھی صدیاں چاہئیں

اور دوسرے دن میں اس مکان کو چھوڑ کر چلا آیا

جاگ رہے ہیں

نذیر بنارسی

پیا مجھے اِس پار بسا کر چلے گئے اُس پار
پریم کی میٹھی میٹھی اگنی آنسو کے نہ ٹوٹیں تار
ان کے لئے میں گوندھ رہی ہوں پریت کا سندر ہار
جاگ رہے ہیں چاند ستارے نیند میں ہے سنسار

آس نہ آئی راس کسی کو مجھے تو آئی راس
پٹ کھول کے کب سے نینن کے دیکھ رہی ہوں آس
آنکھوں میں ایسے آس بسی ہے پھولوں میں جیسے باس
جاگ رہے ہیں چاند ستارے نیند میں ہے سنسار

آدھی بازی جیتی ہے میری آدھی بازی مات
آنیوالے آئیں نہ آئیں ان کے من کی بات
پیارے پریتم پاس نہیں ہائے رو پہلی رات
جاگ رہے ہیں چاند ستارے نیند میں ہے سنسار

ماتھے پر رکھ کر ہاتھ رو رہی ہے ناری
چھوٹ رہی ہے بندی بھیگ رہی ہے ساری
من موہن آئے نہ اب تک ہائے نذیر اجیاری
جاگ رہے ہیں چاند ستارے نیند میں ہے سنسار

ا جاوید لطیفی

نفرت

میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ ہو سکتا ہے اب کچھ خوبصورت ہو گئی ہو گی اور اس کی وہ متانت اور سنجیدگی دور ہو چکی ہو گی لیکن جب اسے دیکھا تو اس سے اور بھی نفرت ہو گئی پہلے بھی اس سے نفرت تھی لیکن اب جبکہ ہم دونوں کی جدائی کو تین سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا اور زمانہ کی ہوا کو اس نے میری طبیعت کو بھی کچھ بدل دیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس سے نفرت کا سلسلہ جاری رکھوں، بلکہ الٹی کچھ خوشی ہو رہی تھی کہ دیکھیں اب کیا ہو گیا ہے، ہو سکتا ہے تین سال کے بعد مجھے دیکھ کر خوش ہوتی ہے یا نہیں۔ اگر وہ خوش ہو جائے اور وہ غبار جو اس زمانے میں ہمارے دل سے نہیں پتا گیا تھا دھل جائے۔ اور وہ پردہ ——— کھنچاؤ اور ایک دوسرے سے الگ ۔ رہنے کا وہ جذبہ دور ہو جائے تو اچھا ہی ہو۔ کم از کم اس سے دل ہی بہلتا رہے گا ——— اور میرا دل بھی نرم ہو گیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس میں اور مجھ میں پھر سے بات چیت ہو جائے، بات کرنے میں یوں تو کوئی رکاوٹ نہیں تھی لیکن نہ جانے کیوں ہم دونوں نے ہی خود بات کرنا بند کر دیا تھا۔

لیکن جب جو اسے دیکھا تو اس سے اور بھی شدید نفرت پیدا ہو گئی۔ صرف اسی سے ہی نہیں بلکہ ہر پارسی مرد عورت سے ——— ہو سکتا ہے مجھے دلچسپی اس لئے ہو گئی تھی کہ بہت دن ہم دونوں ساتھ ساتھ رہے، ہم میں دوستی تھی ورنہ وہ کوئی اتنی خوبصورت تو تھی نہیں کہ اس سے محبت کی جاتی اور عام طور پر میرے نزدیک ہر پارسی مرد اور عورت بدنما ہوتے ہیں، نہ مجھے ان کا اوڑھنا پہننا پسند ہے اور نہ ان کی شکل و صورت، جس پارسی کو دیکھو بیڈھنگا، بے ڈول اور عجیب و غریب جسم کا مالک نظر آئے گا یا بہت ہی دبلا پتلا، یا ایک دم فٹ بال، کسی کی ناک بڑی ہے تو کسی کی آنکھ، کسی کا منہ بیر کی گٹھلی ہے، تو کسی کا اتنا لمبا جیسے گھوڑے کا منہ اور لباس ——— لباس، دنیا میں آپ ایسا لباس کسی کے بھی جسم پر نہیں دیکھیں گے، ایک عجیب و غریب پتلون، اس پر ایک شیروانی نما کوٹ، نہ شیروانی نہ کوٹ بلکہ کوئی اور چیز جس کا آج تک نام ہی نہیں رکھا گیا۔ اور اگر کوئی نام ہے تو وہ صرف درزی یا پہننے والے کو ہی معلوم ہے اور ٹوپی ——— ایک کالی چھوٹی سی ٹوپی جو پورے سر پر منڈھی ہوئی ہوتی ہے، جسے کٹورا کہنا زیادہ اچھا ہو گا اور یہی کٹورا پارسی لڑکیاں بھی پہنتی ہیں۔ لیکن یہ کٹورا کالا نہیں بلکہ زرد اور گوٹہ کناری سے بنا ہوا ہوتا ہے جو کبھی کبھی لڑکیوں پر اچھا بھی معلوم ہوتا ہے جس طرح پارسی مرد بدصورت ہوتا ہے اور جو خامیاں اس کے جسم میں ہوتی ہیں۔ اسی طرح عورتوں میں بھی ہوتی ہیں اور منہ تو کسی کا بھی اچھا نہیں ہوتا لیکن وہ اچھی اس لئے معلوم ہوتی ہیں کہ وہ عورت ہوتی ہیں اور عورت ......

——— یہ عورتیں ساریاں پہنتی ہیں نہایت بھدے پن سے، میں تو ہر پارسی ساری پہننے والی کو یہ مشورہ دوں گا کہ اگر وہ ساری ہی پہننا چاہتی ہے تو دکن کی برہمن لڑکیوں سے پہننا سیکھے، بہت سی پارسی لڑکیاں فراک پہنتی ہیں، امریکن عورتوں جیسا، لیکن مجھے فراک بالکل پسند نہیں، اس لئے کہ جس لڑکی کو میں فراک پہنے دیکھتا ہوں، اس میں کچھ کمی ضرور پاتا ہوں۔ ——— کمی کپڑے کی ——— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فراک پہن کر اور بھی عریاں ہو گئی ہیں، فراک پر دوپٹہ کی کمی ہمیشہ تیری طرح محسوس ہوتی ہے، بعض امریکن فلموں میں کسی دوشیزہ کو اگر ایک پتلا کپڑا بطور فیشن گلے میں ڈالے دیکھتا ہوں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ایک بہت بڑی کمی کو کسی ...... حد تک پورا تو کیا ——— اور مجھے سب سے زیادہ نفرت لمبی ناک والے پارسی مرد اور عورتوں سے ہے چاہے یہ نفرت کوئی بھی حیثیت یا اثر نہ رکھتی ہو لیکن ہے نفرت ——— ان طوطوں جیسی ناک،

والوں کو جب میں دیکھتا ہوں تو جی میں آتا ہے کہ انہیں بھی ایک طوطے کی طرح پنجرے میں بند کر دوں اور ان سے باتیں کروں — مٹھو بیٹے ...... مٹھو بیٹے نبی جی بولو، بولو .... بہت تمہاری مٹھو بیٹے کی ایسی تیسی — اور یہ نفرت بھی عجیب و غریب نفرت کچھوؤں کی مادری زبان اور ان کی قطب مینار ایسی لمبی لمبی تھوتھنیوں سے بھی ہے۔ اور اب چوہوں سے بھی نفرت ہو گئی ہے — ہمیشہ کے لئے یا معلوم نہیں کب تک —

ہومائے کو اگر کوئی دیکھے تو یہی سوچے کہ معلوم نہیں یہ عورت کسی سے ہنس کر بات بھی کرتی ہے یا نہیں، چہرے پر ہمیشہ سنجیدگی اور ایک ایسا رعب کہ کوئی اس سے محبت کرنا چاہے بھی تو نہیں کر سکتا اور اگر محبت کرنے لگے تو اس کا اظہار پھر نہیں کر سکتا۔ اور اگر اظہار کی جرأت بھی کر لی تو اس سے کچھ نہیں پا سکتا — چند میٹھے الفاظ تک نہیں — چنانچہ میں نے بھی جب پہلی بار اسے دیکھا تو اس سے ملنے تک کی خواہش نہیں ہوئی، میں مع والدین اور بھائی بہنوں کے ایسی جگہ آیا تھا جہاں ہومائے کا مکان تھا، بالکل پاس ہی — چند دن اجنبیت قائم رہی اور پھر میرے چھوٹے بھائی بہنوں نے ہومائے کے گھر جا کر کھیلنا کودنا شروع کر دیا اور ہومائے کا چھوٹا بھائی ریڈی ہمارے گھر آنے جانے لگا۔ ہومائے اس وقت پڑھنے جاتی تھی ایک انگریزی اسکول میں اور میں بھی اس وقت پڑھنے جایا کرتا تھا۔ جب کبھی میرے اسکول کے دوست مکان پر آتے اور ہومائے کو دیکھتے تو ہائے ہائے کرنے لگتے، وہ صرف ایک نوجوان لڑکی کو دیکھ کر ہی آہیں بھرا کرتے تھے ورنہ ہومائے اتنی کچھ حسین نہیں تھی اور اس کی متانت تو اسے اور بھی ناٹے رکھتی یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہومائے انہیں بھاتی ہو۔ اکثر بار تو ایسا ہوتا کہ میرے دوست مجھ سے ملنے کے بہانے ہومائے کو دیکھنے آتے — مجھ سے کہتے کہ کمبخت تو کیوں خاموش ہے تو تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔

پتنگیں اڑانے کا موسم تھا — اور مجھے پتنگ اڑانے کا بہت شوق تھا۔ ہومائے کا چھوٹا بھائی بھی اسی شوق میں مبتلا تھا۔ کئی بار میں نے اس کی پتنگیں کاٹیں مگر لیکن ہر بار وہ مجھ سے ہی پتنگ لڑاتا۔ ہم دونوں قریب قریب سے ہی پتنگ اڑایا کرتے تھے، جب کبھی وہ میری پتنگ کاٹتا تو خوشی کے مارے چلاتا۔ ہومائے بھی صرف مسکرا دیتی اور میری طرف دیکھ کر چپ ہو جاتی —

ایک دن ابا مجھ پر بہت بگڑے۔ وہ میرے اس شوق سے نفرت کرتے تھے۔ اتفاق سے انہوں نے میری پتنگیں جو کہ میں ان کے خوف سے چند صندوقوں کے پیچھے چھپا کر رکھتا تھا دیکھ لیں۔ اماں سے معلوم ہوا کہ ان کا بنیان کہیں صندوق پر سے پھسل کر پیچھے گر گیا اور جب اسے نکالنے کے لئے انہوں نے صندوق سرکائے تو پتنگیں اور تاگے کی چرخی دکھائی دی۔ بس پھر کیا تھا — اسی وقت پتنگیں پھاڑ ڈالیں اور گھر میں اماں سے تاکید کر دی گئی کہ وہ کبھی یہاں پتنگیں نہ دیکھیں — اور بعد میں مجھے بھی ڈانٹا کہ بچہ بنا ہوا ہے۔ ابھی تک پتنگیں اڑاتا پھرتا ہے — اس دن سے میں نے ریڈی کو اپنا دوست بنا لیا اور پتنگیں، تاگے کی چرخی اور مانجھا وغیرہ اسکے پاس رکھنے لگا۔ جب ضرورت ہوئی پتنگیں وغیرہ اس سے منگوائیں اور پھر اسی کے حوالے کر دیں — ایک دن ریڈی نہیں تھا اور مجھے پتنگ کی ضرورت تھی، میں فوراً اس کے مکان کی سیڑھیوں پر چڑھتا اوپر جا پہنچا اور اسے آواز دی، اور ہومائے نے آکر مجھ سے کام پوچھا — یہی میری اور اس کی پہلی ملاقات تھی۔ میں نے کہا کہ ریڈی اپنی پتنگیں کہاں رکھتا ہے۔ وہ جگہ مجھ کو بتا دو تاکہ میں اپنی پتنگ اور چرخی لے لوں مجھے اس وقت ضرورت ہے — اور اس کے بعد میں روز اس کے مکان آنے جانے لگا۔

ہومائے کا باپ نہایت خلیق اور خوش مزاج آدمی تھا، اس کا نام تھا ہرمز جی — ہرمز جی اپنے بچوں سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس کی بیوی مر چکی تھی اور اس نے ہومائے اور ریڈی کی نگہداشت کے لئے ایک ملازمہ رکھ لی تھی جو گھر کے تمام کام کاج بھی کرتی تھی اسی ملازمہ کا شوہر بھی ہرمز جی کے مکان میں ملازم تھا، اور یہ دونوں بنگلہ کے نچلے حصہ میں ایک کوٹھڑی میں رہتے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی دو لڑکیاں اور ایک بچہ بھی تھا۔ سب سے بڑی لڑکی کا نام کوشلیا تھا اور سب اسے کوشی کوشی کہتے تھے۔ لڑکی سانولے رنگ کی تھی اور مجھے بہت پسند تھی اور اسے بھی مجھ سے باتیں کرنے میں بڑی خوشی محسوس ہوتی تھی

اب میں ہومائے کے مکان پر پتنگ اڑایا کرتا تھا اور ریڈی تاگے کی چرخی سنبھالے رہتا جب کبھی پتنگ ہوا میں خوب اونچی اڑتی رہتی اور ساکت کھڑی رہتی تو میں کوشی کو تھوڑی دیر کے لئے تاگا پکڑا دیتا اور وہ خوشی سے پتنگ اڑاتی رہتی۔ لیکن ہومائے نے



نے کبھی ایسی تمنا نہیں کی۔ میں نے ایک دن اسے پاس بلا کر زبردستی اڑتی ہوئی پتنگ اس کے ہاتھ میں دے دی اور جب پتنگ نے غوطہ کھایا تو چیخ کر پیچھے ہٹ گئی ـــ "دور لے جاؤ، ڈور لے جاؤ مجھے ڈر لگ رہا ہے" ـــ لیکن یہ خوف اتنی تھی کہ ڈور ہاتھ سے نہیں چھوڑی اور چیختی رہی۔ میں مذاق کر رہا تھا اس لئے ڈور میں نے لی ہی نہیں، اس کی اس گھبراہٹ پر سب ہنس رہے تھے، کوشی بھی، ریڈی بھی اور میں بھی۔ آخر جب اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور پتنگ ایک درخت پر الجھنا ہی چاہتی تھی تو میں نے اس کے ہاتھ سے ڈور لے لی۔ ریڈی اسے چڑانے لگا ـــ ڈرپوک، ڈرپوک ـــ

پتنگ اڑانے کے علاوہ ہم سب یعنی ہوما، کوشی، ریڈی اور میں لڑکے چھپنے کا کھیل بھی کھیلا کرتے۔ جب کبھی کوشی چور بنتی تو مجھے ہی ڈھونڈتی اور ہوما چور بنتی تو اگر میں نظر بھی آجاتا تو وہ مجھ سے کترا جاتی اور کسی اور کو جا کر چھو لیتی اور میں جب کبھی بھی چور بنتا تو کوشی اور ہوما کے سوا کسی اور کو نہیں چھوتا تھا۔ یہ کھیل ہوما کے مکان پر ہی ہوتا تھا اور بڑی اُدھم مچتی تھی ـــ ایک دن میرے اکسانے پر ریڈی نے مسٹر مرزا جی کو کہا کہ "پاپا تم بھی ہمارے ساتھ کھیل کھیلو یہاں گھر میں کون دیکھتا ہے۔" اور وہ ہنس کر چھتری ہاتھ میں پکڑے دوکان کی طرف چل دیئے یہ کہتے ہوئے "تم ہی کھیلو بابا، ہمارا زمانہ لد گیا"

اور اسی طرح کئی دن بیت گئے لیکن ہوما مجھ سے بے تکلف نہیں ہوئی۔ میں اسے سینما لے جایا کرتا، اس سے باتیں کیا کرتا، لیکن وہ اپنی متانت چھوڑتی نظر نہیں آتی تھی۔ اسی لئے مایوس ہو کر میں کوشی کی طرف متوجہ ہو جایا کرتا تھا ـــ ایک دن ریڈی پیچھے پڑ گیا کہ چلو کھیل دیکھنے ـــ ہمیشہ ہی ریڈی سینما دیکھنے کی فرمائش کیا کرتا تھا اور مسٹر مرزا جی اسے میرے حوالے کر دیا کرتے تھے کہ لے جاؤ بھئی اسے کھیل دکھلا لاؤ ـــ اور میں ریڈی کو اشارہ کر دیا کرتا تھا کہ ہوما کو بھی ساتھ لے لو، اگر وہ انکار کر دیتی تو وہ خوب اس کا سر کھاتا اور تنگ کرتا، یہاں تک کہ وہ چلنے پر راضی ہو جاتی۔ لیکن اب جو ریڈی نے سینما کا کہا تو میں نے کہہ دیا میں نہیں آتا مجھے کچھ کام ہے، اور وہ مسٹر مرزا جی سے جو اپنے پارسی بھائیوں کی کسی میٹنگ میں شریک ہونے جا رہے تھے پوچھ کر ملازم کو ساتھ لے کر سینما چلا گیا۔ ہوما سکول کی کتابیں پڑھ رہی تھی ـــ میں نے اس سے کہا ـــ "چلو کیرم کھیلیں" "یہ کیا پڑھ رہی ہو اس وقت" ـــ اور زبردستی گھسیٹ کر اس کو کیرم کھیلنے لا بٹھایا، مسٹر مرزا جی نے اپنی چھتری سنبھالی اور ملازمہ کو کہا ـــ کہ ریڈی اسے سینما لے گیا ہے تم جا کر سودا لے آؤ یہ لو پیسے ـــ اور ملازمہ کوشی کو بھی اپنے ساتھ بازار لے گئی ـــ ہوما نے تھوڑی ہی دیر میں مجھے گیم دے دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں گیم ہار چکا تھا۔ میں نے کہا کہ بیٹھو اب کے تمہیں ہراؤں گا لیکن وہ جا کر صوفے پر بیٹھ گئی اور پھر کتابیں پڑھنے لگی۔ مجھے اسے ہرانے کی فکر تھی۔ میں نے جا کر اس کی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ کھڑی ہو گئی اور پھر اچانک میں نے اسے اپنی آغوش میں بھینچ لیا ـــ وہ چپ رہی ـــ میں نے دروازہ بند کر دیا ـــ وہ چپ رہی ـــ اور پھر سب کچھ ہو گیا .... اور یہی سب کچھ اس کوشی کے ساتھ بھی ہو چکا تھا۔

دوسرے دن عجیب عالم تھا۔ نہ میں ہوما سے نظریں ملا سکتا تھا اور نہ ہوما مجھ سے، بس جیسے دونوں نے جان لیا کہ سب تعلقات ختم ـــ کئی بار وہ ملنے میں کترا گئی۔ کئی بار میں ملا وہ الگ ہو گئی۔ نامعلوم طور پر وہ مجھ سے نفرت کرنے لگی اور میں اس سے، خواہ مخواہ کی نفرت۔ نہ جانے کیوں اس کے اور میرے درمیان کئی پردے پڑ گئے۔ ایسے پردے کہ جن کے آر پار نہ وہ مجھے دیکھتی تھی اور نہ میں اسے، اور ملنا نہیں چاہتا تھا کوئی بھی، ورنہ وہ پردے الگ بھی ہو سکتے تھے اور تعجب تو اس پہ ہے کہ ایسا کوشی کے ساتھ نہیں ہوا، نہ اس سے نفرت ہوئی اور نہ یہ جذبہ پیدا ہوا کہ اس سے الگ رہا جائے ـــ کچھ دنوں بعد حالات ایسے بدلے کہ میں وہ شہر چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا۔

تین سال بعد اب میں جب پھر اسی جگہ آیا جہاں ہوما کا مکان تھا تو جو کچھ میں چاہتا تھا وہ نہیں ہوا، میں یہ جانتے ہوئے تھا کہ اس وقت کے جذبات اب ہوما کے کہاں ہوں گے۔ ممکن ہے جس طرح میں یہ چاہتا ہوں کہ میری اس کی بات چیت ہو جائے وہ بھی چاہتی ہو اور زمانے نے جس طرح مجھے بدل دیا ہے اسے بھی بدل دیا ہو، اس کی وہ سنجیدگی اور متانت دور ہو چکی ہو۔ میں مکان میں داخل ہوا تو مسٹر مرزا جی ملے۔ وہی تپاک، وہی اخلاق، جی بڑا خوش ہوا لیکن جب ہوما سے ملا تو اس کو دیکھتے ہی جیسے خیالات کے محل گر پڑے ـــ اس کی گود میں بچہ تھا اور چہرے پر وہی مایوسی ڈیرہ جمائے ہوئے تھی اور اب تو اس کے ہونٹوں کے پاس والی لکیریں اور بھی گہری ہو گئی تھیں۔ سنجیدگی میں ایک انوکھا پن آ گیا تھا جو مجھے بہت ناگوار معلوم ہوا اور وہ ساری میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت دکھائی دے رہی تھی ـــ اور مجھے یکایک محسوس ہوا کہ اب مجھ میں اور اس میں کبھی میل نہیں ہو گا ـــ کبھی نہیں

تمغے کا وہ سرا ہی غائب ہو چکا تھا جس کو میں گرہ دینا چاہتا تھا، ٹوٹے ہوئے فلیتہ کا ایک حصہ ہی نہیں ملتا مجھے پریشان ہونے آیا تھا۔ اس کی گردن میں نے پوچھا اور دل ہی دل میں کہا — طرح کا بچہ یعنی منشو کا بیٹا — جب میں واپس ہوا تو سیڑھیوں پر کوشش ملی تھوڑی موٹی ہو گئی تھی لیکن اس سے اس کی دلکشی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا اور اس کے جسم پر ایک دلکش تناؤ پیدا ہو گیا تھا چہرے پر کہیں کہیں چھنیاں بھی تھیں اس نے مجھے دیکھا اور خوش ہو کر کہا

"کب آئے سیٹھ؟"

میں نے جواب نہیں دیا بلکہ سوال کیا۔

"تمہارے کی شادی کب ہوئی اور یہ بچہ کب پیدا ہوا؟"

"شادی تو آپ کے جانے کے بعد ہی ہو گئی تھی اور بچے بھی دو ڈھائی مہینے کا ہے آپ اچھے وقت آئے کل وہ شوہر کے گھر جا رہی ہے ملاقات بھی نہیں ہوتی ورنہ"

"اور تیری بھی شادی ہوئی یا نہیں؟"

"میری — ہو بھی گئی اور شوہر بھی مر گیا — اور آپ کی سیٹھ —؟ اس کی آنکھوں میں عجیب چمک پیدا ہو گئی۔

"نہیں ہوئی"

اچھا اب میں جاتا ہوں — میں نے کہا — اور اس نے کچھ اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ مت جاؤ، مت جاؤ، وہی موقعے پھر آ سکتے ہیں، میں وہی ہوں، میں وہی ہوں اور محسوس کر رہی ہوں کہ آپ بھی وہی ہیں۔ بدلے نہیں وہی ہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔

لیکن ۔۔۔ ۔۔۔ اچھا سو قعہ ملے مزید آؤں گا اور یہ کہتا ہوا میں تیزی سے سیڑھیوں سے نیچے اتر آیا ایک شدید نفرت کا احساس لئے ہوئے!

گنتور میں قوم

سیدہ بکڈپو امام باڑہ اسٹریٹ اور محمد مصطفیٰ خاں باڑہ امام پنجا سے ۶ر میں خرید فرمائیے

فردوسِ تخیّل

اصغر شعری

ہجر کی رات مختصر نہ ہوئی
زندگی کٹ گئی سحر نہ ہوئی

ہم بھی دیتے جوابِ خلد مگر
ہائے وہ تیری رہگذر نہ ہوئی

عشق کی عشق کے زمانے میں
شام تو ہو گئی سحر نہ ہوئی

سب پہ ظاہر تھی میری بربادی
ایک صرف آپ کو خبر نہ ہوئی

وہ بھی گریاں تھے میں بھی گریاں تھا
ایسی پھر آج تک سحر نہ ہوئی

حشر جذبات دل میں برپا ہے
اک قیامت ہوئی نظر نہ ہوئی

اور سب پر رہی نگاہِ کرم
اک ہماری طرف نظر نہ ہوئی

کر گئی کام اک یوں ہی سی نگاہ
مجھکو کیا ان کو بھی خبر نہ ہوئی

دل سے نکلی تھی اک تڑپ کر آہ
خیر گذری کہ با اثر نہ ہوئی

بارہا ان کے ہجر میں شعری
رو لئے ہم اور آنکھ تر نہ ہوئی

سلمان الارشد فاروقی

مسلسل ۷

رقص

اسلم سے قمر کی یہ حالت پوشیدہ نہیں رہی اور اس نے اندازہ کر لیا کہ قمر بھی اس کا حریف ہے اسی لئے اس نے یہ ضروری سمجھا کہ اس مسئلہ کو صاف کر لیا جائے اور یہ سوچکر اس نے بظاہر بڑی لاپرواہی مگر نرمی سے پوچھا

"بھائی قمر آخر بات کیا ہے؟ تم کیوں کھنچے کھنچے سے نظر آ رہے ہو!"

"کچھ نہیں" قمر نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں جواب دیا۔

"نہیں نہیں کوئی نہ کوئی بات تو ضرور ہے تمہاری اس فسردگی اور خاموشی کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم بھی اپنے دل میں وہی جذبات رکھتے ہو جو میرے سینے میں ہیں؟"

اور معلوم نہیں قمر نے کیسے یہ جواب دے دیا کہ "تم غلط سمجھ رہے ہو اسلم"

"تمہارے کہنے کے مطابق اگر میں غلط سمجھ رہا ہوں اور خدا کرے میرے یہ شکوک غلط ہی ہوں تو بھی تمہاری یہ خاموشی اور پژمردگی اس بات کی غمازی کر رہی ہے کہ تم کسی الجھن میں مبتلا ہو۔"

"الجھن نہیں اسلم بھائی میں تو صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ تم اپنے اس ارادے میں کامیاب کیسے ہوگے؟ کیونکہ ہمارے خاندان میں آج تک کسی بیوہ لڑکی کی شادی نہیں ہوئی اور آج بھی افراد خاندان یہ کہکر خاندان کی برتری اور عظمت کا ڈھنڈورہ پیٹتے ہیں کہ ہمارے یہاں کی لڑکی عمر میں صرف ایک مرد سامنے دیکھتی ہے خواہ اسے بیوگی کی زندگی رو رو کر گذارنا پڑے یا عبادت کر کر کے پس خاندانی نقطہ نظر سے جب یہ ایک معیوب فعل ہے تو خالہ اور خالو ابا اس کو کسی صورت سے بھی جائز نہیں رکھیں گے وہ جان دے دینگے مگر یہ کبھی نہ ہونے دیں گے اس کے علاوہ میرا یہ بھی خیال ہے کہ خود دل آرا بھی اب اس کے لئے تیار نہ ہوگی کیونکہ وہ آج تک منیر مرحوم کی پرستار ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو قمر میں یہ سب کچھ سمجھتا ہوں مگر تم ہی بتاؤ کہ یہ کونسا قانون ہے کہ ایک نوجوان لڑکی کے جذبات کا گلا گھونٹ دیا جائے اس کی پوری زندگی تباہ کر دی جائے محض خاندان کے مصنوعی اور کھوکھلے وقار کی خاطر جب اسلام نے بیوہ کی شادی کو مستحسن قرار دیا ہے تو ان بزرگوں کو یہ حق کب حاصل ہے کہ وہ اسلام کے بیان اصولوں میں لچک پیدا کریں مستحسن فعل کو معیوب سمجھیں یہ نہ صرف مذہب ہی کی توہین ہے بلکہ خدا کے احکامات کو بھی ایک قسم کا چیلنج ہے رہا یہ کہ دل آرا اس کے لئے تیار نہ ہوگی یہ ماننے کے لئے میں آمادہ نہیں ہوں البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی خاندان کے فرسودہ قوانین سے خوف زدہ ہو کر اس کی جرأت نہ کرے مگر میں اس میں ہمت پیدا کرنے کی کوشش کرونگا اور اس کی اس اخلاقی جرأت کو بیدار کرنے کی کوشش کرونگا جو ایک لڑکی میں موجود تو ہوتی ہے مگر وہ غلط ماحول کی وجہ سے اس کا کبھی استعمال نہیں کرتی۔ اس کے علاوہ میرا یہ بھی اندازہ ہے کہ دل آرا عام لڑکیوں کے مقابلہ میں زیادہ ذکی الحس ہے مجھے یقین ہے کہ چند دن کی محنت کے بعد ہم ذہنی حیثیت سے ایک دوسرے کے بہت قریب ہو جائینگے اور پھر خاندان کے اس مصنوعی وقار کے محل کو ڈھانا ہمارے لئے کوئی زیادہ مشکل کام نہ ہوگا۔"

"لیکن اسلم وہ منیر کی پرستش آج بھی اسی طرح کر رہی ہے جیسی اس کی زندگی میں کرتی تھی۔"

"اوہ! یہ کوئی بات نہیں قمر۔ ہندوستان ایک مردہ پرست ملک ہے یہاں ہمیشہ مرنے کے بعد انسان کی پوجا کی جاتی ہے مگر صرف چند دن۔ چنانچہ ہمارے خاندانوں میں ابھی یہ مردہ پرستی ایک رواج کی طرح رائج ہے لیکن حقیقت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں غلامی نے ہمارے ذہنوں کو تاریک کر کے رکھ دیا ہے

ہم میں سے سوچنے اور سمجھنے کی تقریباً تمام صلاحیتیں مفقود ہو چکی ہیں ہماری زندگیاں نقل کی عادی ہو چکی ہیں بس یہ سمجھ لیجئے کہ آج کل کی اسی فیصدی بیویاں تو بطور فیشن کے اپنے شوہروں سے محبت کرتی ہیں۔ مگر جوں جوں زمانہ بدلتا جا رہا ہے نظریات واحساسات میں بھی تبدیلی ہوتی جا رہی ہے زندگی کی قدریں تیزی سے بدل رہی ہیں پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ہماری معاشرت پر اس کا اثر نہ ہو چنانچہ ہمارے خاندان بھی غیر شعوری طور پر بدل رہے ہیں مگر روایات کی قدامت سے متاثر ہو کر ابھی ہمارے خاندان ایک دم سے ان کو ختم کرنے کی ہمت نہیں پاتے لیکن کسی دل کش اور حسین انقلاب کے بعد شاید اب رہ جاتی ہیں، خاندانوں کے وہ پانچ فیصدی بزرگ جو حالات سے متاثر ہونے کے باوجود قدیم رسم ورواج میں تبدیلی پسند نہیں کرتے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کو اندیشہ ہے کہ اس مغربی انقلاب سے ان کی خاندانی چودھراہٹ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جانے گی اور ان کا کوئی اقتدار باقی نہیں رہے گا۔ پس دل آرا کی یہ پرستش بھی ایک اسی قسم کا سوانگ ہے جو اسے پو دوسری قسم کے لوگوں کو خوش کرنے کی خاطر رچانے پر مجبور ہے۔ اگر تم اسے یقین ہو جائے کہ پورے خلوص سے کوئی اسے چاہ رہا ہے تو یہ بالویہ سوانگ فوراً ختم ہو جائے گا لیکن جب تک وہ شادی میں شیت کا صحیح اندازہ نہیں کرے گی اس وقت تک وہ برابر اپنے آپ کو فریب میں مبتلا رکھے گی جو خدا سے اپنی پوری زندگی اسی فرضی محبت کے سہارے تباہ ہے؟"

"اسلم میں یہ بھی تسلیم کر لوں کہ تم دل آرا کی توجہ اپنی طرف منعطف کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے تو بھی پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ تم خالہ اور خالو کو اس پر کیسے آمادہ کر سکو گے۔ جبکہ خالہ اماں اس فکر میں ہیں کہ خورشید کو تمہاری زندگی کا شریک بنا دیا جائے؟"

"یہ مسئلہ ہے تو ٹیڑھا مگر میں اس کا بھی حل سوچ چکا ہوں کہ ان بزرگوں کے انکار کی صورت میں دل آرا کو لے کر میں شاہجہانپور چلا جاؤں گا اور وہاں خاموشی سے اسلامی رسم کی تکمیل ہو جائے گی جو دو زندگیوں کو ایک ساتھ رہنے کی اجازت دے سکتی ہے۔"

اسلم کے ان جملوں کو سن کر قمر چکرا گیا۔ مگر اس نے جلد ہی اپنے اوسان درست کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو میں ماموں جان اور ممانی جان کو کسی قیمت پر بھی اس کے لئے تیار نہیں ہونے دوں گا۔"

"قمر تم بھول رہے ہو ان کی خفگی سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا خدا کا شکر ہے کہ میری پریکٹس کافی کامیاب ہے اور میں اپنے ماں باپ کا محتاج نہیں ہوں۔ رہا یہ کہ ماں باپ ہمیشہ کے لئے چھوٹ جائیں گے یہ بھی ناممکن ہے کہ ماں باپ پھر ماں باپ ہوتے ہیں ایک دو سال گذرنے کے بعد ان کا خون ضرور جوش مارے گا۔ اور نتیجے میں وہ نہ صرف مجھے ہی معاف کریں گے بلکہ بہو سے بھی محبت کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کیونکہ بعض وہ نوجوان جو اہل یورپ اور غیر مذاہب کی عورتوں سے شادی کر لیتے ہیں ان کے ماں باپ بھی تو یہ سوچکر آخر ان کو معاف کر دیتے ہیں کہ

اب جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا

پھر دل آرا تو میرے والد کی بھانجی بھی ہے کیا ان کو ترس نہیں آئے گا اپنی بہن کی لڑکی پر بلکہ وہ تو یہ کہہ کر اپنے دل کو سمجھا لیں گے کہ اسلم نے غلطی ہی کی مگر کوئی ایسی غلطی نہیں کی جو اسے معاف نہ کیا جائے اگر کہیں یہ وہ کسی بد چلن یا بازاری عورت سے نکاح کر لیتا تو ہم اس کا کیا بگاڑ لیتے۔"

"میں اسے بھی مانے لیتا ہوں لیکن دل آرا کے ماں باپ تو اس حرکت کے بعد اس کا منہ ہرگز ہرگز نہیں دیکھیں گے اب کی قمر نے اپنی دانست میں اسلم کی دکھتی رگ کو چھیڑ دیا تھا مگر اسلم نے اسی سنجیدگی سے کہا۔

"نہیں یہ بھی ناممکن ہے جب میرے والد اور والدہ کی خفگی دور ہو جائے گی تو وہ خود ہم دونوں کو یہاں لا کر پھوپی اور پھوپا جان کے قدموں پر گرا کر کہیں گے ——— "معاف کر دیجئے بچے ہیں اور غلطی بچوں ہی سے تو ہوتی ہے" اور پھر اماں جلدی سے کہیں گی بہن اسلم کو بچپن سے تم نے پالا ہے اس کی اصلی ماں تو تم ہی ہو تمہارا دل چاہے تو اپنے لڑکے کا قصور معاف کر دو۔ رہی دل آرا اب وہ میری بیٹی ہے اس لئے میری خاطر اس کا یہ گناہ بخش دو تم کو صدقہ اپنے حبیب کا!! اور ابا فوراً اماں کی بات کاٹتے ہوئے پھوپا جان سے مخاطب ہوں گے۔ بھائی صاحب اگر آپ ان دونوں سے ناخوش ہیں تو ان کی اس غلطی کی میں معافی مانگتا ہوں خدا رسول کا واسطہ دیتا ہوں کہ آپ انکار نہ کیجئے۔ دیکھئے میری اس سفید داڑھی کا خیال کیجئے ———

اور ادھر ہم دونوں مشترکہ طور پر ان کے قدموں میں سر رکھے پڑے ہوں گے۔ ——— ادھر پھوپا جان اباکی سفید داڑھی کے خیال سے مرتعش آواز میں یہ کہہ کر ہم دونوں کو اٹھا کر گلے سے لگا لیں گے کہ

"میں تو قسم کھا چکا تھا کہ تم دونوں کی عمر بھر صورت نہیں دیکھوں گا مگر بھائی میاں بڑے ہو کر صرف تم دونوں کی خاطر بلا وجہ مجھ سے معافی مانگ رہے ہیں اب ان کا حکم میں نہیں ٹال سکتا ورنہ میری

گی کبھی اجازت نہ ہوتی کہ تم دونوں میرے جنازے پر آؤ۔"

—— اور پھر پھوپی جان ہم دونوں کو اپنے سے لپٹا کر فرمائیں گی۔
"اے تم مجھ سے تو کہتے کیا میں انکار کر دیتی بیٹا۔ تو بس اسی لئے خفا تھی کہ جو کام ہمارے کرنے کا تھا وہ تم دونوں نے ہم لوگوں کی موجودگی میں خود ہی کر لیا۔ تم لوگوں کو کیا معلوم کہ ان دو سالوں میں کوئی دن ایسا نہیں گیا جو میں تنہائی میں تم دونوں کے لئے نہ روئی ہوں اور خورشید و حسن آرا کی شادی میں تو غم کے مارے میری ہچکیاں بندھ گئیں مگر ان کے خوف سے کبھی زبان پر ایک حرف نہیں لائی خود خورشید اور حسن آرا ہمیشہ تمہارے لئے کڑھتی رہیں۔ مگر ابا کے ڈر کے مارے بیچاریاں خط تک لکھنے کی ہمت نہ کر سکیں۔"

یکایک اسلم اس طرح مسکرانے لگا جیسے واقعی یہ سب کچھ آئندہ ہوگا اور قمر کی آنکھوں کے سامنے اسلم کے یہ الفاظ سینما کی متحرک تصاویر کی طرح بکھرنے لگے۔

"کچھ بھی اور کچھ" اسلم نے بدستور مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

"خدا تمہاری مدد کرے" قمر نے روندھی ہوئی آواز میں پست ہو کر جواب دیا۔

"آمین!" اسلم نے اس تیقن کے ساتھ کہا جیسے کہ اس کا یہ پروگرام کبھی ناکامی سے دوچار نہیں ہو سکتا مگر قمر کو لفظ آمین اپنے دل میں تیر کی طرح پیوست ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

———— .. ————

قمر اسلم کے عزائم سن کر کانپ گیا اسے یقین ہو گیا تھا کہ اسلم جو کچھ کہہ رہا ہے وہ زبانی ہی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی اسے کر کے دکھا سکتا ہے اور ایسی صورت میں اسے مایوسی جھانکتی نظر آئی۔ مستقبل کا اداس چہرہ اس کی نظروں میں پھرنے لگا۔ کچھ دیر کے توقف کے بعد اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ دل آرا کو کم از کم اپنے دلی جذبات سے آگاہ کر دے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے تاکہ اسے یہ معلوم ہو سکے کہ دل آرا اب دل میں اس کے لئے کیا جذبات رکھتی ہے۔ کیا اس کا معصوم دل اس کی محبت کی معصوم کرن سے منور ہے یا وہ ابھی تک اس احساس سے قطعی بیگانہ ہے کیونکہ دل آرا کی

سیماب صفتی کی وجہ سے وہ اس کے متعلق ابھی تک کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکا تھا بعض اوقات تو اسے یہ دھوکا ہونے لگتا تھا کہ دل آرا اس سے والہانہ محبت کرتی ہے مگر گھٹا گھٹ کم ہو کر چند ہی گھنٹے بعد وہ دل آرا کے غیر ارادی افعال سے یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہو جاتا کہ اس کے دل میں اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے اب تک وہ کسی بات سے متاثر ہوئے بغیر اس کی خاموش پرستش کئے جا رہا تھا مگر اب اس کے لئے بات جاننا ضروری ہو گیا تھا ——— اور اسی لئے جب شام کو اسلم تفریح کو جانے لگا تو اس نے درد سر کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں پناہ لے لی ——— ——— بڑی دیر تک وہ سوچتا رہا کہ دل آرا کو کس طرح بلائے مگر خوش قسمتی سے اس وقت کسی کام سے اس کے کمرے کے سامنے سے گذری اور اس نے ہمت کر کے اسے بلا ہی لیا۔ گو دل آرا کو قمر کے آواز دینے پر تعجب ضرور ہوا مگر اس کے باوجود وہ اس کے پاس جانے سے انکار نہ کر سکی۔

قمر نے ادھر ادھر دیکھ کر لرزتے ہوئے ہونٹوں سے اسے مخاطب کیا۔

"دل آرا آج میری زندگی کے اس نازک دور میں داخل ہو گیا ہوں جس کا مجھے کبھی خیال بھی نہ تھا آج دو بھائی دل کے ہاتھوں ایک دوسرے کے حریف بن گئے ہیں۔ اسلم کے پاس روپیہ پیسے کے علاوہ وہ ہمت بھی ہے اس کے پروگرام اس قدر بلند ہیں کہ میں ان کو خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا۔ نہ میرے پاس اس قدر روپیہ ہے کہ میں اس کے مقابلے پر کسی بات کا ارادہ بھی کر سکوں۔ آج کے ساتھ ساتھ آج مجھے اس کا بھی احساس ہو رہا ہے کہ میں فطرتاً بزدل ہوں۔ میں دل کی بات اسلم کی طرح زبان پر نہیں لا سکتا۔ اسلم کو گئے ہوئے ابھی صرف چند گھنٹے گذرے ہیں مگر اس نے مجھے صاف صاف بتا دیا کہ وہ تمہارے حصول کے لئے بے تاب ہے اور میں باوجود کوشش کے آج تک تم سے بھی یہ صاف صاف نہیں کہہ سکا کہ میری زیست کا اصلی مقصد تم ہو۔ یہ تو میں نہیں جانتا کہ اسلم تم سے کیا کہہ گیا ہے مگر یہ اندیشہ ضرور ہے کہ تم اس سے متاثر ہو جاؤ گی ممکن ہے میں نے یہ خیال اپنی بزدلی کی بنا پر قائم کر لیا ہو جس کا نتیجہ آج احساس ہوا ہے ... بات درست ہے اس کے عزائم اسی لئے بلند ہیں کہ وہ اپنی دولت کے بل بوتے پر دنیا کی ہر شے کچھ منوا سکتا ہے اور اسی لئے وہ میرے سامنے آج بار بار اس کا اعادہ کر رہا تھا کہ وہ تمہاری خاطر ساری دنیا سے لڑنے کے لئے آمادہ ہے مگر میں اس معاملہ میں انتہائی کمزور ہوں سوسائٹی سے بغاوت نہیں کر سکتا کیونکہ میں دنیا اور دنیا والوں سے ڈرتا ہوں میرے مفلوج عزائم کسی سہارے کے بغیر پورے نہیں ہو سکتے ——— ہاں یہ ضرور کہتا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے معلوم نہیں وہ کون سا جذبہ ہے جو مجھے یہاں روکے ہوئے ہے میں اپنی پوری کوشش صرف کر دوں گا کہ تمہاری محبت

کے نقوش کو اپنے دل سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دوں کہ مجھے ہر کوشش کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ نقوش اَن مٹ ہیں ان کا مٹانا میرے بس کی بات نہیں ہیں منیرہ قمر کی جگہ ضرور لینا چاہتا ہوں مگر تمہاری مرضی کے علاوہ میری یہ بھی خواہش ہے کہ دنیا والے بھی اس کی مخالفت نہ کریں نہ اماں ابا اور خالو جان کے چہروں پر بھی بشاشت اور طمانیت ہو اس کے علاوہ میں یہ بھی نہیں دیکھ سکتا کہ میرے ماں باپ کے زرد چہروں کی جھریوں میں اضمحلال یا افسردگی کی لکیریں نمایاں ہوں۔ اور یہ کیسے ممکن ہو گا یہ میں خود نہیں جانتا بس تمہارے بغیر میں اپنی زندگی میں ایک خلا سی محسوس کروں گا میں خودکشی وغیرہ کا قائل نہیں مجھے زندگی سے محبت ہے مگر تمہارے بغیر ایک مسلسل خلش کا نام زندگی ہو گا۔ دل میں نہیں سمجھ سکتا کہ زندگی کے ان گنت مصائب کے ہوتے ہوئے میں یہ اذیت کیسے برداشت کر سکوں گا دل آرا مجھے باضابطہ عشق کرنا نہیں آتا نہ میرے پاس ایسے حسین الفاظ ہیں جو میں تم کو ان کے ذریعے سے محبت کا یقین دلا سکوں اگر تم یہ چاہتی ہو کہ میں الفاظ کے ذریعے سے محبت کی خیالی جنت کا نقشہ کھینچ دوں تو میرے امکان سے باہر ہے تم اس سلسلہ میں مجھے بالکل مجبور و معذور سمجھو تو البتہ سلم ایسا کر سکتا ہے۔ — خوش نصیب اسلم! — جس کی محبت کی خاموش چنگاریوں نے چپکے چپکے اثر کرنے کے بجائے بڑی تیزی سے تمہارے دل کی گہرائیوں میں بھڑکنا شروع کر دیا۔

—— دل آرا اب تک بالکل خاموش گم سم کھڑی تھی مگر قمر کے اس جملہ پر وہ چونک گئی اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے بڑے زور سے اس کے چٹکی لے لی ہو اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو قمر کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے اور دل آرا کو محسوس ہوا کہ جیسے یہ جملے اخلاص و صداقت میں سموئے ہوئے ہیں اور آنسوؤں کی تہ چڑھ جانے کے بعد یہ ان کو اس کے حضور میں پیش کیا گیا ہے۔ اسی لئے اچانک اس کی زبان سے نکل گیا۔

آپ رو رہے ہیں؟

”نہیں دل آرا رونے اور آنسو بہانے میں فرق ہے میں صرف آنسو بہا رہا ہوں جو بغیر کسی شور و غل کے بہائے جا سکتے ہیں۔ خواہ تم سامنے ہو یا نہ ہو۔ رونے کے معنی تو یہ ہیں کہ دنیا کو چیخ چیخ کر اپنے راز سے باخبر کیا جائے اور میں —— —— میں ایسا نہیں کر سکتا مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے“

مگر آپ نے —— یہ کیسے سمجھ لیا کہ —— میں —— میں —— اسلم صاحب سے متاثر ہوں اور یہ کہتے کہتے اس کا سارا چہرہ گلنار ہو گیا۔

میری دل آرا! —— قمر نے خوشی کے مارے چیخ کر کہا۔

اچھا تو مجھے یہ بتا دو کہ کیا تم مجھ کو پسند کرتی ہو؟

اور دل آرا نے دبی دبی آواز میں جواب دیا کہ آپ کو میں یقیناً پسند کرتی ہوں کیونکہ —— —— یکایک دل آرا نے کچھ دیر رکنے کے بعد ہکلاتے ہوئے کہا ——

کیونکہ آپ میری عزیز ترین بہن کے ہونے والے شوہر ہیں۔

قمر کے کانوں میں جیسے کسی نے سیسہ پگھلا کر ڈال دیا ہو۔

—— ”مگر میں تم کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ تمہارا یہ خیال غلط ہے میں زندگی کی آخری سانس تک حسن آرا سے شادی نہیں کروں گا کیونکہ میں تم سے والہانہ محبت کرتا ہوں۔ —— میرے لئے حسن آرا کی حیثیت صرف ایک بہن کی سی ہے اور بہن کبھی بیوی نہیں بن سکتی —— اور قمر کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی دل آرا کو حسن آرا کی مرتعش آواز سنائی دی۔

”چھوٹی آپا اماں آپ کو بلا رہی ہیں“

حسن آرا کی آواز میں ارتعاش نہ تھا بلکہ اس کے ہاتھ پیر بھی بری طرح سے کانپ رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ بڑی دیر سے کھڑی ان دونوں کی گفتگو سن رہی تھی —— دل آرا بدحواسی کے عالم میں بغیر کچھ کہے سنے چلی گئی اور حسن آرا تنہا قمر کے پاس رہ گئی چند لمحات کے سکوت کے بعد یکایک حسن آرا نے قمر سے کہا۔

قمر صاحب سنئے —— غور سے سنئے —— میں آپ سے نفرت کرتی ہوں شدید نفرت —— اب اگر آپ چاہیں بھی تو میری زندگی کی آخری سانس تک یہ رشتہ نہیں ہو سکتا اور یہ کہہ کر وہ تیزی سے بھاگ گئی۔

—— قمر حسن آرا کی اس جرأت پر بھونچکا ہو گیا۔

—— اور

اچانک اس کے ذہن میں بچپن کا وہ واقعہ گھوم گیا جب ایک زخمی سانپ نے لاٹھی کھا کر مارنے والے پر اس تیزی سے حملہ کیا تھا کہ باوجود کوشش کے وہ اس کی زد سے نہ بچ سکا اور چند ہی منٹ بعد سانپ اور اس کا مارنے والا ایک ساتھ ٹھنڈے ہو گئے۔ اس وقت اسے حسن آرا بھی اسی زخمی سانپ کی طرح نظر آ رہی تھی جس کا دل قمر کے جملوں سے اسی طرح ٹوٹ گیا تھا جیسے سانپ کی کمر لاٹھی کی ضرب سے —— اور وہ گھبرا گیا اس خیال سے کہ اگر کہیں حسن آرا نے اتفاقاً خالہ سے اس کی وہ تمام گفتگو دہرا دی جو اس کے اور دل آرا کے مابین ہوئی تھی تو اس کا کیا حشر ہو گا۔ بھیانک بھیانک مناظر اس کے اردگرد منڈلانے لگے اس روح فرسا تصور ہی سے اسے وحشت

ہونے لگی ــــــــ حسن آرا ایک شریر چھوٹی سی ناعاقبت اندیش لڑکی جس کو اس نے کبھی اہمیت نہیں دی، چند ہی لمحات میں ایک ایسی عظیم الشان، شخصیت سے بدل گئی جس کے چند جملوں سے اس کی زندگی کا نظام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے درہم برہم ہو سکتا تھا ــــــــ اور ایک اس کا دل چاہا کہ وہ حسن آرا سے معافی مانگ لے، اس کی خوشامد کرے اسے یقین دلانے کی کوشش کرے کہ اس کا مقصد ہرگز ہرگز یہ نہیں تھا کہ اس کی دل آزاری ہو۔ مگر اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ گویا وہ اپنے کہے ہوئے الفاظ پر شرمندہ ہے اور معذرت کے بعد ان الفاظ کا اثر تو زائل ہو جائے گا مگر پھر وہ ہی حسن آرا سے شادی ــــــــ اور وہ ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ اسلم اور حسن آرا کے قہقہوں نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ان دونوں کو اس بے باکی سے قہقہے لگاتے دیکھ کر وہ بری طرح سے گھبرا گیا اور اسے یقین ہو گیا کہ حسن آرا نے اسلم سے تمام واقعہ دوہرا دیا ہے اور شاید اسلم اس کی حماقت پر طنزیہ قہقہے لگا رہا ہے۔

(باقی آئندہ)

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔

حسنِ تخیل

یوسف ظفر بی اے

طلب کچھ اور ہے لیکن وفا کچھ اور کہتی ہے
بگڑ کر یہ تیری زلفِ دوتا کچھ اور کہتی ہے

اُدھر انکارِ زیرِ لب شکستِ دل پہ آمادہ
اِدھر آنکھوں میں تسلیم و رضا کچھ اور کہتی ہے

اب انجامِ وفا مرگِ تمنا کے سوا کیا ہو
کہ اہلِ دل سے غم کی ابتدا کچھ اور کہتی ہے

تجھے دادِ وفا دیتی ہے دنیا، مجھ کو حیرت ہے
یہی مقصد تو مجھ سے بارہا کچھ اور کہتی ہے

ترا عذرِ جفا برحق مجھے تسلیم کج فہمی
مگر عقلِ رسا اس کے سوا کچھ اور کہتی ہے

ذہنی مریض

منظور احمد ایم۔ اے

دل کے رازوں کو چھپا لے سے تو حاصل نہیں ہوگا کچھ بھی
یہ تو ظاہر ہے کہ اظہار سے انگشت نمائی ہوگی
لیکن اظہار زباں پر تو نہیں ہے موقوف
اور خموشی کوئی سرہنگ بھی نہیں کہ رہیں رازِ درونِ پردہ
یہ ہی رستے ہوئے ناسور جو سینہ میں ہیں مدفون ترے
جب کبھی سر کو اٹھاتے ہیں کچل دیتا ہے
اور سمجھتا ہے کہ حاصل ہوا مقصود تیرا
خود فریبی ہے کہ کچلے گئے، مفتوح ہوئے
اس طرح اور بھی ہوتے ہیں توانا دن رات
تیری یلغار میں قوت ہو، توانائی ہو!
عزم ہو، شوقِ خود آرائی ہو!
کچھ بھی ہو ان کو کچلنا تو نہیں ہے ممکن!
یہ ترے ذہن کو لگ جاتے ہیں دیمک بن کر
تیری خودداری نے جن شوریدہ ارادوں کے گلے گھونٹے تھے
اور سمجھا تھا کہ زنداں میں گھٹ گھٹ کے یہ مرجائیں گے
وہی پیشانی پہ بنتے ہیں کلنک کے ٹیکے
اور یہ احساس کہ "مجرم ہوں" یقیں بنتا ہے
پھر کوئی عزم نہیں، راہ نہیں، دوست نہیں
ناامیدی کی اس وادیٔ تاریک سے بچنے کے لئے
اپنے احساس سے دنیا کو منور کردے

حسین شکایتیں

عزیز احمد

خط میں شہلا نے یہ لکھا ہے کہ یاد آتے ہو — آرزوؤں کے دبے شعلوں کو بھڑکاتے ہو
آنکھ لگتی نہیں اور رات گزر جاتی ہے — نیند بن کر مری آنکھوں میں سما جاتے ہو
رس بھرے ہونٹ ترستے ہیں تکلم کے لئے — کتنے بے رحم ہو کتنا مجھے تڑپاتے ہو
مری اس مست جوانی کے بھرے ساغر کو — پاس آتے نہیں اور دور سے چھلکاتے ہو
گدگداتی ہوئی چلتی ہے جو یہ سرد ہوا — میری خوابیدہ تمناؤں کو چونکاتے ہو
بھیگی بھیگی یہ فضا اور یہ برسات کی رات — ایسی رت میں مجھے یاد آتے ہو تڑپاتے ہو
ظلم کرنا ہی ہے مجھ پر تو سدا ظلم سہی — کیوں تصور کے سہارے مجھے تڑپاتے ہو
ڈھونڈتی ہیں تمھیں ہر سمت نگاہیں مایوس — دید کی پیاس بجھاتے نہیں ترساتے ہو
سرمدی کیف سا پاتی ہوں سکوں راتوں میں — میری رگ رگ میں مری روح میں بس جاتے ہو
نوجوانی کے امنگوں کی کلی کھلتی ہے — داستاں گزرے ہوئے عہد کی دہراتے ہو
رات کو پہروں کھلی رہتی ہیں باہیں میری — آ کے آغوشِ تصور ہی میں چھپ جاتے ہو
کیف میں ڈوبی مسرت کی بہاریں بن کر — میری ہستی کے خیابانوں پہ چھا جاتے ہو

مجھ کو بلواتے نہیں اور خود آتے بھی نہیں
ناخدا بن کے مجھے راہ میں بھٹکاتے ہو

یہ اگر سچ ہے تو ہے ناز مجھے جینے پر — آج ساقی مجھے مجبور نہ کر پینے پر

منیر انصاری بی۔ اے

شیر افگن کا قتل

یوں تو ہندوستان کی ساری تاریخ مبالغے اور صریح دروغ گوئی سے پُر ہے لیکن اس مبالغے اور صریح دروغ گوئی سے جو کام مغل شہنشاہوں کے خلاف لیا گیا ہے وہ واقعی قابلِ داد ہے۔ بانیٔ مغلیہ خاندان سے لیکر زوالِ حکومت تک کوئی بادشاہ ایسا نہیں جس کے خلاف مورخین کرام نے اپنی قابلِ فخر علمیت کا مظاہرہ نہ کیا ہو۔ ہندو مورخین تو خیر قابلِ معافی ہیں لیکن ان مسلمان حضرات کا کوئی کیا کرے جنہوں نے محض بغض و حسد کی بنا پر غلط بیانی کی عمارت کھڑی کر کے بے گناہ بادشاہوں کو بدنام کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ مغلیہ دور کے گنے چنے مورخوں نے جو کچھ لکھدیا اس کو کسی بھلے مانس نے جانچنے کی تکلیف ہی گوارا نہ کی۔ بابر اور ہمایوں کو تو خیر میدان جنگ ہی سے فرصت نہ ملی کہ ان گراں علماءِ تاریخ کے ہتھے چڑھ جاتے لیکن اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، اور اورنگ زیب کو ان حضرات نے خوب خوب نوازا ہے ان میں سے ہر ایک پر ایک نہ ایک الزام ایسا جڑ دیا جس سے رہتی دنیا تک طلبارِ تاریخ کو ایک دوسرے سے دست و گریباں ہی رہنا پڑے گا۔ اس باب میں آج ہمکو ہندوستان کے اس مشہور و معروف شہنشاہ کی زندگی کی ورق گردانی کرنا ہے جس کو جہانگیر کہتے ہیں۔ جہانگیر کے عدل و انصاف کو لوگ اگر یاد رکھتے ہیں تو صرف نور جہاں بیگم کے ذریعہ سے اور ملکہ کی شادی کے متعلق جو لطیفہ مشہور ہے وہ تاریخ اور رنگیا ذاتی تاریخ ہو کر رہ گیا ہے حالانکہ تاریخ سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں۔

نور جہاں کی پیدائش اوائل زندگی۔ اور شہنشاہ جہانگیر سے شادی کی داستان بھی ایک قصہ ۔ ۔ ۔ من گھڑت اور فرضی قصہ تاریخ میں شامل کر دیا گیا ہے۔ داؤ (DOW) اور دیگر انگریز مورخ مزے لے لے کر اس قصے کو یوں بیان کرتے ہیں کہ "خواجہ ایاث بیگ (غیاث بیگ) غربت اور افلاس سے تنگ آ کر دیگر تاتاریوں کی طرح مع اپنی حاملہ بیوی کے ہندوستان کی طرف روانہ ہوا تھوڑی بہت جو کچھ پونجی لے چلا تھا راستے میں ختم ہو گئی اور پھر فاقوں اور فاقوں سے بچتے بچاتے جب ادات تک نوبت پہنچی۔ مسلسل تین دن کی فاقہ کش حاملہ خاتون کے ایک بچی پیدا ہوئی۔ ماں باپ چند گھنٹے تک تو راہ گیر قافلوں کی امداد کے منتظر رہے لیکن پھر رات اور جنگلی درندوں کے خوف سے چلنے کا ارادہ کر لیا۔ مامتا اور وقت دونوں اس مصیبت کی ماری ماں کو اپنی اپنی طرف بہت دیر تک کھینچتے رہے آخر بڑے وقت کا پلہ بھاری رہا اور مجبور ماں نے بچی کو خس و خاشاک میں چھپا کر جنگل بیابان میں ایک درخت کے نیچے رکھ کر سفر کا عزم کیا کچھ ہی دور گئے ہونگے کہ مامتا کی ماری ماں سے نہ رہا گیا اور وہ اپنے مریل گھوڑے سے کود کر "میری بچی، میری بچی" چلانے لگی۔ باپ کو مجبوراً لوٹنا پڑا۔ اسی درخت کے نیچے پہنچا تو دیکھا کہ ایک بڑا سیاہ سانپ بچی کے گرد حلقہ کئے اس کی حفاظت کر رہا ہے اس کو اٹھا کے لایا اور ماں کے حوالے کر دیا۔ یہ مصیبت زدہ قافلہ پہاڑوں منزل طے کرتا ہوا افتاں و خیزاں لاہور پہنچ گیا۔ جہاں اتفاق سے مرزا غیاث کو اس کا ایک پرانا دوست مل گیا جس نے اس کو اکبر کے روبرو پیش کیا اس کو شاہی محل میں ملازمت مل گئی اور غیاث کچھ ہی دن میں ترقی کرتا کرتا محل کا داروغہ بن گیا نوخیز بچی جس کا نام مہرالنساء رکھا گیا تھا شاہی محل میں پلتی رہی اور اٹھتی عمر کے ساتھ حسنِ صورت اور حسنِ سیرت دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا ہوا بامِ عروج پر پہنچ گیا یہاں تک کہ چودہ سال کی عمر میں یہ چودھویں کا چاند موسیقی، تصویر کشی، شاعری اور مزاح وغیرہ میں ماہر ہو کر شہزادہ سلیم پر ڈورے ڈالنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن اکبر نے اس کی شادی زبردستی علی قلی خان سے کر دی۔ شہزادہ سلیم نے عہد کیا کہ وہ تخت نشین ہو کر کسی نہ کسی طرح اس حسینہ کو حاصل کرے گا اور بادشاہ ہو کر عہد کے پکے جہانگیر نے ہر ممکن کوشش کی جس سے مہرالنساء حاصل ہو سکے اس کوشش میں اس نے علی قلی کو جنگلی ہاتھیوں اور بھوکے شیروں کے منہ سے تنہا لڑوایا اور شیر افگن نے ان خونخوار درندوں کے ٹکڑے ٹکڑے

کر دیئے۔ بہت سے جلاد مقرر کئے گئے لیکن کوئی اس کے ہاتھ سے بچ کر کامیاب نہ ہو سکا لیکن موت کسی کا بس نہیں شیر افگن آخر بنگال کے گورنر قطب الدین کے ہاتھوں قتل کرادیا گیا اور جہانگیر کی تمنا بر آئی۔ ڈاؤ۔ جلد سوئم صفحہ ۱۹ ۳۳۴ تمنا دلکش اور سہولا افسانہ لکھا ہے۔ ڈاؤ صاحب بہادر نے جو ایک تاریخ داں ہونیکا دعوٰی کرتے ہیں لیکن افسوس کہ اس قصے کو حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

اگر ہم مہرالنساء کی پیدائش بچپن اور جوانی اور پھر اس کی آئندہ زندگی کا تاریخی مطالعہ کریں تو یہ تمام افسانہ محض بکواس نظر آتی ہے۔ واقعات در اصل یوں ہیں کہ نورجہاں کا دادا خواجہ محمد شریف تاتار سلطان بیگلار بیگی والی خراسان کا وزیر تھا سلطان کی وفات کے بعد خواجہ شریف سلطان کے لڑکے قزاق خان کا بھی وزیر رہا اور اس کی وفات کے بعد شاہ طہماسپ نے اس کو اور بڑی جگہ دی اور یزد کا وزیر بنا کر بھیج دیا۔ ۱۵۷۷ء میں خواجہ شریف مر گیا اور پس ماندگان کو بقول شخصیکہ زندہ درگور کر گیا حالات زمانہ اور دیگر اقارب کی زیادتیوں سے تنگ آکر اس کا لڑکا مرزا غیاث الدین محمد (جو عام طور سے غیاث بیگ کے نام سے مشہور ہے) اپنے دو لڑکوں محمد شریف اور ابوالحسن ایک لڑکی اور حاملہ بیوی کو لیکر ہندوستان کی طرف روانہ ہوا۔ یہ لوگ ایک بڑے سوداگر ملک مسعود کے قافلے میں حفاظت سے سفر کر رہے تھے۔ ایران سے ہندوستان کا راستہ اتنا خطرناک تھا کہ اتنے بڑے قافلے تک نے اس مختصر خاندان کی جان و مال کی کامل حفاظت کا ذمہ نہ لیا تھا اس خطرناک راستے میں غیاث بیگ کے تمام مویشی مر گئے۔ قندھار کے مقام پر عالم بے بسی کے ایک بچی پیدا ہوئی ان کی زبوں حالی دیکھ کر نیک دل ملک مسعود نے ان کی ہر وہ امداد کی جو اس کے قبضۂ قدرت میں تھی۔ ہندوستان پہنچکر ملک مسعود نے اپنے [illegible] کو ہندوستان کے جلیل القدر شہنشاہ اکبر کے روبرو پیش کیا (اقبالنامہ صفحہ ۴ ۵ ۵۵ اور ۴۰۳، ۴۰۴)، شہنشاہ نے میرزا غیاث کی قابلیت سے متاثر ہو کر اس کو اپنی ملازمت میں رکھ لیا وہ ایک واقعی قابل آدمی تھا اپنی قابلیت کی بدولت ترقی کرتے کرتے ۱۵۹۵ء تک وہ تین سو منصب دار اور کابل کا دیوان کلی ہو گیا۔ اسی دوران میں مہرالنساء بھی جوان ہو گئی اور سترہ سال کی عمر میں ایک ایرانی علی قلی استاجلو سے اس کی شادی کر دی گئی۔ علی قلی خاں ایران کے شاہ اسمٰعیل ثانی کا سفرچی تھا شاہ کے قتل کے بعد علی قلی ایران سے اپنی جان بچانے کے لئے فرار ہو گیا اور دشت وحشت کی ہوا کھاتا ہوا قندھار کے راستے سے ملتان پہنچا۔ یہاں وہ عبدالرحیم خان خاناں کا ملازم ہو گیا اور اپنی جوانمردی اور [illegible] کی بدولت خان خاناں [illegible] میں ٹھٹھہ کی جنگ کے بعد اس کو ایک منصب [illegible] ۱۵۹۶ء [illegible]

اس کی بڑے بڑے افسروں سے ملاقات کرائی گئی کچھ عرصہ بعد مہرالنساء سے اس کی شادی ہوگئی یعنی ۱۵۹۹ء میں شہنشاہ اکبر نے میواڑ کی مہم پر شہزادہ سلیم کو روانہ کیا اور علی قلی خاں کو شہزادے کے ذاتی عملے میں شامل کر دیا۔ یہاں ذرا سوچئے کہ اگر شہنشاہ نے مہرالنساء کی شادی علی قلی خان سے اس کو صرف سلیم سے بچانے کیلئے کی ہوتی تو وہ مہرالنساء کے شوہر اور سلیم کے رقیب کو سلیم کے ساتھ کیوں کر دیتے اور خصوصاً جبکہ شہزادہ عشق و حسد کی آگ میں علی قلی کو چشم زدن میں ختم کر سکتا تھا، اس مہم میں علی قلی نے وہ بہادری دکھائی کہ ہر شخص عش عش کر اٹھا۔ اسی سفر میں اس نے ایک چیتے کو ہلاک کیا جس کے صلے میں صاحب عالم نے خوش ہو کر بہادر علی قلی کو شیر افگن کا خطاب عطا کیا۔ شہزادہ سلیم نے جب بغاوت کی تو علی قلی ان کے ساتھ تھا لیکن پھر اکبر سے مل گیا۔ تخت نشین ہونے پر شہزادہ نے علی قلی کی یہ خطا معاف کر دی اور جاگیر وغیرہ دے کر اس کو بردوان کا حاکم بنا کر بھیج دیا۔

اس زمانے میں بنگال بغاوتوں اور سیاسی شورشوں کا گھر بنا ہوا تھا تمام پٹھان شہزادے وہیں پر جمع ہو کر مغلوں کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کر رہے تھے اور علی قلی بھی ایک دفعہ بغاوت کر چکا تھا چنانچہ بنگال کے گورنر قطب الدین خاں نے اس پر بھی شک کی نگاہیں ڈالیں اور شہنشاہ کو اپنے خیالات سے آگاہ کیا دارالسلطنت سے حکم صادر کیا گیا کہ علی قلی کو دربار میں حاضر کیا جائے اور اگر وہ کسی قسم کی حکم عدولی کرے تو مناسب سزا دی جائے مارچ ۱۶۰۷ء میں قطب الدین خاں بردوان کی طرف روانہ ہوا اور علی قلی کو دغا سے گرفتار کرنے کے لئے ملنے کے لئے بلایا۔ ۳۰ مارچ کو شیر افگن صرف دو آدمیوں کو ہمراہ لیکر گورنر سے ملاقات کے لئے آیا خیمہ میں داخل ہوتا ہی تھا کہ گورنر نے شیر افگن کی گرفتاری کا حکم دے دیا اور اس کو چاروں طرف سے نرغے میں لے لیا گیا۔ علی قلی خاں یہ توہین برداشت نہ کر سکا اس کا خون کھولنے لگا وہ قطب الدین کی نیت بھانپ گیا اور لال پیلا ہو کر کہنے لگا "یہ کیا حرکت ہے تیری" قطب الدین خاں بات سمجھانے کے لئے آگے بڑھا کہ علی قلی نے تلوار نکال کر اس کا پیٹ چاک کر دیا گورنر نے نکلی ہوئی انتڑیوں کو ہاتھ میں لے کر قاتل کے قتل کا حکم دے دیا لیکن حکم پانے سے قبل سپاہی اپنا کام کر چکے تھے گورنر کے ایک ملازم امبا خاں کشمیری نے علی قلی خاں کے سر پر تلوار کا ایک بھرپور ہاتھ مارا مرتے ہوئے علی قلی نے تلوار کا جواب تلوار سے دیا اور امبا خاں اور علی قلی دونوں ڈھیر ہو گئے۔ سپاہیوں نے علی قلی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور قطب الدین بھی بارہ گھنٹے سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا (مفتاح التواریخ صفحہ ۲۱۴)

شہنشاہ کو جب [illegible] زیادہ [illegible] بھائی اور ایک [illegible]

تھا شیر افگن کی اس حرکت کو اس نے قابل لعنت قرار دیا (جہانگیر صفحہ ۱۰۴۵۔ اقبال نامہ صفحہ ۵۵)۔

مہر النساء اس کی بیٹی لاڈلی بیگم کو دربار میں پہونچا دیا گیا اور وہ سلطان سلیمہ بیگم کے محل میں رہنے لگیں۔ مارچ ۱۶۱۱ء میں جہانگیر نے مہر النساء کو پہلی بار مینا بازار میں دیکھا، ملاحظہ ہو انہوں نے ابتک ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہ تھا ہو یا لوگ دو کبوتروں کے کہے بعد دیگرے اڑا دینے کی کہانی کس مزے سے بیان کرتے ہیں، اور نظریں چار ہونے پر عاشق ہو گیا اور مئی کے اختتام پر ان کی شادی ہو گئی۔ (اقبال نامہ صفحہ ۵۶۔ معاصر جہانگیری۔ خدا بخش صفحہ ۷۶)

حالات در اصل یہاں ہیں اب ہم یہ ثابت کریں گے کہ یہ صحیح کس طرح نہیں۔

نام نہاد تاریخ کا وہ تمام حصہ جس میں جہانگیر کا اکبر کی حیات ہی میں مہر النساء پر عاشق ہو جانا اور شہنشاہ کا شہزادے کی تمناؤں کا خون کرکے مرزا غیاث کو مہر النساء کی علی قلی سے شادی کرنے کا حکم دینا۔ پھر مایوس عاشق کا عہد کرنا کہ وہ تخت نشین ہونے پر سب سے پہلا کام جو کریگا وہ کسی نہ کسی طرح مہر النساء کا حاصل کرنا ہوگا۔ تخت نشین ہو کر مان سنگھ کی جگہ قطب الدین خاں کو بنگال روانہ کرنا اور صرف اس لئے گورنر بنا دینا کہ وہ علی قلی کا قصہ پاک کرکے مہر النساء کو شہنشاہ کے پہلو میں لا بٹھائے اور اس عزم کے لئے علی قلی کا دفعتاً قتل کرا دینا ایک گپ سے زیادہ نہیں جو تاریخ سے کوسوں دور ہے کوئی مستند مورخ اس مستند گپ کو اس سے زیادہ سمجھنے کے لئے تیار نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ جہانگیر خود یہ حرکت کرنے کے بعد اپنی تزک میں اس کا ذکر نہ کرتے لیکن اگر ان کا ہاتھ اس واقعہ میں ہوتا تو اس تمام حادثہ کو ہی کیوں حذف نہ کر جاتے لیکن شہنشاہ نے علی قلی کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے اس کی شادی کا بھی ذکر کیا ہے۔

معتمد خاں اپنی تاریخ شاہ جہاں کے زمانے میں مکمل کی کامنا حسینی نے شاہ جہاں کے اثر سے اپنی کتاب لکھی اور یہ دونوں نور جہاں کے خلاف تھے پھر بھی انہوں نے اس گپ کا کہیں ذکر تک نہیں کیا۔ عبد الحمید لاہوری اور دیگر مورخین نے نور جہاں پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن کہیں یہ نہیں کہا اس نے اپنے شوہر کے قاتل سے شادی کر لی۔ ممکن ہے عذر پیش کیا جائے کہ صاحب یہ لوگ اراکین دربار ہوتے ہوئے کس طرح شہنشاہ کے خلاف بولتے لیکن ان ولایتی سیاحوں اور مورخوں کی بابت آپ کا کیا راستہ ہے جو ہر وقت اس رائی کے دانے کی تلاش میں رہتے تھے جس کا پہاڑ بنا کر کے اولوالعزم ہستیوں پر پھینکا جا سکے۔ مسلمان حکمرانوں کو دنیا کی نظروں میں گرانا وہ ثواب سمجھتے تھے وہ شہزادہ سلیم اور انارکلی، ممتاز محل کے مفروضہ تعلقات پر حاشیہ آرائی کر سکتے ہیں نور جہاں اور اس کے سوتیلے بیٹے شاہ جہاں کے تعلقات پر صفحے کالے کر سکتے ہیں لیکن یہ کہیں نہیں کہتے کہ جہانگیر نے نور جہاں کے شوہر کو قتل کرکے اس سے شادی کر لی کیوں ؟ ہاکنس ترکی زبان جانتا تھا وہ شیر افگن کی موت کے کچھ ہی عرصہ بعد مغل دربار میں حاضر ہوا منصب پایا اور سارے تعلقات بھی تھے سب کچھ سنا بھی ہوگا لیکن اس باب میں وہ بھی خاموش ہے۔ سر طامس رو اور ایڈورڈ ٹیری اس زمانے میں دربار میں موجود تھے جبکہ نور جہاں طاقت کے عروج پر تھیں اور بچے بچے کی زبان پہ ان کا ذکر تھا کیا یہ لوگ بھی کچھ نہ سنتے ! ولیم فنچ ایک نکتہ چیں تاریخ داں بھی اس زمانے میں موجود تھا اور پیٹر وڈیلا ویلی بھی اگرچہ مغربی ساحل پر سفر کر رہا تھا لیکن اس نے بھی اس گپ کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ حالانکہ دربار اور شاہی محل کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ آخر کیوں ؟

ناقابل یقین ہے یہ خوش فہمی کہ انہوں نے اس واقعہ کو نہ سنا ہوگا یا جہانگیر نے لوگوں کی زبان کو قفل لگا دیا ہو تھا اس قسم کے واقعات چھپے نہیں رہ سکتے اور پھر ایسے واقعات جن سے شہنشاہ کی اپنی ذات کا تعلق ہو۔ جہانگیر کے زمانۂ حکومت میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہلکاروں نے بے شمار خطوط اپنے عزیزوں اقارب اور دوست احباب کو انگلستان لکھے۔ ان ذاتی خطوط میں ہندوستان کی سیاسی حالت اور دیگر واقعات کا ذکر موجود ہے لیکن ان میں سے کسی میں بھی اس واقعہ کا تذکرہ نہیں ان خطوط میں خسرو کی موت، شاہ جہاں کی بغاوت، مہابت خاں کی شورش تک بیان کی گئی ہے لیکن شیر افگن کا قاتل جہانگیر کہیں نہیں کہا گیا۔ سر طامس ہربرٹ جہانگیر کے کچھ ہی بعد ہندوستان آیا اور پیٹر منڈی کچھ سال بعد وارد ہوا ان لوگوں نے جہانگیر اور نور جہاں پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن کہیں نہیں کہا کہ شیر افگن کو جہانگیر نے قتل کرا دیا اس کے بعد برنیر ہندوستان آیا۔ یہاں کے معمولی حالات سے لے کر اس نے شاہ جہاں، جہاں آرا، روشن آرا اور دیگر لوگوں تک کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے لیکن یہ کہیں نہیں کہا کہ مہر النساء نے سلیم پر ڈورے ڈالے اور جہانگیر نے نور جہاں کے شوہر کو قتل کرا دیا۔

درحقیقت ایسا کوئی بھی مستند مورخ نہیں جو اس جھوٹ کو سچ کہنے کے لئے تیار ہو حالات خود بخود ایسی دلائل پیش کر رہے ہیں جن سے اس کی تردید ہو جاتی ہے آخر کیا وجہ تھی جس سے اکبر اپنے بیٹے اور مہر النساء کے درمیان حائل ہو جاتے۔ مہر النساء ایران کے ایک بہت اچھے خاندان سے تھی اس کا باپ دربار میں بہت ممتاز عہدے پر فائز تھا اور مغل شہنشاہ شادیوں کے معاملہ میں اتنے تنگ دل بھی نہیں تھے جو اکبر اس شادی میں روڑا اٹکاتے پھر اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اکبر نے یہ شادی نہیں ہونے دی تو نتیجہ یہ کہ وہ جانتے ہوں گے غیاث بیگ

کو سلیم کے حوالے کیوں کر دیتے جبکہ وہ ہم مپواٹر پر روانہ ہونے تھے پھر سلیم اپنے رقیب کو ہر گز نہ اتنا نہ بڑھانے دیتا کہ انہوں نے بڑھایا، خطاب دیا جاگیر دی۔ عہدہ دیا اور پھر حاکم بردوان تک بنا دیا۔ اگر جہانگیر واقعی نور جہاں کو حاصل کرنا چاہتے تو ان کے لئے کیا مشکل تھا کیونکہ ان کے تلوے پر ہزاروں مہرالنسائیں پیش کی جا سکتی تھیں۔ اتنے قبیح فعل کے مرتکب ہونے کی ان کو کیا ضرورت پیش آ جاتی پھر نور جہاں خود ایک اتنی بلند خیال خاتون تھیں کہ وہ یہ جانتے ہوئے کہ جہانگیر نے ان کے شوہر کو قتل کرایا ہے ہرگز اس کی بیگم ہونا قبول نہ کرتیں

کہا جاتا ہے کہ قطب الدین کو بنگال کا گورنر بھی اس لئے بنایا گیا تھا کہ مہرالنسا کو حاصل کرنا آسان ہو جائے یہ قطعی غلط اور بے بنیاد خیال ہے راجہ مان سنگھ اور شہنشاہ میں کافی کشیدگی ہو گئی تھی اگرچہ اکبر کے انتقال پر ظاہرا طور سے وہ مل گئے تھے لیکن دلوں میں غبار ضرور تھا جہانگیر صرف اس موقع کی تلاش میں تھے جبکہ مان سنگھ کو علیحدہ کیا جا سکے اور وہ موقع ان کو خسرو کی بغاوت کے بعد مل گیا۔ اب ظاہر ہے کہ اس کی جگہ کوئی ایسا آدمی مامور کیا جاتا جو شہنشاہ کی مرضی کے مطابق ہوتا چنانچہ قطب الدین کو بھیجا گیا ہاں شیر افگن پر بغاوت کا شبہ زیادتی کہا جا سکتا ہے لیکن اگر ہم حالات اور وقت کا بنظر غائر مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ بنگال اس وقت سب سے زیادہ خطرناک صوبہ تھا عثمان افغان بغاوت کر چکا تھا اور دوسری اور زیادہ خطرناک بغاوت کی تیاری میں مصروف تھا مفسدین پٹھان شہزادے بھی سر اٹھا رہے تھے ان حالات میں علی قلی بیگ جو ایک دفعہ سلیم کو دغا دے چکا تھا شبہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے قطب الدین کا قتل واقعی ایک دردناک سانحہ ہے لیکن اس کا ذمہ دار وہ خود بھی ہے اس نے یکایک شیر افگن کو گرفتار کرنے کا حکم دے دیا جس سے وہ بپھر گیا اور طیش میں ایک کامیاب وار سے گورنر کا خاتمہ کر دیا۔ نور جہاں کو شوہر کی وفات کے بعد اگر پھر دربار ہی میں آنا تھا اور کہاں جاتی وہاں اس کے باپ بھائی اور دیگر عزیز اقارب ملازم تھے پھر وہاں آنکھوں اتنی مشکوک نگاہوں سے دیکھا جائے؟

اب سوال باقی یہ ہے کہ آخر یہ داستان بنی کیونکر۔

اس واقعہ کو نمک مرچ لگا کر بیان کیا گیا تقریباً ایک صدی کے بعد جہانگیر نے نور جہاں سے شادی کی تھی نور جہاں کا شوہر قتل ہوا تھا اور قتل کے کچھ ہی بعد شادی ہوئی تھی دیکھئے اس تمام داستان کو زیادہ دلچسپ بنانے کے لئے وہ تمام واقعات پیدا کئے گئے جس کی رو سے بتایا گیا کہ سلیم نے اپنے باپ ہی کی زندگی میں مہرالنسا سے عشق شروع کر دیا تھا محمد صادق تبریزی نے جو کچھ کہہ دیا اس پر بغیر سوچے سمجھے تاریخ دانی [illegible] شہرت کر دی ان ہی حضرات کی، اختراع ہے کہ سلیم اور مہرالنسا ساتھ ساتھ کھیلتے تھے ایک دفعہ سلیم نے مہرالنسا کو اپنے آغوش میں لے لیا وہ بچی تو تھی ہی اس محبت کو نہ سمجھ سکی اور محل کی دوسری خواتین سے ذکر کر دیا بات اکبر تک پہونچی اور وہ ناراض ہو گئے پھر جہانگیر نے قطب الدین کی معرفت مہرالنسا کو حاصل کرنا چاہا تو شیر افگن کو معلوم ہو گیا اس نے استعفا دے دیا اور اپنی جاگیر پر چلا گیا وغیرہ وغیرہ۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ جدت طرازی بھی کی جب شیر افگن اور قطب الدین میں ہاتھا پائی ہو رہی اور شیر افگن مرنے والا تھا تو بیچ بچا کر وہ اپنے گھر تک پہونچ گیا تا کہ اپنی شریک حیات کو قتل کر کے اس کی ناموس بچائے تو اس کی ماں نے کہا کہ اس نے خودکشی کر لی ہے یہ سن کر اس کا دم نکل گیا (خلاصۃ التواریخ دہلی ایڈیشن صفحہ ۲۴۴) یہ خبر چار دانگ عالم میں پھیل گئی لیکن سترھویں صدی کے پہلے نصف تک کسی تاریخ نے نہیں لکھا مگر اس کے بعد مورخ نے خوب خوب ابھارا اور طرح طرح سے ابھارا۔ اٹھارہویں صدی میں حضرت ڈاؤ اور دیگر مورخین نے اس کو اور زیادہ رونق بخشی (تاریخ پنجاب۔ لطیف صفحہ ۱۵۳-۷) انیسویں صدی میں جا کر الفنسٹن نے خافی خاں کے ہر ہر لفظ کو صحیفہ آسمانی قرار دے کر خود طبع آزمائی فرمائی اور اس کے بعد ہندوستان کی تمام تاریخ نے اسی افسانہ رنگین کا نقش ثبت کر دیا۔

یہ تھے وہ ذرائع جن کی موافقت انہونی بات کا بتنگڑ بن گیا اور ہر شخص نے بلا سوچے سمجھے جہانگیر اور نور جہاں کو بدنام کرنے کی کوشش کی جہانگیر پر شیر افگن کے قتل کا الزام لگایا اور ہر رد باتیں لکھ دی جو تاریخ کے لئے رہتی دنیا تک باعث ننگ و نام رہے گی کاش نئے مورخین کلکتہ کی بلیک ہول کی طرح اس کی پول کھول دیں۔

قادر نیازی

نہ جانے کیوں؟

خورشید جس عالم میں اپنی زندگی گذار رہی تھی، سجاد اُس سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ خورشید جس نے ادبی فضا میں عمر کے بہترین سال گزارے ہوں یکایک غیر ادبی ماحول میں پھینک دئے جانے پر کس طرح اپنی حیات قائم رکھ سکتی تھی۔ وہ خورشید جس کے خوابہائے شیریں بھی اُس کے پاکیزہ مطالعہ کے مرہون منت تھے اور علی الصبح اُس کی بیداری کا باعث "گیتانجلی" کی وہ نظمیں تھیں جو شاید گرودیو ٹیگور نے چاندنی راتوں میں بیٹھکر لکھی ہوں گی۔ رات کے مطالعہ کی وجہ سے آنکھیں سرخ، بال پریشان، چہرہ اترا ہوا — وہ جسم کے ہر ہر عضو میں درد محسوس کرتی حالانکہ جوہی اور چمپا کے پھولوں سے ڈھکا ہوا بستر، گلاب اور کیوڑے سے بسا ہوا غلاف اور معطر تیل میں ڈوبی ہوئی ، شاید اُسکے لئے غیر مؤثر تھیں۔ ہر شب اُس کے لئے تاریکی کے ساتھ شروع ہوتی اور کسی گہری تاریکی ہی میں تمام ہو جاتی اور ہر صبح ہزاروں حادثات کے ساتھ نمودار ہوتی مگر خورشید وہیں تھی جہاں کل نہ جانے کب تک اور کیوں

اُس زمانہ میں میرا تعلق شعبۂ تصنیف و تالیف سے تھا دفتری اوقات بھی کچھ ایسے تھے کہ مجھے خورشید کے ہاں جانے کا اتفاق ہی نہیں ہوتا تھا حالانکہ خورشید نے مجھے بارہا لکھا کہ — "بھیا اپنی منہ بولی بہن کو کم از کم ایک دفعہ ہی دیکھنے کے لئے آجایا کرو۔ اس گاؤں میں آخر میرا کون ہے۔ یوں تو سبھی ہیں مگر پھر بھی خورشید کا کوئی نہیں۔ مانو بھیا جب گاؤں کے گوالے بانسریاں بجاتے ہوئے دُور نکل جاتے ہیں اور کہیں دُور گھاٹ پر گاندہا کی الھڑ اور معصوم لڑکیاں اپنی چھوٹی چھوٹی گاگریں بھر کر بھیگے ہوئے آنچل شانوں پر ڈالتے ہوئے کچے راستوں سے دور نکل جاتی ہیں تو میری آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ جاتی ہیں، اور میں کسی لا متناہی تخیل میں ڈوب جاتی ہوں۔ بھیا خدا کیلئے ایک بار میرے گاؤں آؤ اور اپنی بہن کی اس اجاڑ دنیا کو بھی دیکھ جاؤ جہاں وہ رہتی ہے اور جہاں تم سے رہتا ہے"۔ خورشید کا خط پڑھتے ہی میں آبدیدہ ہوگیا چاہتا تھا کہ دفتر سے پندرہ روز کی چھٹیاں لے لوں اور خورشید کو ایک مرتبہ دیکھ کر ہی آجاؤں — آہ خورشید میری منہ بولی بہن!

وہ سجاد ہی تھا جس نے مجھے خورشید سے متعارف کرایا تھا۔ یہ کوئی پچھلے سالوں کی بات ہے جو آج یکایک میرے ہونٹوں تک آگئی ہے سجاد کی وجہ سے میں نے خورشید کو بھابی کہا۔ مگر خورشید نے یہ رشتہ منظور نہیں کیا۔ میں نے بھی خورشید پر اس چیز کے لئے زور نہیں دیا۔ بس اُسی دن سے وہ مجھے "بھیا" کہنے لگی اور آج تک ہم دونوں قریب ہوگئے ایک بھائی اور بہن کی محبت کے ساتھ ساتھ۔

ہم دونوں تاروں کی چھاؤں میں دُور پہاڑیوں پر نکل جاتے گل و لالہ کی مہکتی ہوئی شاخوں کے نیچے گھنٹوں گذر جاتے۔ خورشید شرارت سے کہتی "بھیا! غالب نے کیا خوب کہا ہے ؎

"سایۂ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے"

پھر وہ فوراً ایک ننھی سی شاخ کو چاندنی میں منعکس کر دیتی۔ اور پھر ایک لطیف و گداز قہقہہ — یہ خوشگوار دن یونہی ختم ہوگئے۔

سجاد نے خورشید پر ہزاروں پابندیاں عاید کر دی تھیں۔ ایک دن اُس نے صاف صاف کہدیا کہ خورشید طرزی کے ہمراہ اس آزادی کے ساتھ نہیں گھوم سکتیں وہ میرا دوست ہے صرف دوست — اور شاید تم اُسے سمجھنے سے قاصر ہو...... خورشید خوب روئی دوسرے روز اُس کی ملازمہ نے مجھے ایک خط لاکر دیا جس میں تحریر تھا "طرزی بھیا آپ یوسف پور چلے جائیں، اور اپنی باقی ماندہ زندگی میں کچھ یہ تصور بھی

نہ کریں کہ کسی یوسف پور میں تمہاری منہ بولی بہن" خورشید بھی رہتی ہے اور میں جب تک بقیہ حیات رہوں گی یہی سمجھوں گی کہ میرا بھیا کریم نگر میں ہے۔ اور اپنی زندگی ہنسی خوشی سے گذار رہا ہے۔ اب یوسف پور کریم نگر سے دس میل دُور نہیں رہا بلکہ ہزاروں میل دُور ہوگیا ہے۔ اب ہم دونوں شاید ہی مل سکیں ۔"

یوسف پور سے واپسی پر میں نے سجاد سے ملنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ قرب و جوار کے دیہاتوں میں کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ میں رات کو کریم نگر آگیا۔ میری واپسی پر خورشید سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ میری بھی آنکھیں نم ہوگئیں اور ایک انتہائی یاس کے عالم میں یوسف پور سے لوٹا۔

میری ساری جائداد کریم نگر میں تھی جو چند گماشتوں کی نگرانی کے سپرد تھی مجھے جب بھی جتنی رقم درکار ہوتی میں کریم نگر لکھ کر منگا لیتا۔ جب میری عمر پندرہ برس کی تھی میرے والد کا انتقال ہوگیا اور ایک برس کے بعد والدہ کا بھی۔ اب صرف میرے چچا تھے جنہوں نے مجھے تعلیم دلوائی اور بعد میں میری ساری جائداد میرے سپرد کردی کہ میں ہی خود اپنی جائداد کا انتظام کروں۔ چچا نے مجھ سے بارہا کہا "عزیزی شادی کرلو۔ یہ ویرانی آخر کب تک" میں نے ہمیشہ انکار کیا نہ جانے کیوں۔ اسی طرح زندگی کے پچیس سال گذر گئے۔

سجاد کو پڑھا لکھا آدمی ضرور تھا مگر اس نے نہایت مشکوک طبیعت پائی تھی وہ جب بھی کسی مسئلہ پر گفتگو کرتا تو نہایت مشکوک انداز میں چنانچہ کسی فوری مسئلہ کو بھی وہ دقیق تصور کرتے ہوئے ٹالدیا کرتا تھا۔ ایک سال یوسف پور میں بارش مطلق نہیں ہوئی۔ گاؤں کے سارے کسان پریشان ہونے لگے۔ مگر سجاد لگان کی وصولی کے لئے دیہات دیہات گھومتا پھرتا اور صاف صاف کہتا کہ مجھے بارش سے کچھ مطلب نہیں۔ لگان دو۔ ورنہ تمہاری رہی سہی پونجی بھی ضبط کر دوں گا۔ اب دیہات میں سجاد سے متعلق چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور دوسری طرف غریب کسانوں کی کھیتیوں میں خاک و دھول کے بادل اڑنے لگے۔ خورشید نے سجاد کو بہترا سمجھایا کہ ان غریب کسانوں پر رحم کرو۔ ورنہ نتیجہ کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ سجاد نے خورشید کے الفاظ کی پرواہ نہیں کی اور بدستور اس نے اپنا جبر و تشدد قائم ہی رکھا۔

خورشید مغموم رہتی اور تمام دن اپنے دارالمطالعہ میں گزار دیتی۔ کھڑکی کے پاس استادہ رہتی اُداس اور نمائش والان سفید سفید بادلوں کے ٹکڑوں کو دیکھتی رہتی — بے پایاں تفکرات میں محو ہو کر جبکہ اس کے سینے کا دوپٹہ ڈھلک جاتا۔ چہرے پر نراشا کے آثار نمودار ہو جاتے اور پھر جلنے اس کی آنکھوں سے دو آنسو کبھی ٹپک پڑتے۔ کوئی کسان چوپال میں گاتا۔ "نہ آیا من کا میت عمریا بیت گئی ساری"۔ خورشید تڑپ اٹھتی مانو اس کے سینے کا دبا ہوا زخم پھر خون اگلنے لگتا۔ وہ بے تحاشا اپنے بستر پر گر پڑتی اور خوب سسکیاں لے لیکر روتی۔ اُف! خورشید کی زندگی کس کشاکش اور الم میں بیت رہی تھی۔

میری بھی کھیتیاں اجڑ رہی تھیں۔ کریم نگر سے میرے گماشتہ وسنت نے کہا "بڑے بابو! کریم نگر جلانا تو بارش معلق نہیں۔ کھیت سوکھ رہے ہیں گاؤں کے ندی نالے سب خشک ہو چکے ہیں" میں نے وسنت کو جواب میں لکھا "وسنت بابو۔ سوکھنے دو ان کھیتیوں کو۔ جیسے بھی ہو سارے گاؤں میں اعلان کردو کہ اس سال کا لگان وصول نہیں کیا جائیگا۔"

کریم نگر میں دھوم مچ گئی۔ یہ خبر یوسف پور بھی پہونچی۔ سجاد پریشان ہونے لگا اور یوسف پور کے سارے کسان زمینیں چھوڑ چھوڑ کر کریم نگر آکر بسنے لگے۔ سجاد پاگل ہو رہا تھا اور شاید آج اس نے پہلی مرتبہ اپنی انتہائی بے قراریوں کے ساتھ خورشید سے پوچھا "خورشید کیا کروں۔ میں بدحواس ہو رہا ہوں۔ یوسف پور اجڑ رہا ہے۔ سارے گاؤں والے یوسف پور چھوڑ کر کریم نگر چلے جا رہے ہیں۔ کہو خورشید کچھ تو بولو۔" خورشید خاموش تھی پر اس نے کہا: "تم بھی لگان کیوں نہیں معاف کردیتے" گویا سجاد کا پیر دہکتی ہوئی آگ پر پڑ گیا ہو۔ وہ بیقرار ہوگیا چیخ کر کہنے لگا۔ "ایسا نہیں ہوگا۔ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اُجڑنے دو۔ کھیتوں کو ویران ہونے دو۔ میں لگان معاف نہیں کروں گا۔ یوسف پور اجڑ رہا ہے اُجڑنے دو۔" سجاد کے دماغ پر ہذیانی کیفیات طاری ہو چکی تھیں۔ وہ دوسرے کمرے میں بدحواسی سے داخل ہوا اور اپنی پرانی وضع کی بندوق درست کرنے لگا۔ خورشید نے آگے بڑھکر بندوق کو سنبھال لیا مگر ٹھک ٹھک دو مرتبہ خالی آواز سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ گاؤں والے سمجھنے لگے سب۔ داتا پر گدایاں چلا رہا ہے اُنہوں نے بھی اپنے ہتھیار درست کرلئے۔ اب کیا تھا یوسف پور کے ...

کے دیہاتوں میں بغاوت پھیل چکی تھی سہارا کی تلاش میں جد بیات کے نوجوان بوڑھے اور بچے سبھی رہنے لگے — پھر ایک دن وہ آگیا ہوا — اور خورشید بیوہ ہوگئی۔

خورشید۔ اجڑی ہوئی خورشید جدیہات کی بہاروں کو دیکھ کر ابھی پوری طرح مسکرائی بھی نہ تھی ایک نئے غم سے متعلق کر دی گئی۔ اب اس کے ریشہ ریشہ میں حزن و ملال کے سوا کچھ بھی نہ تھا — نہ مسکراہٹ نہ ہنسی، نہ قہقہہ۔ اسی بیوگی کے عالم میں خورشید کا بائیسواں سال شروع ہوا۔ جبکہ عورت کا شباب اپنی انتہائی بلندیوں پر پہونچ کر ٹھہر جاتا ہے۔

تم شربتی رنگ کے ململ کے ایک ٹکڑے میں چند گلاب کے پھولوں کو رکھ لو اور خوب مسل ڈالو۔ اور انھیں پھینک دو — پھر جو کیفیت تمہارے دل میں پیدا ہو اسے کہنے کی کوشش کرو۔ شاید ان تاثرات کو تم کہہ نہ سکوگے۔ خورشید بھی ایک مہکتا ہوا پھول تھی جو مسلنے کے بعد دور پھینک دی گئی تھی۔

بائیسویں سالگرہ پر مجھے اس نے مدعو کیا تھا کئی مہینوں کے بعد خورشید کی یہ تحریر مجھے ملی تھی۔ اور دل بھی نہیں چاہتا تھا کہ خورشید کے کہنے کو ٹال دوں۔

میں یوسف پور جانے کے لئے تیار ہوگیا۔

خورشید کا کاشانہ جو "فردوس" کے نام سے مشہور تھا۔ ہزاروں ملوثات کو لئے ہوئے ایک اداس ماحول میں استادہ تھا۔ سیڑھیوں پر خورشید میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے خورشید کو دیکھتے ہی کہا "بائیسویں سالگرہ مبارک ہو" — "بھیا۔ آپ کبھی" اور پھر فوراً ہی اس نے اپنے مسیح چہرے پر نہ جانے کیوں گھونگٹ کھینچ لیا —

نغمات

باسط بھوپالی

کچھ صلہ ہی نہ ملا عشق میں جل جانے کا
شمع نے لوٹ لیا سوز بھی پروانے کا

میری بالیں پہ مرے واسطے رونے والے
اب نہ جینے ہی کا موقع ہے نہ مرجانے کا

میرا مٹنا نہیں آسان محبت کی قسم
موت ہی نام ترے دل سے اتر جانے کا

حشر تک روئے گی دنیائے محبت مجھکو
سلسلہ ختم نہ ہوگا مرے افسانے کا

جذب ہوجائیں تری مست نگاہیں دل میں
راز میخانے سے باہر نہ ہو میخانے کا

اس طرح مجھ سے مخاطب ہے زمانہ جیسے
ہوش کی فکر بھی اک فرض ہو دیوانے کا

ان کے انداز ستم کا ہے تقاضا باسط
عہد کر لیجئے مر مر کے جئے جانے کا

گیت

منصور معجز بی اے

انکھیاں ملا کے ساجن دیکھو نہ بھول جانا
تم ہو تو میں سہاگن دیکھو نہ بھول جانا

ہر چیز ہے سہانی جب تم ہو پاس میرے
جب پاس تم نہ ہو گے تو ہوں گے غم کے پھیرے
سونا لگے گا آنگن، دیکھو نہ بھول جانا

انکھیاں ملا کے ساجن دیکھو نہ بھول جانا
تم ہو تو میں سہاگن دیکھو نہ بھول جانا

تم ساتھ ہو جبھی تک بھاتی ہیں یہ ہوائیں
پیچھے تمہارے بالم چھائیں گی جب گھٹائیں
چھیڑے گا مجھکو ساون، دیکھو نہ بھول جانا

انکھیاں ملا کے ساجن دیکھو نہ بھول جانا
تم ہو تو میں سہاگن دیکھو نہ بھول جانا

تم دھوکہ دے گئے تو جلنے کا کون کہنے؟
لگ جائے گا مگر ہاں اک درد دل میں رہنے!
نازک ہے من کا درپن، دیکھو نہ بھول جانا

انکھیاں ملا کے ساجن دیکھو نہ بھول جانا
تم ہو تو میں سہاگن، دیکھو نہ بھول جانا

جب تم ہی دور ہو گے بھائیں گے کیا نظارے
پا کر مجھے اکیلی چھیڑیں گے چاند تارے
دے گی نہ سونے کلپن، دیکھو نہ بھول جانا

انکھیاں ملا کے ساجن دیکھو نہ بھول جانا
تم ہو تو میں سہاگن، دیکھو نہ بھول جانا

سنسار بھر میں پیتم میرے تو اک تمہی ہو
تم من کا ہو اجالا، نینوں کی روشنی ہو
جیون ہے تم کو ارپن، دیکھو نہ بھول جانا

انکھیاں ملا کے ساجن دیکھو نہ بھول جانا
تم ہو تو میں سہاگن دیکھو نہ بھول جانا

ضبط ایم۔ اے

ہمارا تمدّن اور اُس کا تحفّظ

دنیا کے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مسلمان بھی بجا طور پر ایک قدیم تہذیب و تمدن پر فخر کر سکتے ہیں اس تمدن میں ان کی شاندار تاریخ، ان کے بے مثل کارنامے اور فتوحات، نیز دنیائے ادب و انشا، دنیائے سیاست، دنیائے مو شیات اور فنون لطیفہ میں ان کی نمایاں ترقیاں شامل ہیں۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ان ترقیوں میں سب اسلام کا اثر غالب ہے۔ اسی اثر نے اختلاف میں موافقت و موانست پیدا کر دی دنیا کی مختلف مذاہب کے منتشر اور جنگجو قوموں کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ ان میں اُخوت و محبت کی لہر دوڑا دی اور ان میں ایسا اتحاد و اتفاق قائم کیا جس کی نظیر ملنی نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ اس دور کے مسلمان شمعِ اسلام کے پروانے اور اسلامی تعلیم، اصول و احکام پر سختی سے کاربند تھے۔ اس لئے انہیں غیر معمولی ترقیاں بھی حاصل ہوئیں۔ یہ ضرور ہے کہ آج مختلف ملکوں کے مسلمانوں میں کچھ فرق ہے اور اس فرق کے خدوخال ان کے تمدن، تہذیب و معاشرت کے آئینے میں نظر آتے ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس اختلاف سے اسلامی اتحاد و یکتائی کی روشنی تاریک تو کیا دھندلی بھی نہ ہو سکی شروعِ اسلام سے آج تک عالمگیر اتحاد کی روشنی سے دنیائے اسلام منور ہے اور اس نے کبھی مقام و ماحول کے اثرات کو قبول نہیں کیا

مسلمانوں کا اتحاد

مسلمانوں کی جہانگیر اخوت مصنوعی یا تخیلی نہیں۔ اگر ہم دنیا کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ مسلمانوں کا اتحاد ایک مسلّم حقیقت ہے جس کا سینکڑوں مرتبہ جائزہ لیا جا چکا ہے اب اس کے ثبوت و شواہد کی ضرورت نہیں رہی، عرصہ ہوا کہ دنیائے اسلام میں عام طبعی رجحان تھا کہ اسلامی اتحاد و اخوت کا جذبہ بدولت سے متاثر ہو جو غالباً تاریخی نقطۂ نگاہ سے انیسویں صدی

کی پان اسلامی د تحریک کا ردِ عمل تھا، اس کی جگہ وطنیت، ماحول کی خصوصیات اور مقامی تمدن پر زور دیا جائے خوش قسمتی سے وہ تحریک ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی اور اسے ختم ہونا بھی چاہیئے تھا ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ کوئی بھی نہیں نکلا۔ اس لئے یہ بات ثابت ہو گئی اور اب ہم اسے محسوس بھی کرتے ہیں کہ یہ ایک فاش غلطی ہو گی اگر ہم اسلامی تاریخ کے تیز دھارے کے رخ کی طرف نہ بہ کر اسے دوسری طرف موڑنے کی کوشش کریں اپنے کو اسلامی اخوت سے دور رکھنا نہ صرف غلط بلکہ مضر بھی ہے خصوصاً موجودہ زمانے میں۔ برطانیہ کی نام نہاد سلطنت جمہوریہ جس کی نشو و نما خالص مصنوعی طور پر ہوئی ہے دعویٰ کرتی ہے کہ وہ دنیا میں امن و امان اور آزادی کی فضا پیدا کرنے کی ضامن ہے لیکن اس دعویٰ کی کوئی دلیل نہیں نہ اس میں ذرہ برابر بھی صداقت ہے ابھی ابھی جو جنگ عظیم ختم ہوئی ہے اس کے نتائج و اثرات ہمارے سامنے ہیں۔ سچ پوچھئے تو مسلمان اور صرف مسلمان ہی ایسا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ اسلام ہی اتحاد و محبت کا ایک قدرتی ذریعہ ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر اسلامی مذہب و تمدن کے ذریعے مسلمانوں میں اتحاد قائم کیا جائے تو وہ روحانی، حقیقی اور ابدی اتحاد ہو گا جسے دنیا کی کوئی طاقت مٹا نہیں سکتی بالفاظ دیگر یہ اخوت امن آزادی اور جمہوریت کا ایک ایسا قلعہ ہو گی جس میں کوئی خارجی طاقت رخنے نہیں ڈال سکتی ؎

اسلامی برادری کے رکن ہونے کی حیثیت سے ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی تمدن کا ایک بیش بہا خزانہ ورثے میں پایا ہے اس میراث کو سنوارنے اور اسے پروان چڑھانے میں وہ زمانۂ ماضی میں نمایاں حصہ لے چکے ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ مستقبل قریب و بعید میں بھی وہ اسے ترقی دینے میں کار ہائے نمایاں انجام دیں گے۔ ان کی سب سے اہم میراث یہ احساس ہے کہ وہ ایک شاندار تمدن کے مالک ہیں، عربوں کا فیضان، یونانی فلسفہ، ایرانیوں کی فصیح و بلیغ

شاعری جس کا عکس اردو شاعری کی صورت میں ہندوستان میں ہے ہسپانی، مسلمانوں اور مغلوں کی یادگار عمارتیں، عباسیوں کی سیاست اس میں شامل ہیں وہ خوبصورت گنبد اور بانکے محراب غیر فانی یادگاریں ہونے کے علاوہ ثابت کرتے ہیں کہ مسلمان فرمانروا بے انتہا روادار، فراخدل اور وسیع المشرب تھے یہ رواداری کی حد نہیں تو اور کیا ہے کہ وہ ہندوستانی باشندوں کے مذہبی مسائل میں مداخلت کرنے کی بجائے ان کے مذاہب کی سلامتی اور ترقی کی خاص خاص تدبیریں کرتے تھے ایک ایسے مذہب کے لئے جو ان کے مذہب سے بہت مختلف بلکہ اس کا مخالف تھا۔ اگر ہم اپنے تمدن و تہذیب پر غور کر کے اس کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اس میں چند خاص خصوصیات اور اصول ہیں جو دنیا کے دوسرے مذاہب کے اصولوں سے بالکل مختلف ہیں ان اصولوں پر مسلمان شروع اسلام ہی سے کاربند تھے اور چند اسلامی اصول تو ایسے ہیں جن کے مسلمان آج بھی سختی سے پابند ہیں ان کی انفرادیت انہیں زریں اصولوں سے قائم ہے اور دنیا کی کوئی قوم ان معاملات میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔
دراصل یہ اصول تعمیر اسلامی کی مستحکم بنیادیں ہیں۔

(۱) انفرادی خودداری
(۲) جہانگیر مساوات
(۳) ملی و سیاسی جمہوریت
(۴) صداقت کا شوق و تحسین

اسلام نام ہے زندگی کے عملی قوانین کا اگر ہم اس کی عملی تعلیموں پر غور کریں جو روحانیت کے دقیق مسئلوں سے لیکر ضروریات زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل تک پھیلی ہوئی ہے تو ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ اسلام انسانیت کو، روحانی، اخلاقی اور جسمانی نکتہ ہائے نگاہ سے یکساں اور ارفع و اعلیٰ مقام پر پہنچانے کے لئے آیا تھا۔ اسلام ہمیں ان معاملات میں بھی تعلیم دیتا ہے جنہیں دوسرے مذاہب نے دقیق اور معمولی باتیں سمجھ کر کوئی اہمیت نہیں دی اور نہ انہیں مذہب کے دائرے میں رکھنا ضروری سمجھا۔ اسلام کے قوانین اور اصولوں کی جامعیت، افادیت و اہمیت سے کسی غیر مسلم کو بھی انکار نہیں ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دوسرے مذاہب کے پیرو بھی اسلام کے اخذ کردہ احکام و اصول پر، عمل پیرا ہیں۔ اسلام کا بنیادی قانون جس پر تعمیر اسلامی کا انحصار ہے یہ ہے کہ زندگی چند مختلف حصوں اور ٹکڑوں میں تقسیم نہیں ہو سکتی دوسرے مذاہب کی تعلیم کے خلاف اسلام ہمیں سکھاتا ہے کہ ہم اپنی زندگی کو جامع و مکمل سمجھیں۔ دوسرے مذاہب میں ایسے سلسلے ملتے ہیں جن میں ایک فرد کو پوری آزادی ہے کہ وہ اپنی رائے اور مرضی کے مطابق تمام کام انجام دے سکتا ہے لیکن اسلام میں وہ ملی مسئلے سمجھے جاتے ہیں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں فرد کی شخصیت اسی وقت تک قائم ہے جبتک وہ ملت اسلامی کے ساتھ ہے اور اسلامی اصول کے تفوق کا اقرار کرتا ہے اس ملت کا وہ ایک سرگرم کارکن ہے جس طرح فرد کا یہ فرض ہے کہ وہ کسی صورت میں بھی ملت سے علیحدہ نہ ہو ٹھیک اسی طرح ملت بھی اس کے جائز حقوق کو نظر انداز نہیں کرتی۔ دوسرے مذاہب میں فرد اور ملت کا یہ ربط باہمی نام کو بھی نہیں ہے ان کے اصول اسلامی اصول سے مختلف ہونے کی حیثیت سے کامیاب بھی نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر عیسائیوں کو لے لیجئے ان کے یہاں اخلاق کے دو مختلف معیار ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عیسائی ملکوں میں بھی عیسائیت کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔

انفرادی حقوق

اسلامی ملت فرد کی عزت کرتی ہے اس کے وجود، اس کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتی ہے لیکن اس کو اتنی آزادی نہیں دیتی کہ وہ ملت کو چھوڑ دے یا اس کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جائے اس نے اس کے لئے ایک ملی عمارت تعمیر کر دی ہے جس کے حدود میں رہ کر وہ ممکن حد تک زیادہ سے زیادہ آزاد ہے۔ بہرحال ملت کی عظمت کا اعتراف اور اسلامی اصول کے تفوق کا اقرار کرنا اس کے لئے بہت ضروری ہے۔

فرد کو اسلام کی دی ہوئی نعمتوں میں ایک یہ بھی ہے کہ اسے مذہب کے معاملے میں پوری آزادی ہے اسے پورا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق بغیر کسی شخص کی مداخلت کے خدا کی پرستش کر سکتا ہے ہندوؤں کے یہاں پجاری ہیں اور عیسائیوں کے یہاں پادری۔ دوسرے مذاہب کے تعصب اور تنگ نظری نے فرد کو اتنی آزادی نہیں دی۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ کوئی شخص ہی کیوں نہ ہو اگر وہ اسلامی قواعد و ضوابط جانتا ہے تو وہ مذہبی احکام ادا کر سکتا ہے اس کے برعکس دوسرے مذاہب کے اکثر و بیشتر معاملات و احکامات میں فرد کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے اسلام نے پجاری اور پادری کے عہدہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا اس نے ایک جماعت کے اس دعوے کو وہ انسان اور خدا کے سلسلے کی درمیانی کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں باطل کہہ کر ہر فرد کو ایک اعلیٰ مقام پر پہنچایا ہے ضرورت ہے کہ ہر مسلمان کو اس کا احساس ہو ممکن ہے کہ دوسرے حضرات اس مسئلے کو اتنی اہمیت نہ دیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے

کہ انسان کو پجاریوں اور پادریوں کے ناقابل برداشت ظلم سے نجات دلانا ایک انقلاب آفرین کارنامہ سے کم نہیں۔ چنانچہ آج بیسویں صدی میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس میں پجاریوں اور پادریوں کا ظلم نام کو بھی نہیں ہے۔ لیکن افسوس ہی نہیں تعجب بھی ہے کہ اسلام کے اس احسان کا احساس بہت سے مسلمانوں کو بھی نہیں ہے اور یہ دیکھ کر بے حد تکلیف ہوتی ہے کہ اسلام میں بھی ایک روحانی جماعت پیدا ہو گئی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس جماعت کے مختلف خاندان کے افراد میں سلسلہ وار نسب در نسب روحانی طاقت منتقل ہوتی رہتی ہے۔ ایک بیٹا جو اپنے باپ کی مسند خلافت کا وارث ہوتا ہے روحانی حیثیت سے بھی اس کا خلیفہ ہے۔ اس قسم کی جماعتیں آج بھی موجود ہیں لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اس نام نہاد روحانیت کو عام پڑھے لکھے مسلمانوں نے کبھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا اور خاندانی نیز پیشہ ور پیروں کے اثنا تصرف ان لوگوں پر ہے جو جاہل ہیں۔ وہی ہیں جن کا عقیدہ باطل ہے اور جنہیں اپنے حقوق کا احساس نہیں ہے۔

مساوات اسلامی

اسلام نے نہ صرف افراد کے حقوق کی تشریح کی ہے بلکہ ان کی محافظت کا ذمہ بھی لیا ہے۔ ایک ایسی ملی عمارت بنا دی ہے جس کی بنیادیں افراد کے حقوق ہیں۔ کیا اس سے کوئی انکار کر سکتا ہے کہ سب سے پہلے اسلام ہی نے مساوات اور جمہوریت کی نہایت جامع و مانع تشریح و تعریف بیان کی۔ ایسے وقت میں جبکہ دنیا کی دوسری قومیں تقریباً اندھی تھیں اور مساوات و جمہوریت کے خیالات ان کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتے تھے سب سے پہلے مسلمان ہی اس مساوات پر سختی سے کاربند ہوئے۔ اس مقصد کی تکمیل کا آلہ مسجدیں ہیں جن میں مراتب کا افتراق و امتیاز نہیں اور جہاں مرتبہ، دولت وغیرہ کے فرق کو مٹاتے ہوئے ایک ہی صف میں امیر و غریب، بادشاہ و رعایا، بوڑھے اور بچے نمازیں ادا کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آج ملت اسلامی میں بھی دولت، حیثیت یا مرتبہ کے لحاظ سے جماعتیں ہوں لیکن اس قسم کی جماعتیں بہت زیادہ نہیں برائے نام ہیں کیونکہ مسجدوں میں کامل مساوات کا خیال رکھا جاتا ہے اور وہاں کسی کروڑپتی کے لئے یورپ کے کلیساؤں کی طرح کوئی خاص جگہ مخصوص نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کے ملی تعلقات پر اس مساوات کا بہت زیادہ اثر پڑا۔ اس کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ اسلام میں ذات کا سلسلہ نہیں ہے یا کم از کم ہندو سماج کی طرح "اچھوت" یا "نیچ قوم" نہیں ہیں۔ ایک فرد چاہے وہ کتنا ہی نیچ قوم سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو مسلمان ہونے کے بعد دوسرے پیدائشی مسلمان کے سے حقوق کا حقدار ہو جاتا ہے اور دوسرے مسلمان اسے اپنا بھائی سمجھتے ہیں۔ اسے اتنے حقوق حاصل ہو جاتے ہیں کہ تبدیلی مذہب سے پہلے وہ ان کا خیال بھی نہ کر سکتا تھا۔ اگر اس نکتہ نگاہ سے مسلمان یہ دعویٰ کریں کہ وہ دنیا کی ترقی یافتہ جمہوریت پسند قوم ہیں تو یہ بیجا نہیں ہوگا۔

اسلام میں عورتوں کا مرتبہ

اب عورتوں کو لے لیجئے۔ غیر مسلموں کا عموماً اور عیسائی پادریوں کا خصوصاً مسلمانوں پر یہ اعتراض ہے کہ انہوں نے اپنی ملت میں خواتین کو ایک بہت ہی نیچا درجہ دیا ہے لیکن یہ اعتراض ان کی زبان سے کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا جن کی عورتوں کو مسلمان عورتوں کی طرح آدھا حق بھی حاصل نہیں۔ ظاہری تصنع ہمیں اکثر فریب میں ڈال دیتا ہے اور یہ ناممکن نہیں ہے کہ ہم باطل کو حق سمجھنے لگیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مغرب کی نام نہاد آزاد عورتوں کو نقل و حرکت کی آزادی کے سوا کوئی آزادی یا حق حاصل نہیں۔ سب سے پہلے اسلام ہی نے عورتوں کو اتنا حق دیا کہ وہ جائیداد کی وارث ہو سکیں لیکن یورپ کی عورتوں کو اتنا حق کبھی حاصل نہ تھا کہ وہ وارث جائیداد ہوں۔ آج چودہ سو سال کے بعد ان کی آنکھیں کھلی ہیں اور ابھی حال ہی میں مغرب کے چند ملکوں میں خواتین کے اس جائز حق کو تسلیم کیا گیا ہے لیکن اس میں بھی بہت سی رکاوٹیں اور شرائط ہیں جن کی وجہ سے یہ حق اکثر منسوخ ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں مسلم خواتین جائیداد خرید سکتی ہیں، فروخت کر سکتی ہیں اور ان معاملات میں انہیں اتنی آزادی ہے کہ ان کی مغربی بہنوں کو خواب میں بھی نصیب نہیں ہو سکتی۔ دراصل مغرب عورتوں کو ایک ثانوی حیثیت دیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ [illegible] عورت پرست ہوتا ہے لیکن یہ غلط اور محض غلط ہے۔ [illegible] میں [illegible] گذشتہ سال یعنی ۱۹۴۵ء میں وہاں کی خواتین کو ووٹ دینے کا حق دیا گیا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ظلم ہو سکتا ہے کہ یورپ کے اکثر ملکوں میں ایک شادی شدہ عورت اپنی مرضی سے چیک پر دستخط کر کے اسے بھنا بھی نہیں [illegible] اور پابندیوں کے باوجود بھی مغرب کی عورتیں آزاد کہلاتی ہیں۔

شادی کا مسئلہ اور اس سے پیدا ہونے والی پیچیدگیاں [illegible] یورپ اور دوسرے غیر مسلم ممالک کے لئے مصیبت و تکلیف کا باعث ہیں۔ وہ شادی کو ایک کھیل سمجھے ہوئے ہیں۔ وہ اس میں کوئی خاص مستحکم قول و قرار کو ضروری نہیں سمجھتے۔ وہ اس فریب میں مبتلا ہیں کہ رشتۂ ازدواج ایک مستقل و مستحکم رشتہ ہے جس کا توڑنا بہت مشکل ہے۔ حالانکہ اس غلط نظریہ کے بہت خطرناک نتیجے

دقوں میں آچکے ہیں یا یوں سمجھ لیجئے کہ عیسائی دنیا تک یہاں زن و شوہر آپس میں غیر معین وقت کے لئے عارضی معاہدہ کرتے ہیں اور دونوں کی مرضی سے یہ معاہدہ نہایت آسانی سے ٹوٹ سکتا ہے شادی کے متعلق ہمارے ان کے نظریے میں آسمان و زمین کا فرق ہے ان سب واقعات کے پیش نظر یہ بجا اور بہت بجا ہے کہ جہاں تک خواتین کے حقوق کا تعلق ہے ہم مغرب کو بہت کچھ سکھا سکتے ہیں اس سے کچھ سیکھ نہیں سکتے۔

صداقت کی تلاش اور رواداری

اسلام کے دوسرے اصولوں میں صداقت کی تلاش اور رواداری بہت اہم ہیں یہ کہنا بہت بڑا ظلم ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں نے اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا ہے اور ان میں رواداری نام کو نہیں۔ حقیقت یہ ہے حقیقت اس کے برعکس ہے مسلمانوں کی ایک ہزار سال کی حکومت کے بعد بھی یہاں ہندو اکثریت میں ہیں اور مسلمان اقلیت میں۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کے دارالسلطنت اور خاص خاص تمدنی وسیاسی مراکز میں بھی ہندو بہت زیادہ ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان فرمانرواکی مسلمہ پالیسی یہ تھی کہ ہندوستانی باشندوں کے مذہبی مسائل میں ہرگز مداخلت نہ کی جائے یہی وجہ ہے کہ آج ہندو ہندوستان میں بہت زیادہ ہیں اگر وہ چاہتے تو ہندو مذہب کو صفحۂ ہندوستان سے حرف غلط کی طرح مٹا دیتے کیونکہ ازمنۂ وسطیٰ کے مسلمان بادشاہوں کے لئے یہ ناممکن نہ تھا لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اسلام نے ان کو ایسی تعلیم نہیں دی تھی اگر وہ ایسا کرتا تو ان کا یہ فعل اسلامی رواداری کے منافی ہوتا ہسپانیہ میں بھی مسلمانوں نے صدیوں حکومت کی تعجب کی بات ہے کہ آج وہاں صرف عیسائی قوم آباد ہے اور صرف چند کھنڈر اور ٹوٹی پھوٹی عمارتیں جو امتداد زمانہ سے بچ گئی ہیں مسلمانوں کی عظمت رفتہ و شوکت گذشتہ کی یاد دلاتی ہیں۔

اسلام میں کوئی ٹرینٹ کی کونسل (KOUNAL OF TRENT) نہیں جس کی وجہ سے اسے ندامت ہو۔ مذہب اسلام سے انکار کرنے کی صورت میں کبھی کسی کو منزادی گئی نہ ہلاک کیا گیا۔ مسلمان عام طور سے مذہبی معاملات میں مداخلت کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ اسلام کی اشاعت اور ترقی کے لئے بالکل مختلف ذرائع اختیار کئے گئے تھے۔

اسلامی تعلیم اور اصول

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ وہ کونسے اسباب تھے جن کی وجہ سے دنیا کی مختلف قومیں اسلام کی طرف کھنچی چلی آتی تھیں اس کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں نے کبھی ظلم و ستم کے زور لیے اپنا مذہب پھیلانے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ اسلام کے محاسن اس کی تعلیم اس کے اصول، اس کے وضع کئے ہوئے قوانین نے لوگوں کو گرویدہ بنا لیا اور یہ مقبول خاص و عام ہو گیا۔ اسپین میں اور دنیا کے دوسرے حصوں میں مسلمانوں کی قومی درسگاہیں تھیں جہاں ہر قسم کے علوم و فنون کی تعلیم دی جاتی تھی یہ وہ مراکز تھے جہاں سے اسلامی، اصول اور تعلیم کی نشرو اشاعت بھی ہوتی تھی سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جب اسلام نے علم و ادب کی روشنی پھیلائی تو مغرب میں جہالت کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی اور یہ مسلمان ہی ہیں جنہوں نے یونان اور روم کے علم و ہنر کو دنیا کے دوسرے اقوام تک پہنچایا اگر وہ ایسا نہ کرتے تو وہ جواہر پارے ہمیشہ کے لئے ضائع ہو جاتے۔ رسول اکرم نے تعلیم دی تھی کہ وہ علم حاصل کریں اس لئے انہوں نے یونان اور روم کے علم و ہنر کو مسترد نہیں کیا بلکہ ان میں ترقی کی حالانکہ وہ غیر مسلموں کی محنت کا نتیجہ تھے اگر وہ غیر مسلموں کے علم و ہنر کو حاصل نہ کرتے تو یہ اسلام کی تعلیم کے خلاف ہوتا۔ اسلام کی اس اسپرٹ نے دوسرے اقوام میں بھی اکتساب علم و ہنر کی اسپرٹ پیدا کر دی ہے اور آج دنیا میں جتنی تحریکیں بھی شروع ہو رہی ہیں چاہے وہ تمدنی ہوں یا کچھ اور ان میں اسلامی اسپرٹ ضرور ہوتی ہے

اگر مسلمان اپنے شاندار ماضی اور قدیم تہذیب و تمدن پر فخر کریں تو بیجا نہیں ہے وہ مسلمان جو ہسپانیہ کے جامعوں میں علم و ادب، ہنر اور سائنس کو ترقی دینے میں ہمہ تن مصروف تھے وہ مسلمان جنہوں نے یوروپ کی بیداری . . . . . (RENAISSANCE) کی بنیاد ڈالی تھی وہ مسلمان جو علم و ادب کے دیوانے تھے اور جو اکتساب علم کے لئے تکلیف و مصیبت برداشت کر کے دور دراز کا سفر کرتے تھے وہ مسلمان جو سیاست داں بھی تھے اور جنہوں نے عرصۂ دراز تک مختلف مذاہب پر نہایت کامیابی کے ساتھ حکومت کی وہ مسلمان جنہوں نے فن تعمیر میں بھی کمال حاصل کیا اور جن کی یادگاریں دنیا کے طول و عرض میں ایسی عمارتیں ہیں جن کی مثال نہیں مل سکتی۔ وہ مسلمان جنہوں نے سمندروں اور دریاؤں کے بے انتہا مصائب کے باوجود جہازرانی میں بے نظیر کمال حاصل کیا۔ ان میں چند ایسے اولیائے کرام اور مشائخ عظام بھی تھے جنہوں نے اپنے اخلاق اور اپنی صلح کل (UNIVERSAL LOVE) کی نیک تعلیم سے لوگوں کے دلوں کو موہ لیا اور اسلام کی نشر و اشاعت کی خصوصاً ہندوستان میں اولیائے کرام نے اسلام پھیلانے میں بڑی مدد دی یہی لوگ اسلام کے علم بردار تھے جن کے افعال و اقوال سے ہمیں سبق حاصل کر کے ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

دراصل پاکستان کا مطالبہ مسلمان قوم کی جدو جہد اپنے شاندار ماضی

اور یہ عظمت تہذیب و تمدن کو محفوظ رکھنے کی اس شاندار ماضی اور قدیم تمدن سے ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ہم ایک مختلف اور علیحدہ قوم کی حیثیت سے ہیں۔ یہاں کی دوسری قوموں سے ہمارا اتفاق و اتحاد نہیں ہو سکتا۔ بنگال بہار اور بمبئی کے حالیہ فسادات، خانہ جنگی اور قتل و غارتگری سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ ہندوستان جس دور سے گزر رہا ہے اور مسلمان دشمنی پر دوسری قومیں جس طرح اتری ہوئی ہیں وہ اظہر من الشمس ہے ——

لیکن ٹریجڈی یہ ہے کہ مسلمان اب بھی بے خبر ہیں۔ اس میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا کہ اگر ہم دشمنوں کی چال اور ان کے حملوں سے محفوظ رہ کر اپنی انفرادیت قائم رکھ سکیں تو پاکستان کے مطالبے کی جد و جہد کرتی بڑھتی ہی ہو سکتی ہے کہ راستے میں بہت سی دشواریاں ہوں اور ہمارا سفر خطرناک اور صبر آزما ہو لیکن آخر میں ہماری کامیابی یقینی اور لازمی ہے۔

ان دنوں

اثر جلیلی

دل شکوہ سنج گردشِ دوراں ہے ان دنوں
شیرازۂ حیات پریشاں ہے ان دنوں

ہر شب حریف طولِ قیامت ہے بالیقیں
ہر روز غیرتِ شبِ ہجراں ہے ان دنوں

اک یاس بے نہایت و اک رنج بے کنار
افسانۂ حیات کا عنواں ہے ان دنوں

تھی جس پہ کل نزاکتِ گلبرگ تر گراں
وہ زیر بارِ خارِ مغیلاں ہے ان دنوں

وہ دل کہ صدرِ انجمن حسن و عشق تھا
مانوسِ کوہ و دشت و بیاباں ہے ان دنوں

خلّاقِ رنگ و نور کبھی تھی جو چشمِ شوق
ناآشنائے سنبل و ریحاں ہے ان دنوں

وہ سینہ تھا جو مشرقِ خورشید لازوال
اس پر گمانِ کلبۂ احزاں ہے ان دنوں

بادِ بہارِ صبح جسے ناگوار تھی
وہ زیر مشقِ صرصر و طوفاں ہے ان دنوں

مٹنے لگا ہے ذہن سے پندارِ برتری
جو جور بھی ہے شاملِ احساں ہے ان دنوں

اقلیم دو جہاں کو جو گردانتا نہ تھا
مداحِ اوجِ تختِ سلیماں ہے ان دنوں

کیا پوچھتا ہے مشغلہ ہائے اثر ندیم!
مصروفِ شکوۂ غمِ دوراں ہے ان دنوں

چلمن سے جو نیاں جھانک رہی ہیں

چلمن

رفیق غازی سیالکوٹی کے افسانوی ادب کا شاہکار جسکے ہر حرف سے جوانی۔ زندگی، فطرت، حسن ادا، نزاکت خیال ادبی لطافت اور پاکیزہ فن کاری کی پریاں جھانک رہی ہیں یہ مشہور پبلشنگ ہاؤس کی تازہ ترین پیش کش ہے۔ ان افسانوں میں سماج پر گہری تنقید، زندگی کا نفسیاتی تجزیہ اور فن افسانہ نگاری کی حقیقی تکمیل پہلو بہ پہلو نظر آتی ہے۔ آنسو ہیں مگر مسکراہٹوں کی قوس و قزح رنگین مسکراہٹیں ہیں مگر آنسوؤں کے موتیوں سے لبریز یہ ۱۹۴۶ء کی یادگار

افسانوی شاہکار

زندگی اور صداقت سے لبریز، کتابت
معیاری طباعت نفیس اور خوشنما
گرد پوش
عنقریب منظر اشاعت پر آنے والا ہے
قیمت
فی جلد دو روپے (عہ)

میں جھوم رہا ہوں تو جہاں جھوم رہا ہے

میکدۂ علم و ادب اور خمخانۂ شعر و شباب کے چھلکتے ہوئے

پیمانے

گردش میں آ گئے

ہر پیمانہ۔ ادب و انشا کی شراب ناب سے لبریز ہے ہندوستان کے مشہور شاعر اور مایۂ ناز ادیب حضرت ماہر القادری کا افسانوی مجموعہ کا ہر افسانہ نفسیات انسانی کا آئینہ۔ فن افسانہ نگاری کا شاہکار۔ علم و ادب کا جواہر پارہ۔ ترتیب و تدوین اور اسلوب بیان کے اعتبار سے بے نظیر ہے۔ ان افسانوں میں زندگی ہے لطافت ہے۔ واقعیت پسندی ہے اور سماج کے دل کی دھڑکنیں ہیں۔ ماہر کی زبان اردوئے معلیٰ کا دلپذیر نمونہ ہے۔ اس مجموعہ میں ماہر القادری کا افسانوی آرٹ پوری تکمیل کے ساتھ نظر آتا ہے۔ طباعت نظر نواز کتابت نظر فریب اور ترتیب نظر افروز ہے۔ کیا آپ کتب خانہ اب تک اس انمول ادبی تحفہ سے محروم ہے

قیمت
فی جلد دو روپے (عہ)

ملنے کا پتہ

مشہور پبلشنگ ہاؤس اردو بازار دہلی

سلوٹیں

اشعر ملیح آبادی

تم نے پھر مجھ سے کیا ہے وہی بے ربط سوال
"تم جب آتے ہو مرے پاس۔ مجھے دیکھتے ہو
میں سمجھتی ہوں کہ خوش ہوگے۔ ہنسوگے شاید
تم مگر چپ سے۔ فسردہ سے نظر آتے ہو
سلوٹیں سوچ کی ڈالے ہوئے پیشانی پر
میں سنوں۔!! مجھ کو بتاؤ کہ تمھیں غم کیا ہے؟"

ہاں مری مونس و غمخوار! محبت کی امیں!
بارہا تم نے کیا مجھ سے یہ بے ربط سوال
اور کچھ سوچ کے ہر بار میں خاموش رہا
اب سنو!! تم کو بتاتا ہوں مجھے غم کیا ہے
آج تک میں نے کئی بار محبت کی ہے
نوجواں، پاک امنگیں مرے دل میں بھی اٹھیں
آہ لیکن یہ زمانہ!۔ یہ زمانے کے خدا
سب نے ہر بار مرے عشق کو بدنام کیا
اور انجام!! وہی یاس۔ وہی تنہائی
اور اب شدتِ احساس سے ہوں نالہ بلب

میری دنیا میں مسرت کی کرن ہے معدوم
بے لسبی چار طرف سے مجھے جکڑے ہے ابھی
یہ مرے گرد روایات کہن کے حلقے
یہ رسومات کی ہر بات میں ٹیڑھی چالیں
گردِ اوہام میں لپٹی ہوئی اندن دنیا
مجھ سے دیکھے نہیں جاتے یہ زمانے کے چلن
سوچتا ہوں کہ بدل جائے یہ فرسودہ نظام
اور اس رات کی تابندہ سحر سے پھوٹے
مسکراتی ہوئی ہنستی ہوئی اک سرخ کرن

تم سے مل کر مجھے تسکین تو ہو جاتی ہے
پھر بھی میں سوچتا ہوں سوچتا رہتا ہوں مدام
پھر نہ یہ پاک محبت کہیں رسوا ہو جائے
جس کا انجام جدائی ہو۔ فراموشی ہو
تم نہ افسردہ ہو! شکوہ نہیں مجھ کو تم سے
سلوٹیں ہیں مرے ماتھے کی۔ تفکر کا نشاں
آتشِ زیست کے بھڑکے ہوئے شعلوں کا دھواں

انتظار

الطاف پرواز

آج کا دن بھی اسی طرح گذر جائے گا
آج کے دن بھی نسیمی کو نہیں آنا ہے
آج بھی میرے مقدر کو ستم ڈھانا ہے؟
لذّت درد کا شیرازہ بکھر جائے گا؟
ایک منصوبہ خیالات میں مر جائے گا!

بارہا وقت کے جھونکوں نے بجھائے ہیں چراغ
بارہا ٹوٹتے دیکھے ہیں ستارے میں نے
پائے ہیں سرمئی آنچل کے اشارے میں نے
جگمگایا ہے کئی بار مرا کنجِ دماغ
ہاں مگر آج نہ پاؤں گا نسیمی کا سراغ

پاٹ کر تیرہ خلاؤں کو چلی آتی تھی
اپنی آغوش کو کھولے ہوئے مانندِ نسیم
مسکراتی ہوئی، بل کھاتی ہوئی میری ندیم
خواب بن کر مرے ماحول پہ چھا جاتی تھی
شمع بن کر مرے لمحات کو چمکاتی تھی

اُس کے حالات بدلتے ہوئے دیکھے تو نہیں
کون سی مصلحتِ تازہ نے آگھیرا ہے؟
اس کے احساس پہ چھایا ہوا اندھیرا ہے!
انقلابات سنبھلتے ہوئے دیکھے تو نہیں
تیر سینے سے نکلتے ہوئے دیکھے تو نہیں

سوچتا ہوں کہ بدل سکتی ہے تقدیرِ نظر
پھر نسیمی مرے ماحول پہ چھا سکتی ہے
روح، پھر گیت مسرّت کے سنا سکتی ہے
شب کے پُرہول مکاں سے نکل آئے گی سحر
یا ابھی دور رہے گا مری آہوں سے اثر

—(۶)—

غنچے خاموش ہیں، افسردہ ہے پھولوں کی قطار
آج کا دن بھی اسی طرح گذر جائے گا

شاہد ادیب

شام سویرا

زندگی کی ایک اندھیری شام تھی۔ گہری تاریکی گھنائو بان دھیرا جیسے فاقہ زدہ ہندوستانیوں کی نیلی کالی آنکھیں فضا میں معلق ہوں۔ اور یہ گردش کرتی ہوئی ٹھوس تاریکی کے دیواروں کے مابین قید چین دیا گیا ہو۔ دنیا ناچ رہی تھی۔ دن سے رات۔ رات سے دن۔ لیکن اس کی خوشیوں کا نشاط کامرانی کا سورج کب کا ڈوب چکا تھا اور وہ یونہی آنکھیں پھاڑے گہری تاریکی میں گم شدہ روشنیٔ حیات ڈھونڈتا رہا۔

وہ صبح اس کی زندگی کا سویرا تھی جب روفی اس کی زندگی اور خیالات کے اُفق پر زریں چاند کی طرح طلوع ہوئی۔ وہ زندگی کی ڈگر پر 'محبت' 'حسن' کے جام لئے دوڑتا رہا۔ وہ جاننا چاہتا تھا آخر محبت و حُسن ہے کیا؟

بہت دنوں بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچ سکا کہ شاید حسن کے سینے میں محبت' کی رُوح ہوتی ہے اور محبت کے سینے میں حسن کی'..... زندگی کے ایام میں حسن سورج کی کرنوں میں فنا ہو جاتا ہے۔ دن اور رات اسے کھا جاتے ہیں۔ زمین اُسے اپنے آغوش میں سمیٹ لیتی ہے۔ لیکن محبت ایک لافانی شے ہے۔ اس لئے وہ محبت کا پرستار اندھا ہو جانے کے بعد بھی آنسوؤں کے پھول حسن کے دیوتا پر نچھاور کرتا رہا۔

روفی اس کے مکان کے مقابل کمرے کے حریری پردوں سے جھانکنے والی ایک حسین لڑکی جس کی آنکھوں میں اتنی تابانی تھی جیسے ستاروں کی دنیا آباد ہے۔ اور وہ چاہتا ان ستاروں کی دنیا میں فنا ہو جائے ان آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوب جائے۔ وہ آنکھیں بہت دنوں تک اس کے ذہن و احساس پر چھائی رہیں۔ وہ چاہتا کہ ان آنکھوں کی روشنی اس کی آنکھوں میں منتقل ہو جائے۔

روفی جب گنگناتی تو عمر خیام کی رباعی کی جنت میں کھو جاتا...

اور وہ سوچتا عورت بھی عمر خیام کی ایک رباعی ہے۔ جو اپنے شعری دنیاؤں میں ایک جنت آباد رکھتی ہے۔ ایک خوبصورت سی جنت۔

پھر ایک دن دوپہر کے سناٹے میں دو پنکھڑی سے لب وا ہوئے اور آواز' جیسے دور بہت دور صبح کی ہلکی ماندہ روشنی اور ہلکی ہلکی تیرگی کے درمیان کسی مندر کی گھنٹیاں بج اٹھی ہوں۔ یا حسین ساز پر کسی رقاصہ کے پائل۔ یہ وہ آواز تھی جب روفی نے اپنے بالاخانہ پر آ کر کہا تھا "آپ بہت پریشان رہا کرتے ہیں۔" اور جملہ اس طرح ادا کیا گیا تھا جیسے وہ دونوں برسوں کے ملاقاتی ہوں۔

'آپ'؟ ..... وہ چونک پڑا۔

'جی میں'! اس نے مسکراتے ہوئے طنزیہ کہا۔

'میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں' مسکراتے ہوئے لبوں نے سوال کیا'

'جی مجھے راشدی کہتے ہیں'

' اور مجھے روفی۔ پھر دوپہر کے سناٹے میں وہ دور چلی گئی۔ اور چوڑیوں کی لاہوتی جھنکار۔ اس کے کانوں میں بہت دیر تک بجتی رہی۔

اس کے بعد اس کی دوسری دنیا تھی اور وہ! ..... وہ دنیا جو اس نے آنکھوں کی محبت سے بنائی تھی۔ اثر سے بنائی تھی۔ جذبات و تخیل سے بنیاد رکھی تھی۔ اُف کتنی مقدس تھی اس کی دنیا۔ اور وہ مقدس آنکھیں آئینہ دیکھتے وقت اس کا جی چاہا کہ اپنی آنکھوں کو بوسہ دیدے۔

اس کی محویت بڑھتی رہی۔ وہ سوائے روفی کے کبھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ روفی اس کے لئے مستقل اور اٹل 'سورج' بن گئی تھی روفی اس کے لئے ایک دنیا تھی۔ ایک جنت' اور ایک حسین کا مرقدؔ

وہ سوچتا اگر اُسے روفی کی قربت حاصل ہو جائے تو وہ ستاروں کی دنیا تک بآسانی پرواز کر سکتا ہے۔ وہ کھلی فضا میں کھڑے کھڑے کبھی کبھی سوچتا اگر سارے ستارے اکٹھے ہو جائیں تو روفی کی حسین شکل اختیار کر سکتے ہیں اور بہت دنوں تک جھری پردوں سے جھانکنے والی شرمائی شرمائی سی لڑکی برابر دوپہر کے سناٹے میں اس کے تخیلاتی قصر میں نقب زنی کرنے آجاتی۔ اور اس کی آنکھیں جب روفی کو ایک بار دیکھ لیتیں تو وہ سمجھتا کہ چور پکڑا گیا ہے۔ ایک حسین چور جس کی ہر ادا ایک جال ہے۔ ایک ڈوری ایک کڑی اور وہ اس دم محسوس کرتا ہے کہ روفی کی آنکھوں سے نکلنے والی چمک نے محیط ہو کر اُسے مقید کر لیا ہے۔

دوپہر کا سناٹا ہوتا اور دو دلوں کی دھڑکن، بہت صاف سنائی دی جاتی والی تو وہ ہر دم محسوس کرتا کہ وہ بہت زیادہ جذباتی بن گیا ہے۔

اُف۔ وہ سوچنے کا کس قدر عادی بن گیا تھا۔ اندھیری راتوں میں وہ سوچتا۔ روفی ایک چاند ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی میٹھی میٹھی ہلکے ہلکے کیف و خمار کا مجموعہ اور جب وہ چاندنی راتوں میں روفی کے بارے میں سوچتا تو وہ بھٹکنے لگتا۔ دور بہت دور ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے وہ حسین ریشمی بادلوں میں کھو جاتا۔ پہاڑ کی چوٹیوں پر پہونچ جاتا۔ عطر بیز ہواؤں سے لطف اندوز ہوتا ہوا۔

اور جب وہ سو جاتا تو اُسے محسوس ہوتا کہ روفی چاندنی بن کر اُس کی آنکھوں میں سما گئی ہے۔ شام کو جب وہ سوچتا تو خیال کرتا روفی مرمر کا مجسمہ ہے۔ تو تاریکی بھی نشان وجود نہیں کھو سکتی۔ اور جب صبح ہو جاتی اور کھڑکی سے آنیوالی ہوا کے لمس سے وہ جاگتا تو اس کے ذہن میں ہزاروں نیلے پیلے ہرے ہرے پھول کھل اُٹھتے اور وہ سوچتا روفی سُرخ و سپید گلابوں کا مجموعہ ہے شبنم سے دھلا ہوا، تازہ بہت تازہ۔

پھر ایک دوپہر کے سناٹے میں وہ اُسے بہت قریب سے دیکھ سکا۔ جبکہ روفی چمکتے ہوئے سورج کی کرنوں میں ہیلن کا مجسمہ معلوم ہو رہی تھی۔ وہ چپکے چپکے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لیکن جب اس کی نظریں راشدی سے ٹکرائیں تو محجوب سی ہو گئی۔ جانے کے لئے پلٹی، لیکن آج ہمت کر کے راشدی نے اُسے پکار ہی لیا۔ 'روفی'! اور وہ ٹھٹک گئی۔

'کیا ہے؟' وہ مسکرا دی۔

'تم اب تک مجھ سے اتنی دور ہو کیوں؟'

'میں کیا بتا سکتی ہوں'۔ وہ یک لخت سنجیدہ بن گئی۔

'تمہارے دل کی دھڑکن میں بہت قریب سے سنتا ہوں تمہارے گلگوں رخساروں کی حدت مجھ تک پہنچتی ہے۔ تمہاری آنکھیں ہر دم ایک فسانہ پیش کرتی رہتی ہیں۔ پھر یہ دوری۔ ... بانو' یہ دوری میرے لئے بہت جان لیوا ہے۔ وہ ہمت کرتے ہوئے بہت کچھ بول گیا'

'یہ تو میں بھی سوچتی ہوں۔ وہ دوپٹہ مروڑتے ہوئی بولی۔

روفی! کسی نے آواز دی۔

'وہ گھبرا کر پلٹی۔ اچھا خدا حافظ۔ اور جب اُس نے آنکھیں اُٹھائیں تو اس کی پلکوں پر آنسوؤں کے قطرے چمک رہے تھے۔

اس کے بعد وہ ہر روز دوپہر کے سناٹے میں دو دو باتیں کر جاتی۔ جو اس کے لئے تسکین کا باعث تھے۔ لیکن وہ ابھی 'سوچ' کی سرحد سے بھی نہ گذرا تھا کہ شام ہو گئی۔ اور بہت اندازوں کے بعد بھی راستہ چلنا دشوار ہو گیا۔ وہ مختلف راستوں پر بھٹکنے لگا۔

وہ زندگی کی شام ہی تو تھی جب روفی نے سرخ سرخ تمتمائے ہوئے چہرے اور مسلسل ہچکیوں کے درمیان اُس سے کہا تھا کہ وہ بہت جلد پرائی ہو جائے گی۔

اُس دن سے وہ پاگل سا بن گیا۔ روتے روتے آنکھیں سجالیں۔ وہ اُمیدوں کا پودا جو اس کی نگاہوں کے سامنے پروان چڑھ رہا تھا یک بیک حالات و لمحات کی بجلی نے گر کر خاکستر سے بدل دیا۔ وہ سوچتا کاش روفی اس کی زندگی میں داخل ہی نہ ہوتی۔ وہ یونہی آزاد ہوتا۔ ... ایک مجبور لڑکی جو پابند دنیا ہے۔ پابند والدین ہے جس کے لبوں پر شرم حجاب کے قفل لگے ہیں۔ اُسے حق ہی کیا ہے کہ کسی کی زندگی ویران کر دے۔ اُسے حق ہی کیا ہے کہ وہ کسی کو اپنا کہے۔ اُسے لڑکیوں پر بیحد غصہ آرہا تھا۔ پھر مسلسل اس نے دو ماہ گذار دئے۔ تھکے تھکے لمحات ٹوٹے ہوئے دل۔ روتی آنکھیں۔ بیتاب دل۔ بے چین راتوں کے سناٹے۔ لیکن پھر دوبارہ روفی اُس سے نہ مل سکی۔ کچھ دنوں بعد اُسے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ بیمار رہنے لگی ہے۔ پھر ایکدن اُس نے اُس کے فیملی ڈاکٹر سے سُنا کہ اس کی حالت اب بہت نازک ہے۔ اس دن سے وہ دل و جان سے دعائیں کرنے لگا۔ لیکن اُسکی دعائیں صحت دینے والے خدا تک نہ پہنچ سکیں۔ اور آخر ایک شب روفی اپنے جسم کو چھوڑ کر چلی گئی۔ رات کے ہنگامہ

سوزِ ناتمام

امید رضوی

رخصت اے دوست کہ ہنگام سفر آ ہی گیا

زیست دشوار بہر گام ہوئی جاتی ہے   زندگی زہر بھرا جام ہوئی جاتی ہے
پھیر لے اپنی نظر، چھوڑ دے میرا دامن!   دور جانا ہے مجھے شام ہوئی جاتی ہے

رخصت اے دوست کہ ہنگام سفر آ ہی گیا

مجھ سے مت پوچھ کہ اس دنیا میں کیا دیکھا ہے   میں نے کیا کیا یہاں کھویا یہاں کیا پایا ہے
کیا سناؤں تجھے افسانۂ بزم ہستی   کیا بتاؤں میں تجھے حاصل دنیا کیا ہے
یہ غم و درد کی محفل، یہ جہانِ پستی   رنج و آفات کی دنیا یہ دکھوں کی بستی
جور و بیداد کے ہونٹوں پہ سفاک ہنسی   خون آشام درندوں کی یہ بیدادگری
بزم انسانی پہ چھایا ہوا یہ ابر ملال،   ارتقائے بشریت کا یہ مایوس زوال
زندگی کچلی ہوئی، غیروں کی ٹھکرائی ہوئی   غم و آلام کی چادر میں یہ کفنائی ہوئی
رنج ناداری کی ماری ہوئی بزم انساں   صبح امید پہ چھائی ہوئی شام حرماں
نیم جاں فاقوں سے انسان، غموں کے پیکر   زندگی مردۂ صد سالہ سے جن کی بدتر
یہ مناظر یہ سسکتی ہوئی زندہ لاشیں   بھوک کی ماری بلکتی ہوئی زندہ لاشیں
یہ بلکتے ہوئے بچے یہ سسکتی مائیں   دکھ کی ماری ہوئی آلام زدہ بیوائیں
یہ ٹھٹھرتے ہوئے انسان یہ مجبور بشر!   ہر قدم ٹھوکریں کھاتے ہوئے مقہور بشر
یہ گذرگاہوں میں راہوں کے کنارے انساں   غربت و درد کے افلاس کے مارے انساں
پائے انساں میں غلامی کی یہ زنجیر گراں   موجزن آنکھوں میں اشکوں کا یہ دریائے رواں
یہ زباں بندیاں ہر گام پہ انسانوں کی   شہر جلتے ہوئے۔ اشکال ہیں ویرانوں کی
جور و بیداد کا یہ ہر طرف آئین و نظام   قتل و غارت کے یہ ہر سمت سے پھیلے ہوئے دام
ذرہ ذرہ پہ یہ تصویر غلامی کے نقوش   چہرۂ زیست پہ یہ مرگِ دوامی کے نقوش
لبِ مظلوم پہ فریاد کا سیلاب عظیم   لب کشائی پہ یہ پابندیٔ "دستور قدیم"
یہ امنڈتا ہوا طوفان جہانبانی کا   اور ہر چہرہ مرقع سا پریشانی کا
زرد و کمزور نقاہت سے جوانانِ وطن!   بادِ افلاس سے مرجھائے ہوئے غنچۂ دہن
سرِ بازار یہ لٹتا ہوا تاجِ عصمت   منہدم ہوتا ہوا راہوں میں قصر عفت
ہر طرف شور ہے اقوام کو غارت کر دو   بند انسانوں پہ دروازۂ راحت کر دو
کتنی بے جان سی لاشیں ہیں گذرگاہوں میں   کتنے خوابیدہ فسانے ہیں خزیں آہوں میں

ایسی پرخار گذرگاہ سے گذرنا ہے مجھے
ڈوب کر پستیوں میں پھر سے ابھرنا ہے مجھے

دو نظمیں

زندگی کا پھول

علی احمد بی اے

آسمان کے نیچے میری زندگی اک پھول تھی
اس پہ تیری دھوپ چمکی چند گھڑیوں کیلئے
کھل گیا یہ پھول لیکن جلد ہی مرجھا گیا
لیکن اس برباد و ویراں گل کی اک اک پنکھڑی
آج تک رکھتی ہے سینے میں وہ گرمی دھوپ کی

انتظار کی تھکن

جب ترے آنے سے ناامید ہو جاتا ہوں میں
ایک اک کر کے بالآخر ٹوٹ جاتی ہر اک آس
گہری ہو جاتی ہیں میری یاس کی تاریکیاں
اور کچھ بوجھل سا ہو جاتا ہے دوشِ زندگی
اک عمیق و سرد حیرت دل پہ چھا جاتی ہے اور
نبض کی آتی ہے یوں آواز میرے کان میں
جیسے رقاصہ کے مانند پاؤں میں گھنگرو کی لے

بہارِ نو

اقبال خلیلی

رہینِ حسرت و ارماں بنا کے چھوڑ دیا
تری نگاہ نے عنواں بنا کے چھوڑ دیا
مری حیات تری کم نگاہیوں پہ نثار
ہر اک خلش کو رگِ جاں بنا کے چھوڑ دیا
وہ دردِ کون و مکاں جس کی تاب لا نہ سکے
اسی کو دل کا نگہباں بنا کے چھوڑ دیا
ترے تبسمِ رنگیں کا عکس کیا کہنا
کلی کلی کو گلستاں بنا کے چھوڑ دیا
چمن سے پوچھیئے فصلِ بہار کی قیمت
گلوں کو چاکِ گریباں بنا کے چھوڑ دیا
جمالِ جلوہ گہِ ناز ہم بھی دیکھ آئے
نظر کو شمعِ شبستاں بنا کے چھوڑ دیا
مذاقِ عشق تری وسعتوں کی عمر دراز
لہو کی بوند کو طوفاں بنا کے چھوڑ دیا
نوازشِ نگہِ ناز کو خدا رکھے!
فریب خوردۂ ارماں بنا کے چھوڑ دیا
ملا کے ان سے نظر اور کیا ملا اقبالؔ
یہی ہوا کہ پریشاں بنا کے چھوڑ دیا

فاطمہ بیگم دلسرین منشی فاضل

کہاں سے کہاں؟

دل چاہتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

سورج کی کرن پھوٹنے سے پہلے صبح کے سہانے وقت میں سہاگ پیتل کی چمکیلی چھوٹی تھالی میں پھول رکھ کر مندر میں گئی کہ اپنے دیوتا کے چرنوں میں عقیدت کی نذر پیش کر سکے لیکن وہاں پہنچکر اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا مندر میں اداسی چھائی ہوئی تھی اور موجیں مارتا ہوا دریا چپکے چپکے بہے جا رہا تھا اس کا پردیسی سادھو آج وہاں نہ تھا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پھول چڑھائے اور دھیرے دھیرے مندر سے باہر نکلی جیسے اس کے پیر من من بھر کے ہو گئے تھے اس کے دل میں ایک کسک سی اٹھی اس نے سوچا کہ اس کا سادھو کیا غائب ہو گیا؟ اس نے تو کہا تھا کہ اب وہ یہاں ہی رہ کر اپنے بنانے والے کو یاد کرے گا۔ پھر اس نے اپنا وعدہ کیوں بھلا دیا؟

شاید جنگل میں کسی طرف چلا گیا ہو پھر آ جائے گا۔ یہ سوچکر اس کی آس بندھی اور روندھے ہوئے دل اور بھاری قدموں کے ساتھ گھر واپس آئی۔ آج اس کا دل اداس تھا نہ جانے کیوں؟ وہ دن بھر منہ لپیٹے پڑی رہی ماں نے کہا بھی کہ بیٹی کھانا کھا لے لیکن اس نے طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کر دیا۔

شام کو وہ پھر گھڑے لے کر گھاٹ پر گئی۔ اب تو ضرور اس کا پردیسی سادھو واپس آ گیا ہوگا۔

لیکن اب بھی مندر سنسان تھا اور گھاٹ بھائیں بھائیں کر رہا تھا دریا چپکے چپکے بہے جا رہا تھا ہوا دھیرے دھیرے سسکیاں لے رہی تھی۔

اس نے سوچا شاید موجوں نے اپنے چنے ہوئے آنچل میں چھپا لیا ہو۔ درختوں کے جھنڈ میں ڈھونڈھا شاید وہاں بیٹھا ہو۔ مندر کے آس پاس چپہ دیکھ ڈالا لیکن سب بیکار وہ اداس ہو گئی اور بڑی بڑی ہرنی جیسی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے دل میں ایک بے چین کر دینے والی کسک اٹھی دنیا اس کی آنکھوں میں اندھیری ہو گئی جیسے اس کا سب کچھ چھین لیا گیا ہو۔ زندگی کا سہارا توڑ کر پھینک دیا گیا ہو۔ وہ نہ جانے کب تک گھڑے پر ہاتھ رکھے سر جھکائے روتی رہی۔

———:•:•:•:———

بہت دن بیت گئے تھے آج پھر چودھویں کا چاند مسکرا رہا تھا اور دودھ کی طرح صاف سفید چاندنی شاعر کے تخیل کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ تارے جگمگا رہے اور عطر سے لیے ہوئے ہوا کے جھونکے پھولوں سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ آج پھر اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ دل تڑپ گیا وہ بے چین ہو گئی دبی ہوئی چنگاری بھڑک کر آگ بن گئی۔ پردیسی پریتم کی یاد ساون کی گھٹا بن کر دل پر چھا گئی اور آنکھوں سے بھادوں کی جھڑی لگ گئی ہائے وہ کہاں گیا۔ ساری دنیا سونی ہو گئی۔

پوجا کے لئے اس نے جو پھول چنے تھے وہ بیخودی اور وارفتگی میں آنچل سے نکل کر زمین پر بکھر گئے اور اس کو خبر بھی نہ ہوئی۔ کسی کی یاد نے اس کے دل کے تار کو بری طرح توڑ دیا تھا بہت سی باتوں نے اس کو خوب رلایا تھا۔

بیچاری سہاگ نے اس رات کو پلک تک نہ جھپکائی۔ اس کی مدھ بھری آنکھوں میں کوئی مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ دیکھو سہاگ میں پردیسی ہوں سادھو ہوں۔ مجھ سے کیسا پریم؟ پر میرے دل میں بھی ایک کونا ہے اس میں ایک بت ہے جانتی ہو کس کا بت؟

پھر اس نے سوچا کہ پردیسی نے اس کو دھوکا دیا۔ آنکھوں آنکھوں میں کیا کیا وعدے کر کے اور دلکش باتوں سے دل لبھا کر بھول گیا۔ تو میں اس کو کیوں یاد رکھوں ۔ ۔ ۔ ! کیوں اپنے دل کو اس کی یاد اور غم کے لئے سونپ دوں میں بھی اس کی یاد کو کچل کر پھینک دوں گی جب اس نے میرا دل کچلا ہے

لیکن دل کو اس تسکین اور بحث کے بعد بھی وہ اس کو نہ بھلا سکی جب مندر میں پھول چڑھاتی گھاٹ کے پاس والے پتھر پر بھی پھول رکھتی اس کو دھوکر

صاف کرتی اور آنسو کے ہار چڑھاتی۔ جیسے تو اس کا پردیسی پریتم لیٹا رہتا تھا۔ ہوا بند ہوتی تو اس کا سینکڑوں سے بنایا ہوا پنکھا جھلنے لگتا۔ چاندنی رات پر ہوا نہ جانے کیا گنگناتا۔ جب آسمان پر بھورے بھورے بادل آتے۔ ہوا کے جھونکے دل کا کنول کھلانے لگتے تو وہ اپنی بانسری لے کر دور چلا جاتا اور پہاڑ کی ایک چٹان پر بیٹھ کر بجانے لگتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ زمین و آسمان اس کے قدموں پر سر جھکا رہے ہیں اور فضا جادو بھرے نغموں کے اثر سے مرتعش ہے۔ اگر صبح کو اسے مندر تک آنے میں دیر ہوتی تو وہ ایسی نظروں سے سہاگ کو دیکھتا جیسے کہتا ہو معاف کرنا، بڑی تمہیں تکلیف ہوئی۔

سہاگ کو وہ پیپل کا درخت بھی بہت عزیز تھا جس کے نیچے بیٹھ کر وہ کی روٹی بناتا تھا۔ وہ تُلسی کے پودے کو روزانہ سفید مٹی سے لیپ پوت کر چمکاتی اور جب دل بہت بھر آتا، آنکھیں بوجھل ہو جاتیں تو وہ چولہے پر سر رکھ لیتی جو پردیسی کی یادگار تھا۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے۔ اس کو کچھ تسکین ہوتی اور وہ محسوس کرنے لگتی کہ اب وہ اپنے پریتم سے قریب ہو گئی۔ اب وہ اس کے پاس ہے جیسے یہ مسکراتا ہوا چاند لیکن اسے پکڑ کون سکتا ہے؟ کون تاروں تک پہنچ سکتا ہے! بس اس کے خیال سے خوش ہو لے اور سمجھ لے کہ یہ تاروں بھرا آسمان اس کے آنچل میں ہے۔

اب یہ زندگی اپنی نہیں، دی ہوئی چیز پرایا، اس کا کیا اختیار؟ مالک کی مرضی جیسا چاہے رکھے۔

وہ اسی طرح بیٹھی نہ جانے کیا کیا سوچ رہی تھی جیسے ساری دنیا کو بھول گئی تھی۔ نہ اس نے کھانا بنایا اور نہ دریا سے پانی لانے گئی۔ آنگن میں طوطے کا پنجرا ویسے ہی رکھا تھا۔ بیچارہ پنچھی ٹیں ٹیں کر کے کہہ رہا تھا کہ اس کا پنجرا چھپر میں لٹکا دے لیکن وہ ساری سدھ بدھ بھولی ہوئی تھی۔ جب بلی اندر رکھی ہوئی دودھ کی ہانڈی گرا کر بھاگی تو وہ چونکی اور اندر کی طرف چلی۔ مگر سل سے ٹھوکر کھا کر وہ گرتے گرتے بچی۔

———:•:•:———

اب اس کا خدا کی عبادت میں بہت دل لگتا جس کو ڈھونڈنے میں اس کا پردیسی ساجن اسے مل گیا تھا۔ وہ خدا سے محبت کرتا تھا اس لئے وہ کیوں نہ اپنے محبوب کے محبوب سے محبت کرتی! وہ خدا سے التجا کرتی کہ وہ اس کو سکون دے۔ اس کی روح کو اپنی طرف کھینچ لے اس کے دل کو اپنی محبت سے بھر دے۔

اسے کو اب نہ کھانے کی پرواہ تھی نہ کسی بات کی۔ جب پیپل کے درخت کے نیچے پڑی رہتی اس کی بے چینی اور تڑپ اب کم ہو گئی تھی اس کو اس خیال سے تسکین ہوتی کہ اب اس نے اس کو پالیا جس سے اس کا پریتم پریم کرتا تھا۔ وہ کبھی الگ نہیں ہوتا، جھوٹے وعدے نہیں کرتا۔ ہر وقت ہر دکھ درد میں شریک رہتا ہے۔

———:•:•:———

ایک بہار آفریں شام کو وہ مندر میں پھول چڑھا کر اور اپنے پردیسی سادھو کے پتھر کے آسن کو دھو کر پھول چڑھا کر پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھی عبادت اور اپنے بنانے والے کی یاد میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس کا کھویا ہوا سادھو، اس کا بھولا بھٹکا راہی اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے پکارا سہاگ! میں ہوں سہاگ۔

سہاگ نے آنکھیں کھول کر دیکھا اس کے سامنے اس کا کھویا ہوا پریتم کھڑا تھا۔ آنکھوں میں وہی جادو۔ ہونٹوں پر وہی میٹھی مسکراہٹ۔ سہاگ تڑپ گئی۔ اس نے کانپتے ہوئے کہا۔ پریتم! اب مجھے کچھ نہ یاد دلاؤ۔ میں نے سب کچھ پالیا ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔ میری زندگی اور میرا دل سکون اور اطمینان سے بھرا ہوا ہے۔ بس اب تم چلے جاؤ ناتھ۔ اور مجھے اکیلی چھوڑ دو۔

اس کے بعد سہاگ نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے پریتم نے پھر اس کو پکارا لیکن اس کا پنچھی اپنے حقیقی محبوب کے پاس جانے کے لئے پنجرے کی تیلیاں توڑ کر اڑ چکا تھا۔

ع۔ طاقت کہاں کہ دید کا احسان اٹھایئے

دوگانے

ناصر انصاری

رقص فرما ہیں فضاؤں میں گھنیری بدلیاں
نُقرئی بجلی چمکتی ہے افق پہ بار بار
بام و در اوڑھے ہوئے ہیں سُرمئی کُہرے کی ردا
دامنِ موجِ ہوا میں ہے طرب آگیں پھوار

بادۂ انوار سے پُر ہیں ستاروں کے ایاغ
کھیلتی ہے شاہراہوں پر شگفتہ چاندنی
پڑ گئی ہے جان سی مُردہ خس و خاشاک میں
تیز دھارے کی طرح بہتی ہے موجِ زندگی

کیف میں ڈوبی ہوئی ہے سارے عالم کی فضا
نیلگوں آکاش پر ہے مُسکراتی کہکشاں
جھانکتا ہے اِک دریچے سے سنہرا ماہتاب
دیکھتا ہوں فرش پر انوار کا سیلِ رواں

یُوں ترا حُسنِ سادہ و معصوم
میرے تخیّل سے نکھرتا ہے
کوئی نقاشِ کورے خاکے میں
جس طرح شوخ رنگ بھرتا ہے

دل کے پردے پہ رقص فرما ہے
اے حسیں مُطربہ تری تصویر
جس طرح شام کے دھندلکوں میں
نکھرے تاروں کی کانپتی تنویر

کس نے روکا درد کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو
کون آیا پھر مرے دل میں بہاروں کی طرح
کسنے بخشی پھر مری تیرہ شبی کو چاندنی
آرزوئیں مُسکراتی ہیں ستاروں کی طرح

(شفیق پاکستانی تحریر موند)

پوری اور کچوریوں کا ذئت کراتستہ کیا۔ وہاں سے دلی دروازے ہوتے ہوئے مٹکوں والی درگاہ پہونچے۔ نذیر کے بھائی مسعود غالبًا پہلی دفعہ دلی آئے تھے۔ دور ہی سے ہزاروں مٹکے دیکھکر کہنے لگے

مسعود:۔ یہ کیا چیز ہے؟

نذیر:۔ درختوں اور بانسوں اور بلیوں پر مٹکے لٹکا رکھے ہیں۔ یہاں لوگ منت مانتے ہیں۔ اور جب مراد پوری ہو جاتی ہے تو مٹکے چڑھا دیتے ہیں۔

مسعود:۔ بے شمار مٹکے ہیں۔ کیا ٹھیک ہے۔ اور یہ چیکدار مٹکے کیسے ہیں جن پر نگاہ نہیں ٹھیرتی۔

قاسم:۔ یہ تانبے کے ہیں قلعی دار۔ صاحب استطاعت لوگ تانبے کے بھی چڑھاتے ہیں۔

مسعود:۔ اور کوئی رات بے رات آن کرلے جائے تو۔ یہ جگہ تو بستی آبادی سے دور ہے۔

منصور:۔ چور ڈاکو منت مراد کی چیز پر ہاتھ نہیں ڈالتے۔ یہی بات ہے جو آج تک کوئی مٹکا چوری نہیں ہوا

درگاہ دیکھ دیکھ کر یہ لوگ پرانے قلعے گئے۔ وہاں سے ہمایوں کا مقبرہ، درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء دیکھتے ہوئے منصور کے مقبرہ پہنچے وہاں سے سیدھے قطب صاحب گئے۔ سب سے پہلے کھانا کھایا پھر لاٹ کے نیچے آکر ہری ہری گھاس کے فرش مخملیں پر بیٹھ گئے اور ذات باری کی صنعت گری کا تماشہ ہر روپ میں دیکھنے لگے۔

عورتیں رنگین ملبوسات میں جیسے اڑتی تتلیاں برسات میں
ہر طرف جلوہ ہے اور رنگ حیات رقص کرتی پھر رہی ہے کائنات

ان لوگوں کو یہاں بیٹھے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ منصور نے کہا۔

منصور:۔ لو وہ آگئے

نذیر:۔ کون آگئے؟

منصور:۔ چقماق

قاسم:۔ مولوی چقماق؟ کہاں ہیں؟

منصور:۔ وہ رہے وہ سامنے

نذیر:۔ چلو دل لگی رہے گی

منصور:۔ کوئی ایسی ویسی بات نہ کہہ بیٹھنا۔ جھاڑ دے گا۔

اتنے میں مولوی چقماق قریب آگئے۔ منصور اور نذیر نے بیک آواز "آداب عرض ہے" کہا۔ چقماق بغیر جواب دیئے وہیں گھاس پر بیٹھ گئے۔ اور کہنے لگے۔

چقماق۔ تربیت کا قصور ہے، تربیت کی خامی ہے۔ سب دوست ان کا منہ تکنے لگے۔

چقماق:۔ تربیت۔ تعلیم۔ تجربہ۔ انسانی زندگی کے لئے لازمی چیزیں ہیں۔ مگر سب سے پہلی چیز تربیت ہے۔ تعلیم اور تجربہ یہ بعد کی چیزیں ہیں۔ جس کی تربیت اچھی ہو گئی تو سمجھو اس کی زندگی سدھر گئی۔

منصور:۔ تو حضور ہم پر خفگی کا کیا سبب ہے ہم نے کیا کیا؟

چقماق:۔ یہ کہاں کا اخلاق ہے کہ دور ہی سے "آداب عرض" کا جوتا میرے مغز پر دے مارا۔ کھڑے نہیں ہوئے ہاتھ نہیں ملایا بس ایک گولہ سا دے مارا "آداب عرض ہے"۔ اجی، تربیت ملی ہوتی تو سلام علیکم کہتے۔ یہ آداب عرض کیا بلا ہے۔ ہونہہ آداب آداب۔

نذیر۔ حضور آج کل تو مہذب لوگ سب ہی "آداب عرض" کہا کرتے ہیں۔

چقماق:۔ مہذب لوگ سڑی ہوئی مچھلی اور کیڑے پڑا ہوا پنیر بھی تو کھاتے ہیں۔ عورتوں کو بغل میں لے کر ناچتے بھی تو ہیں۔ شراب بھی تو پیتے ہیں۔ مہذب۔ ہونہہ۔ مہذب۔ بیسویں صدی،

منصور:۔ حضور! ہمیں تو بچپن سے یہی سکھایا گیا ہے کہ بڑوں کا ادب کرنا چاہیئے اور آداب عرض کرنے سے اظہار ادب مقصود ہے۔

چقماق۔ کس نے سکھایا ہے۔ بیسویں صدی! "آداب عرض" سکھایا ہے! کیا معنی ہوئے "آداب عرض" کے۔ یہ عرض اور طول کیا بلا ہے؛ لغو۔ واہیات۔ بے معنی۔ سیدھی سی بات کہو "السلام علیکم" کہ سلامتی ہو تم پر اور دوسرا جواب میں کہے "وعلیکم السلام" اور تم پر بھی سلامتی ہو۔ سبحان اللہ کیسی پیاری پیاری باتیں ہیں کیسے میٹھے بول ہیں۔ جب ہی تو کہتا ہوں تربیت۔ تربیت! تربیت کی خرابی کا تربیت کا کال ہے۔ تانگے والا ہے تو تربیت سے کورا۔ نہ ہاتھ دکھاتا ہے نہ منہ سے بکتا ہے۔ سر پر چڑھائے چلا آرہا ہے۔ موٹر والا ہے تو تربیت سے عاری۔ وہ زور شور سے ہارن دیتا ہے کہ آنے جانے والے غائب ہو جاتے ہیں، آدمی اچھل پڑتا ہے۔ سائیکل والا ہے تو بھڑا کر

لئے جا رہا ہے نہ گھنٹی بجاتا ہے نہ بریک باندھتا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک تیر ہے جو چلا آ رہا ہے۔ اور پھر ذرا سی بات کہہ دو تو آستینیں چڑھا کر لڑنے مرنے کو مستعد۔ پچھتر فیصدی۔

"حضور اجازت دیں تو کچھ عرض کروں" نذیر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

چقماق:۔ فرمائیے۔

نذیر:۔ یہ حضور بار بار "پچھتر فی صدی" کیا فرمایا کرتے ہیں؟

چقماق:۔ جانتے ہو انسان کسے کہتے ہیں؟ اچھا انسان کو چھوڑو۔ انسان آج کل ہیں ہی کہاں۔ یہ بتاؤ آدمی کسے کہتے ہیں؟

نذیر:۔ آدمی؟ آدمی تو سب ہی ہیں۔ یہ کیا ادھر ادھر پھر رہے ہیں۔

چقماق:۔ ہونہہ! ادھر ادھر پھر رہے ہیں۔ ان میں کتنوں میں آدمیت ہے؟ کیا معیار ہے تمہارے پاس آدمیت کا؟ کونسی کسوٹی پر آدمی کو پرکھتے ہو؟ یا جس کی شکل آدمی کی سی دیکھی اسے ہی آدمی سمجھ لیا۔ پچھتر فیصدی۔

نذیر:۔ اب میں کیا عرض ...

چقماق:۔ آپ کیا عرض کریں گے میں ہی عرض کرتا ہوں۔ آپ لوگ سائیکلوں پر آئے ہیں۔ جی۔ شہر کے بازاروں میں سے گزرے ہیں۔ کیا دیکھا آپ نے۔

منصور:۔ کوئی خاص بات تو دیکھی نہیں۔

چقماق:۔ دیکھتے کیا خاک! بٹن لگے ہوئے ہیں آنکھوں کی جگہ۔ ارے میاں آنکھوں سے کام لینا سیکھو۔ انھیں بٹن نہ سمجھو یہ کام کی چیزیں ہیں۔ تم سائیکلوں پر چلے آئے سیدھے بغیر کسی دقت کے

منصور:۔ ابھی نذیر کی سائیکل سے تو ایک بچہ الجھ کر گرا مگر خیر گزری چوٹ پھیٹ نہیں لگی۔ اور میری سائیکل سے رکشا لڑ گئی۔

چقماق:۔ تو یہ تمہاری اور میاں نذیر کی بے پرواہی ہوگی۔

نذیر:۔ (جلدی سے) وہ بچہ آنکھیں بند کر کے سڑک کی ایک سمت سے دوسری جانب بھاگا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ ایک دم سے اس طرح بھاگے گا۔ میں نے بہت کوشش کی مگر وہ جھپٹ میں آ ہی گیا۔ اس میں میرا کیا قصور؟

چقماق:۔ اس میں نہ تمہارا قصور تھا نہ بچے کا۔ کیونکہ تم نے کوشش کی اور بچا نہ سکے اس لئے کہ تمہیں سان و گمان بھی نہ تھا کہ بچہ یوں بے تحاشا بھاگے گا۔ اور بچہ بھی بے قصور تھا اس لئے کہ آخر بچہ ہی تھا۔ قصور بچے کے باپ کا ہے کہ اگر وہ ساتھ تھا تو بچے کی انگلی کیوں نہیں پکڑ رکھی تھی۔ اور اگر ساتھ نہیں تھا تو اس قصور میں اس کی ماں بھی برابر کی شریک تھی جس نے یہ سوچ کیا کہ بس پیدا ہم نے کر دیا اب پالیں محلے والے۔ پچھتر فیصدی! اور وہ رکشا کا کیا قصہ ہے؟

منصور:۔ حضور میں تو اپنے بائیں سے جا رہا تھا۔ وہ رکشا والا موٹر سے بچنے کے لئے دائیں پر آ گیا اور سائیکل سے لڑا دی۔

چقماق:۔ نہ تمہیں اتنی توفیق ہوئی کہ اتر پڑتے کیونکہ تم تو قسم کھا کر چلے تھے کہ چاہے جتنی بھیڑ ہو اترنے ہی نہیں دیں گے۔ اور رکشا والے تو پھر رکشا والے ہی ہیں۔ اور ایک رکشا والے پر کیا منحصر ہے۔ تم دیکھو فرعون بے سامان بنا ہوا ہے۔ تانگے والا تانگے پر ایسا بیٹھا ہے جیسے بادشاہ تخت پر۔ اڑائے چلا جا رہا ہے۔ روکنے کا نام نہیں لیتا۔ موٹر والا ہے تو ہوائی جہاز بنا ہوا ہے مگر ... ان زور زور سے بجائیگا مگر کیا مجال جو رفتار ہلکی کر دے۔ پچھتر فیصدی۔

قاسم:۔ حضور یہ بے پڑھے لکھے لوگ جاہل ہوتے ہیں۔ اور دلی میں خبر نہیں کہاں کہاں سے آن مرے ہیں۔ نرے گنوار۔

چقماق:۔ بے پڑھے لکھے، جاہل، گنوار؟ ہونہہ اور تمہارے پڑھے لکھوں میں کتنے آدمی ہیں؟ ذرا میں بھی تو سنوں۔

قاسم:۔ پڑھے لکھے تو ایسی حرکتیں نہیں کرتے۔

چقماق:۔ میں پھر پوچھتا ہوں بتاؤ آدمی کسے کہتے ہیں؟ پچھتر فیصدی! تم یہ سمجھتے ہو کہ بی۔ اے۔ ایم۔ اے پاس کر لیا تو آدمی بن گیا ع چارپائے بر و کتابے چند۔ یہ کون ہیں صاحب؟ وکیل صاحب ہیں۔ یہ کون ہیں؟ سیشن جج ہیں۔ یہ کون ہیں؟ پروفیسر صاحب ہیں۔ یہ کون ہیں؟ طوطیٔ ہند ادیب زماں مولوی فاضل جناب فلاں فلاں بی اے ہیں۔ بس تم نے سمجھ لیا کہ آدمی کیا انسان ہیں۔ کسی سے ہنس کر بولے، اخلاق سے باتیں کیں، تم سمجھ بیٹھے کہ بڑے اچھے آدمی ہیں، کیا بات ہے۔ خاندانی ہیں۔ ان لوگوں کو پڑھو سمجھ کر پڑھو تو معلوم ہوگا کتنے ان میں سے آدمی ہیں۔ اور کتنے آدمی کی شکل کے جانور

منصور:۔ حضور ہم تو سینکڑوں آدمیوں کو جانتے ہیں جو مجسم اخلاق و ایثار ہیں۔ اور میں تو انھیں انسان ہی سمجھتا ہوں۔ انسان۔

چقماق:۔ پھر وہی انسان! ارے انسان تو آج کل ناپید ہی ہے۔ مجھے آدمی دکھاؤ، آدمی۔

منصور:۔ اب آپ کو کیونکر سمجھاؤں؟

چقماق:۔ سمجھاؤ نہیں دکھاؤ۔ اچھا بتاؤ کسی کا نام لو۔

منصور:۔ ایک تو مرزا رفیع الدین صاحب ہی ہیں۔ اتنے بڑے عالم فاضل۔ عالی مرتبہ ادیب۔ بے مثال افسانہ نگار۔ بڑے پائے کے شاعر اور آسودہ حال رئیس ہونے کے علاوہ اخلاق ایسا کہ سچ مچ ہی چلا جائے تو بچھے بچھے جاتے ہیں۔ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ اتنا بڑا شخص ہے۔

چقماق:۔ ہر چمکدار چیز کو سونا نہ سمجھ بیٹھو جب تک اسے کسوٹی پر نہ کس لو۔ میں مانتا ہوں کہ اس گئی گزری دنیا میں اب بھی پچیس فیصدی آدمی موجود ہیں۔ مگر پچھتر فیصدی آدمی کی شکل کے جانور ہیں۔ نرے جانور۔ بہرحال اتنا ضرور کہتا ہوں کہ جن جن لوگوں کو تم آدمی سمجھ رہے ہو اور جن کی اپنے دل میں اس قدر وقعت رکھتے ہو، بہت ممکن ہے کہ اگر انھیں غور سے پڑھو تو ان میں سے بہتوں کو جانور ہی پاؤ۔

قائم:۔ تو حضور کیونکر پڑھیں؟

چقماق:۔ پڑھنے کے بہتیرے طریقے ہیں۔ مگر میں نے تو ایک اصول بنا رکھا ہے۔

نذیر:۔ ہمیں بھی وہ اصول بتا دیجئے۔

چقماق:۔ سنو! اللہ پاک نے آدمی میں جذبات کا سمندر بھر دیا ہے اور پھر اس گناہوں بھری دنیا میں چھوڑ دیا ہے اور تاکید کر دی ہے کہ حوریں دیکھو مگر عاقبت کی حوروں کا خیال کر کے ان کے پاس تک نہ پھٹکو۔ شراب دیکھو، مگر شراب طہور کا تصور دل میں جما کر آگے بڑھ جاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ تیرہ ادھار کی خاطر نقد کو چھوڑ دو۔ خواہشات دنیا بے شمار اور انواع و اقسام کی ہیں۔ سب سے دامن کوئی کہاں تک بچا سکتا ہے۔ ایسا کرے تو فرشتہ ہی نہ ہو جائے۔ ہاں نبی اور پیغمبر ایسے ضرور تھے مگر ان کے خاص جبلی وہ دماغ تھے۔ بہرحال میرا اپنا تو کہنا یہ ہے کہ جو ایک آدھ لغزش کے سوا سب برائیوں کو چھوڑ چکا ہو میری رائے میں وہ انسان ہے۔ اور آدمی ماننے کے لئے تو میں نے گنے چنے دو ایک اصول مقرر کر رکھے ہیں۔

منصور:۔ ہمیں بھی بتا دیجئے ہم بھی پرکھ کر اسی کو دوست بنائیں گے۔

چقماق:۔ دوست بنانے کے لئے تو بس یاد رکھو ؎

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست
در پریشاں حالی و درماندگی

آزمائش کے طور پر ہی کچھ روپیہ قرض مانگ دیکھو اور وہ ؎

"زری طلبی سخن درین است"

نہ کہے تو سمجھ لو کہ خاصا دوست ہے۔

منصور:۔ اور آدمی؟

چقماق:۔ جس میں غرور نہ ہو اور جس کی بات وزنی ہو اس میں سب کچھ آگیا۔ یعنی جو وعدہ کرے کے پورا کرے۔ کسی کو ملنے کا وقت دے تو اس وقت گھر پر موجود رہے۔ کسی کے پاس جانے کا اسے وقت دے تو پہونچ جائے۔ کسی سے کتاب پڑھنے کو لے تو وقت پہ واپس کر دے وغیرہ وغیرہ۔ اگر کسی کی بات وزنی ہے بوجھل کر ٹھوس ہے تو وہ چاہے شراب پئے، رنڈی بازی کرے ہماری بلا سے۔ ہم اسے انسان تو نہیں کہیں گے۔ مگر ہاں آدمی سمجھیں گے۔ تم بھی کیا یاد کرو گے تمہیں ایسی کسوٹی بتائے ہیں اور ایسی ترازو دیتے ہیں جس پر پرکھ کر اور جس میں تول کر تم انسان اور آدمی اور آدمی کی شکل کا جانور معلوم کر سکتے ہو۔ ہمارے چچا سعدی کیا خوب فرما گئے ہیں ؎

انسان:۔

آں کس کہ بداند و بداند کہ بداند
اسپ خرد خویش بہ افلاک رساند

آدمی:۔

واں کس کہ بداند و بداند کہ بداند
او نیز خر لنگ بہ منزل برساند

جانور بہ شکل آدمی:۔

وانکس کہ نداند و بداند کہ بداند
در جہل مرکب ابد الدھر بماند

اچھا میں نے تم لوگوں کے ساتھ اپنا بہت سا قیمتی وقت ضائع کر دیا۔ اللہ

ادارہ

ہماری نظر میں

سالنامہ ساقی دہلی۔ ادارہ۔ شاہد احمد، حسن عسکری،

ضخامت ۲۸۶ صفحات قیمت ع

رسالہ ساقی کو اردو کے رسائل میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے اس کے نمبر خاص خصوصیات کے حامل ہوا کرتے ہیں چنانچہ زیر نظر سالنامہ بھی اسی روایتی انفرادیت کا حامل ہے۔ اسے جدید اور قدیم انشا پردازوں کے خیالات کا ذہنی سنگم بنا کر پیش کیا گیا ہے اگر ایک طرف جوش ملیح آبادی، احمد ندیم قاسمی، جاں نثار اختر، میراجی، تلیس شفائی، سلام مچھلی شہری، یوسف ظفر، راما نند ساگر، وشوامتر عادل، صدیقہ بیگم اور اختر الایمان جیسے بیتاب فطرت اور حساس فنکار شریک ہیں، تو دوسری طرف رشید احمد صدیقی، عبدالعزیز فطرت، عبدالسمیع پال، مرزا فرحت اللہ بیگ، حجاب امتیاز علی امین حزیں، ظریف دہلوی جیسے پختہ نگار حضرات کی شمولیت اس کی ادبی حیثیت کو بلند کر رہی ہے۔ کاغذ کے اس بحرانی دور میں ایسے عدیم المثال معیاری اور ضخیم سالنامہ کی اشاعت پر ہم ادارہ ساقی کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

سالنامہ چمنستان دہلی۔ مدیر آغا سرخوش قزلباش،

ضخامت ۵۸ صفحات قیمت ۸ر

یہ رسالہ اپنے پہلے ہی شمارہ سے ترقی پسندانہ رجحانات کو پیش کر کے ترقی پسند حلقوں میں کافی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ چنانچہ زیر نظر سالنامہ کے مضامین میں بھی یہی روح کارفرما نظر آ رہی ہے۔ لکھنے والوں میں، شوکت تھانوی، جوش ملیح آبادی، جاں نثار اختر، مجنوں گورکھپوری، معین احسن جذبی، الطاف مشہدی، اثر جلیلی، حبیب اشعر، حجاب امتیاز علی، جگر مراد آبادی، سراج الخیری، ماہر القادری وغیرہ کے نام چمنستان کی ہردلعزیزی کا بین ثبوت ہیں آغا سرخوش نے جہاں مضامین نظم و نثر کے تنوع کو ملحوظ رکھا ہے بالکل اسی طرح کتابت و طباعت میں بھی پوری خوش سلیقگی کا ثبوت دیا ہے۔ آنجہانی کی شاعری والا مضمون سن سنیر کی جانب سے جعفری کی مجموعہ نوح سمجھا گیا ہے

سالنامہ حریم لکھنؤ۔ مدیرہ۔ بیگم سلیم رائے پوری

نگراں۔ نسیم انہونوی،

ضخامت ۲۴۴ صفحات قیمت عہ

حریم شریف خواتین کا ایک پاکیزہ رسالہ ہے جو عام نسوانی رسائل سے ہٹ کر مشرقی تہذیب و اخلاق کا علمبردار رہا ہے اس کے افسانوں میں بھی اس کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ یہ دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ خواتین کو مغربی تہذیب کی ہلاکت آفرینیوں سے بچائیں۔ چنانچہ سالنامہ کے افسانے بھی اسی پاکیزگی کا نمونہ ہیں۔ نظموں میں اصلاحی پہلوؤں کو زیادہ اجاگر کیا گیا ہے اس کے علاوہ کشیدہ کاری کے چند اچھے اچھے نمونے شائع کر کے خواتین کی ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خانگی معلومات اور دلچسپی کے اعتبار سے یہ سالنامہ خواتین کے لئے ایک قابل قدر مجموعہ ہے۔

روح تبسم۔ مصنف ظریف دہلوی، ناشر مشہور پبلشنگ ہاؤس دہلی۔

ضخامت ۱۸۴ صفحات۔ قیمت عہ

زندگی رنج و الم کا مجموعہ بھی ہے۔ مگر ہوش مند روتے کم ہیں اور مسکراتے زیادہ۔ ظریف دہلوی بھی اسی اصول کے پابند نظر آتے ہیں۔ وہ زندگی کی تلخیوں کو بہت زیادہ محسوس کرتے ہیں مگر ان تکالیف کو رو رو کر نہیں بلکہ ہنس ہنس کر بیان کرتے ہیں۔ معاشرتی کمزوریوں پر طنز کر

ولایتی گھڑیاں آگئیں

جس گھڑی کا مدت سے انتظار تھا اور جس کیلئے آپ بے چین تھے وہ گھڑیاں بہت تھوڑی مقدار میں آگئیں۔ یہ کلائی کی خوبصورت مضبوط اور مدت تک چلنے والی گھڑی ایک ایسا نایاب تحفہ ہے کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ ٹائم کی سچی پرزوں کی مضبوطی کی گارنٹی ہے۔ گول شیپ میں موجود ہے بنانے والی کمپنی نے یہ تعریف کی ہے کہ پتھر پر گرنے سے بھی نہیں ٹوٹتی ٹائم برابر دیتی رہتی ہے۔ اور سفید پالش نہایت چمکدار کیا گیا ہے جس کو دیکھکر آپ کمپنی کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے قیمت فی گھڑی معہ اسٹراپ اور کیس یکمشت صرف پچیس ۲۵ روپے ہے محصول ڈاک تیرہ آنے (۱۳) علاوہ ہے۔

نوٹ۔ جو لوگ نیلا ہے منگائیں۔ وہ پوری رقم معہ ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر روانہ کردیں۔ فہرست تیار نہیں ہے۔

بی۔کے برادرس اینڈ کو (گھڑیوں کے مشہور تاجر) فولاد خاں اسٹریٹ (کو۔ڈی) دہلی

دانتوں سے خون آنا

اس مرض کو پائیریا کہتے ہیں۔ کبھی مسوڑھے سوجھ جاتے ہیں اور منھ سے بدبو آنے لگتی ہے۔ اور یہ گندہ رطوبت معدے کے اندر جاکر بہت سی موذی بیماریوں کا شکار بنا دیتی ہے۔ آپکے دانتوں سے خون گرتا ہو مسوڑھوں میں سوجن اور درد رہتا ہو تو

لوتھ ایکس

دوا استعمال کریں۔ خون آنے کو روکنے میں اکسیری اثر دکھاتی ہے۔ اور مسوڑھوں کے زخم کو بھر کر پائیریا کے مرض کو قطعی دور کردیتی ہے۔ ڈاکٹروں نے بھی اس دوا کو پائیریا کے مرض کے لئے اکسیر مانا ہے۔ ایک شیشی ایک مریض کے لئے کافی ہوتی ہے۔
قیمت فی شیشی دو روپے آٹھ آنے (۲/۸) ہے۔ محصول ڈاک تیرہ آنے (۱۳) علاوہ ہے۔

اکسیری دواخانہ کلاں محل۔ بکس نمبر ۱۴۱ (کو۔ڈی) دہلی

آنکھ کی تمام بیماریوں کو دور کرنیوالی دوا کرسٹل آئی ڈراپ نظر کی حفاظت کرکے بینائی کو تیز کرتی ہے

بعض ان کا محبوب مشغلہ ہے مگر اس میں بھی وہ قہقہوں کا امتزاج چاہتے ہیں چنانچہ ان کے مجموعہ "روحِ تبسم" کے ہر شعر میں یہی زہر خند موجود ہے اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے زبان کی نزاکت و لطافت کا بھی خیال رکھا ہے اور شعرا کی طرح ان کا دامن کلام بازاری ابتذال اور سوقیانہ مزاح سے بالکل پاک و صاف ہے۔

نکہتِ گل مصنف۔ وفا براہی۔ ناشر پستک بھنڈار لہریا سرائے

ضخامت ۱۲۸ صفحات قیمت ۱؎

وفا براہی کے کلام کا مجموعہ ہے جس میں روایتی پابندیوں اور قیود کا بطور خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اشعار میں پختگی اور روانی بھی بدرجہ اتم موجود ہے مگر زمانے کے نئے تقاضوں کو بھی شاید فانی نے محسوس نہیں کیا اسی لئے وہ ابھی تک "برقِ تبسم" اور "ان معاذ اللہ" کے گورکھ دھندوں میں الجھے ہوئے اور اس قسم کی شاعری کو اپنا سرمایہ حیات سمجھے بیٹھے ہیں کتابت و طباعت بہت معمولی ہے اور اسی عدم توجہی کی بنا پر اچھے کاغذ کے استعمال کے باوجود اس میں کوئی حسن پیدا نہیں ہو سکا ہے۔

طرزِ زندگی مصنف نسیم انہونوی۔ ناشر نسیم بکڈپو لکھنؤ

ضخامت ۲۶۶ صفحات

نسیم انہونوی کی پہلی تخلیق ہے جس کا یہ دوسرا ایڈیشن ترمیم و تنسیخ کے بعد شائع ہوا ہے اس میں ایک ایسی لڑکی کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے جو بالغ نظر اور ہوش مند ہونے کے باوجود حالات کے اعتبار سے ایک ایسے غلط ماحول میں پہونچ گئی جہاں اس کا دم گھٹ جانا چاہیئے تھا لیکن اس مشرقی خاتون نے ان تمام صعوبات کو خندہ پیشانی سے برداشت کر کے اس جہنم کدہ کو جنت سے بدل دیا ناول کی روانی اور تسلسل بے حد دلکش ہے یہاں تک کہ بعض بعض جگہ پڑھنے والے کے آنسو نکل آتے ہیں، ہماری رائے میں یہ کتاب اس قدر اہم ہے کہ ہندوستانی گھرانوں کی شریف بہو بیٹیوں کے لئے اس سے زیادہ اچھا اور کوئی پاکیزہ تحفہ نہیں ہو سکتا۔

تانیں مصنف منصور سحر۔ ناشر شاید بنات خود

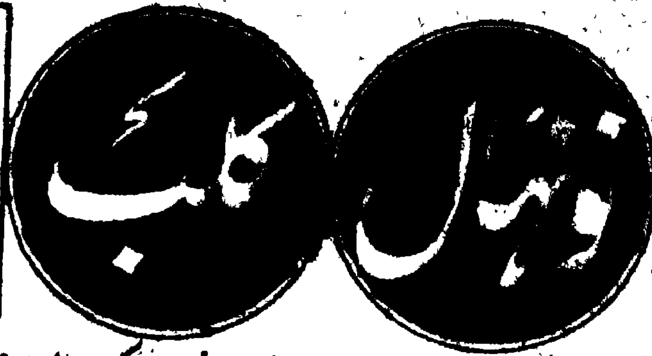
ضخامت ۱۲۸ صفحات

تانیں ہندوستان کے نو عمر شاعر منصور سحر کے حسین اور دلآویز گیتوں کا دلکش مجموعہ ہے منصور کے گیتوں میں رس و سوز کے ساتھ ساتھ نغمگیت بھی بدرجہ اتم موجود ہے اور زندگی کی نئی قدروں سے بھی بڑی حد تک ہم آہنگ ہیں اور یہی چیز ایسی ہے جو منصور کے بلند مستقبل کی طرف اشارہ کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو رہی ہے کتابت و طباعت بہت

معمولی ہے اگر ذرا اس ۔۔۔ دی جاتی تو کتاب کو چار چاند لگ جاتے اسی طرح کتاب میں ناشر ۔۔۔ قیمت درج نہ ہونے کی وجہ سے ایک الجھن، پیدا ہو جاتی ہے۔

دامنِ گلچیں مصنف۔ مقرب دہلوی۔
ناشر مشہور پبلشنگ ہاؤس دہلی
ضخامت ۹۲ صفحات قیمت ۲؍

یہ مجموعہ ہے ان فکاہی صفحات کا جو مقرب دہلوی نے ماہنامہ مشہور میں لکھے ہیں ظاہر ہے کہ اس قسم کے صفحات کسی خاص موضوع کے ماتحت نہیں لکھے جاتے ہیں۔ بلکہ مسائل حاضرہ پر ایک قسم کا وقتی طنز ہوتا ہے اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت بھی ختم ہو جاتی ہے اس لئے موضوع سے قطع نظر صرف اس طرز نگارش پر غور کیا جا سکتا ہے اور جہاں تک طنزیہ نگارش کا سوال ہے اس میں مصنف کامیاب ہے کیونکہ انہوں نے وقتی حالات کو دلکش زبان میں لکھ کر طنز کا اس خوبصورتی سے نباہ کیا ہے کہ قاری کی دلچسپی بھی قائم رہتی ہے اور مزاح کی چاشنی کے ساتھ ساتھ مقصد بھی فوت نہیں ہوتا۔ اگر مصنف کسی خاص موضوع پر اسی انداز سے قلم فرسائی کریں تو ہماری رائے ہے کہ وہ اس سے زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں



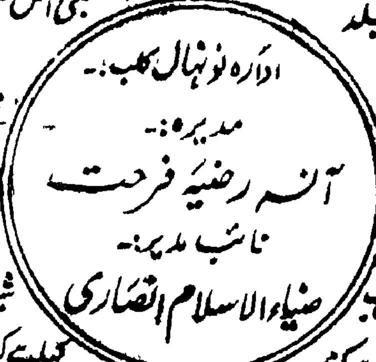
ہر نونہال جس کی عمر
... برس سے کم ہو
کلب کا ممبر بن سکتا ہے
... کو ... فارم ...

بلکہ محض مطبوعہ فارم کو
تراش کر خانہ پری کر کے
بھیج دیجئے جو اسی رسالہ
میں کسی دوسرے صفحہ پر ہے

عزیز بھائیو اور بہنو!

اسلام علیکم - فروری کا پرچہ تو آپ صاحبان نے پڑھ لیا ہوگا اور تعجب بھی ہوا ہوگا کیونکہ ابھی تو مدیرہ صاحبہ نے وعدہ کیا تھا کہ ہر ماہ حاضر ہوں گی اب پھر کوتاہی کر رہی ہیں۔ لیکن اس کی وجہ صرف یہ ہی تھی کہ میں بوجہ مصروفیت جلد ایڈیٹوریل وغیرہ لکھکر دفتر قوم نہ روانہ کر سکی حتیٰ کہ فروری کے پرچے کی کتابت بھی ہو گئی اس بات کا بہت افسوس ہے کہ میں وعدہ کرنے کے باوجود بھی آپ لوگوں کی کوئی خاص خدمت نہ کر سکی۔ فروری کے پرچہ میں ضیا صاحب کی تجاویز نظر سے گذری ہونگی لہذا عرض ہے کہ ممبر بننے کے لئے آپ صاحبان صرف کلب ہٰذا کے لئے مخصوص فارم پُر کر کے بھیجیں۔ دوسرے فارم قبول نہ کئے جائینگے۔ اب یہ عرض ہے کہ بہت سے بھائی اور بہنیں اپنے مضامین جو رسالہ "قوم" میں شائع کروانا چاہتے ہیں میرے پاس روانہ کرتے ہیں۔ ان صاحبان سے عرض ہے کہ وہ مہربانی فرما کر اس قسم کے مضامین مدیر "قوم" ہی کے پاس بھیجیں اور میرے پاس بھیجنے کی تکلیف گوارا نہ کریں، چونکہ میں تو صرف کلب کی مدیرہ ہوں۔ بہت سے بھائیوں کو خط و کتابت کرنے کا بہت شوق ہے۔ ان بھائیوں سے عرض ہے کہ اگر وہ اپنے اس شوق کو صرف لڑکوں ہی تک محدود رکھیں تو بھی انھیں بہت سے قلمی دوست مل جائیں گے اسلئے ایسے اصحاب سے عرض ہے کہ وہ کلب کے قانون سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کریں کیونکہ لڑکیاں مجبور ہیں انپر پابندیاں عائد ہیں اُنکے والدین اس قسم کی چیزیں پسند نہیں کرتے اور آپ صاحبان یہ بخوبی جانتے ہیں لیکن افسوس پھر بھی اس قسم کی باتوں سے گریز نہیں کرتے۔ بہت سے حضرات ممبری کی سفارش کے لئے مجھے خط لکھتے ہیں لہذا عرض ہے کہ میری سفارش سے ممبر نہیں بن سکتے بلکہ ممبری فارم پُر کر کے دفتر "قوم" بھیج دیجئے۔ آپکو بلاشک و شبہ ممبر بنا لیا جائیگا۔ بعض بہنوں نے سوال کیا ہے کہ فروری کے پرچے میں جو تجاویز شائع ہوتی ہیں اسپر لڑکیاں کس طرح عمل کریں تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ بہنیں یا تو اپنی انفرادی رائے سے تحریری طور پر ادارہ نونہال کلب کو مطلع کریں یا اگر ہو سکے تو آپس میں سے کسی ایک کے مکان پر جمع ہو کر اس پروگرام پر عمل کریں نیز ممبران سے اسی سلسلہ میں عرض ہے کہ اسی پرچہ میں تمام ممبران کے پتے شائع ہو رہے ہیں۔ پرچہ ملتے ہی فوراً آپس میں ملکر اپنے جمع ہونے کے مقام سے ادارہ کو مطلع کریں تاکہ اپریل سے یہ کام باقاعدہ شروع کر دیا جائے یا بصورت دیگر تجویز سے ممبران کلب کی بغیر رضامندی کا اعلان کر دیا جائے۔ اچھا اب رخصت چاہتی ہوں۔

آنسہ رضیہ فرحت مدیرہ نونہال کلب نا مرقوم



پندرہ خریداروں کی شرط منسوخ

آپکو یہ پڑھکر یقیناً خوشی ہوگی کہ نونہال کلب کی ادارت کی امیدواری کے لئے پندرہ خریدار بنانے کی جو شرط لگائی گئی تھی بہت ممبران کلب کے اصرار پر اسے ختم کر دیا گیا ہے اور اب ہر ممبر جسکی درخواست ۱۳ مارچ تک دفتر قوم میں موصول ہوجائیگی ادارت کا امیدوار ہوسکے گا نیز وہ ممبران بھی جن کے فارم ممبری ۲۵ اپریل تک موصول ہوجائیں گے الیکشن میں ووٹ دینے کے حقدار ہونگے۔

لڑکے لڑکیوں کی خط وکتابت کا معاملہ چونکہ نونہال کلب کے لئے ایک خاص پریشانی کا سبب بن گیا ہے اسلئے اس مسئلہ کو حل کرنیکے لئے یہ طے کیا گیا ہے کہ اس مرتبہ ادارہ نونہال کلب صرف دو افراد پر مشتمل ہوگا یعنی مدیرا اور مدیرہ نیز مدیر کا انتخاب نونہال بھائی اور مدیرہ کا بہنیں کریں گی اور اسی طرح ہر قسم کی معلومات حاصل کرنیکے لئے بہنیں ہمیشہ مدیرہ سے اور بھائی مدیر سے خط وکتابت کریں گے۔ اگر آپکے دل میں بھی نونہال کلب کا مدیر یا مدیرہ بننے کی خواہش ہے تو جلد از جلد امیدواری کی درخواست دفتر قوم میں روانہ کر دیجئے اور اگر آپ ابھی تک کلب کے ممبر نہیں ہیں تو ممبری فارم بھی ۲۵ اپریل تک روانہ کر دیجئے۔

ادارہ۔

ہماری ڈاک

نائب مدیرہ صاحبہ!

س (۱) مجھے افسوس ہے کہ میں نے دو بہنوں کے پاس خط روانہ کئے لیکن ان میں سے ایک نے بھی جواب نہ دیا کیا انھوں نے ممبر بنتے وقت فارم پر فرض نہیں پڑھا تھا انکے نام ہیں

[illegible]

س (۱) بہن رضیہ میں چاہتی ہوں کہ ایک نظم بیتے ہوئے دنوں کی یاد سالنامہ قوم میں شائع ہو جائے خواہ کلب کے صفحات میں ہو یا اسکے علاوہ کیا آپ اس سلسلہ میں میری مدد فرمائیں گی

سعیدہ خاتون صدیقی

ج۔ ان بہنوں نے فرض نمبرہ پڑھا تو ضرور ہوگا لیکن عمل نہیں کر رہی ہیں آپ ایکبار مرتبہ اور خط لکھئے انشاءاللہ ضرور جواب دینگی

ورنہ ——————

ج ۲۔ بہن خیال تو نیک تھا لیکن سالنامہ آپکے ہاتھوں میں ہے یعنی وقت نکل چکا۔

س۔ مجھے اپنا سبق اکثر یاد نہیں رہتا کیا آپ اسکی وجہ بتا سکتی ہیں۔

(افتخار حسن از مرادآباد)

ج۔ میرے بھائی دل لگا کر آپ سبق یاد نہ کرتے ہونگے ورنہ دنیا میں کونسا ایسا کام ہے جسے انسان کر نہیں سکتا۔

س۔ آپکے مضامین جو اکثر دوسرے رسالوں میں بھی شائع ہوتے رہتے ہیں کیا میں انھیں آپکے زور قلم کا نتیجہ سمجھ لوں۔

(ایس اے قادری)

ج۔ جی نہیں آپ ان سب کو بڑے شوق سے اپنے زور قلم کا نتیجہ سمجھ سکتے ہیں۔

س۔ بہن رضیہ کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ مسلمانوں میں اخلاقی فرض کیوں جاتا رہا

(طیبہ خاتون)

ج۔ کیا آپ کو بھی کسی بہن نے دھوکہ دیا ہے یعنی آپکے خط کا جواب نہیں دیا؟ یا اخلاقی فرض سے آپکی مراد کچھ اور ہے تشریح فرمائیں۔

س۔ بہن رضیہ میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ اس مرتبہ بھی کوئی لڑکی مدیرہ بنے گی لیکن آپکے علاوہ

۲۔ میں کلب کا ممبر بن کر بہت خوش ہوا اس سلسلہ میں ضیاء صاحب

[illegible] احمد ملوی)

ج - اگر یہ پیشین گوئی غلط ہو جائے تب ؛
۲ - نیکی اور پوچھ پوچھ بس جھٹ پٹ کھلا دیجئے ۔
س - بہن فرحت آپکا نام تو بہت ہی عمدہ ہے اور کام دیکھکر تو مجھے بہت ہی خوشی ہوئی (پروین کوثر دہلی)
ج - کام کے سلسلہ میں عزت افزائی کا شکریہ البتہ نام تو آپکا بہتر ین ہے کیونکہ آپ ہیں کوثر جیسے صرف جنتی لوگ حاصل کر سکتے ہیں اور میں فرحت جسے ہر کوئی حاصل کر سکتا ہے ۔
س - اسوقت جب کہ ہم ہندوستانی ہر بالغ کے لئے حق رائے دہندگی حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہیں کلب میں ۵ خریدار بنانے کی قید کیوں لگائی گئی (نور قریشی جالندھر)
ج - بھائی صاحب پندرہ خریدار بنانے کی شرط رائے دینے والوں کیلئے نہیں بلکہ امیدواروں کیلئے ہے اور آپکو معلوم ہونا چاہئے کہ الیکشن میں بطور امیدوار کھڑا ہونیوالے صاحب سے ایک رقم بطور ضمانت جمع کرالی جاتی ہے تو آپ بس اس شرط کو ضمانت سمجھ لیجئے ؛

س - رسالہ قوم ابتک اچھا رسالہ تھا لیکن چند ماہ سے دیکھا جا رہا ہے کہ اسمیں فلمی خبریں بھی آرہی ہیں کیا اسکو بھی شمع بنانے کا ارادہ ہے ادارہ کو معلوم ہونا چاہئے کہ پرچے کا نام قوم ہے ۔
(علیم حکمت الہ آباد)
ج - آپکو بہت شدت سے احساس ہو رہا ہے لیکن بھائی صاحب ذرا عقل کے ناخن لیجئے آپ قوم اور شمع کا مقابلہ کر رہے ہیں لیکن یہ نہ دیکھا کہ کیا اسمیں بھی کبھی مشتاق کے خطوط اور بیہودہ اور لچر فلمی سوالات ملے ہیں رہا فلمی صفحات کا سوال تو جناب وہ تو ایک بے لاگ فلمی تبصرہ ہوتا ہے ۔ بقول مدیر قوم

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

آنسہ رضیہ فرحت مدیرہ نونہال کلب ماہنامہ قوم دہلی

فارم ممبری نونہال کلب
ماہنامہ "قوم" دہلی

تاریخ ———— 1947 ———— نمبر ————

فرائض ممبران :- (۱) اپنے والدین اور بزرگوں کا کہنا مانے گا (۲) ہمیشہ بری صحبت سے بچے گا (۳) ہر ایک سے اخلاق سے پیش آئے گا خواہ وہ ملازم ہی کیوں نہ ہو (۴) اپنے کلب کے ممبران کو اپنا دوست یا سہیلی سمجھے گا (۵) کسی نونہال کو اگر کوئی کلب کا ممبر قلمی دوست کی حیثیت سے خط لکھیگا تو اس کا جواب دیگا اور اگر جواب نہ دینا چاہے تو معقول عذر کے ساتھ ایڈیٹر کو مطلع کریگا ۔ (۶) کوئی مضمون کہیں سے نقل کرکے نونہال کلب میں شائع کرنے کے لئے نہیں بھیجے گا ۔ بلکہ ہمیشہ خود لکھے گا ۔

جناب ایڈیٹر صاحب نونہال کلب ماہنامہ "قوم" دہلی

براہ کرم میرا نام نونہال کلب کے ممبران کی فہرست میں شامل کر دیجئے میں نے مذکورہ بالا قواعد پڑھ لئے ہیں اقرار کرتا ہوں کہ ایک ممبر کی حیثیت سے ان سب کی پابندی کروں گا ۔

نام ———— ولدیت ———— سن پیدائش ————
تعلیم ———— مکمل پتہ ————

(دستخط خود اپنے قلم سے)

نوٹ :- نونہال سے کم و بیس سال سے زائد عمر کے نونہال ممبر نہیں بنائے جائیں گے تعلیم اگر باقاعدہ کوئی یا درجہ میں نہ ہو تو معمولی اردو یا انگریزی لکھ دیجئے جو صورت بھی ہو ۔

بقیہ ڈاک

س۔ ضیاء صاحب

رسالہ رتن کا پتہ تحریر فرماویں۔

۲۔ قوم کے کل خریدار کتنے ہیں (شمیم احمد از حیدر آباد دکن)

ج۔ دفتر رسالہ رتن جموں کشمیر ۲۔ فرمائیے آپکا کیا ارادہ ہے۔

س۔ کیا آپ میرا ممبری نمبر تحریر فرمائیں گے۔

۲۔ بہن آنسہ رضیہ کا پتہ تحریر فرمائیں (محمد رفیق غمگین)

ج۔ فہرست ممبران میں ملاحظہ ہو

۲۔ آنسہ رضیہ فرحت بنت خانصاحب الطاف حسین علوی
(چہار بنگلہ بھوپال)

س۔ بہن فرحت اور بھائی ضیا

۱۔ آپ دونوں کلب کو اس پرانے یعنی باغیلی صاحب اور رحمانی صاحب والے زمانے کی طرح کیوں نہیں چلا رہے۔

۲۔ لڑکیوں کے لئے کلب کا ممبر بننے کے سلسلہ میں آپنے عمر کی کیا قید لگائی ہے۔

۳۔ آپنے کلب کے مستقبل کیلئے کیا سوچ رکھا ہے؟ کیا اس سے قوم کو کوئی فائدہ بھی پہنچ سکے گا یا صرف قصے کہانیاں ہی ہوتی رہیں گی۔ محمد منیر پشاور

ج۔ عزیز محترم وہ کونسی کمی ہے جو آپکو موجودہ زمانے میں محسوس ہو رہی ہے ذرا تشریح فرمائیے۔

۲۔ جو لڑکوں کے لئے لگائی ہے۔

۳۔ فروری کے پرچہ میں نونہال کلب کا اداریہ ملاحظہ فرمائیں اور پھر تحریر کریں کہ آپ اس سلسلہ میں ہماری کیا مدد کر رہے ہیں۔

س۔ آپ اگر مناسب سمجھیں تو نونہال کلب میں کچھ مضامین سائنس سے متعلق شائع کر دیا کریں۔

ج۔ کیا آپکا مطلب یہ ہے کہ ہم صبح سے شام تک سائنس سے متعلق مضامین لکھا کریں حضور والا آپ ہی اس سلسلہ میں پیش قدمی فرمائیں۔

اے کاش

رفیق بہت قریب کچھ بے زار سا ہو گیا تھا کہ وہ شادی سے پہلے بھی ثریا کی فیشن پرستی مغرب کی اندھی تقلید پر اظہار خفگی کیا کرتا تھا کہ شاید وہ شادی کے بعد خود بخود سدھر جائے گی خاموش رہا اب جو اس نے دیکھا کہ یہ مغربی مرض تو کی بجائے روز افزوں ترقی پذیر اور لاعلاج ہوتا جا رہا ہے تو اس نے بعض قابلِ اعتراض باتوں پر احتجاجاً ٹوکنا شروع کیا ثریا نے رفیق کی اس دانستہ خاموشی کو اس کی رضامندی اور پسندیدگی سمجھ کر سوسائٹی کی جان، شمع محفل اور فیشن پرستی میں اپنی مثال آپ قائم کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور کسی حد تک کامیاب بھی ہو چکی تھی۔ رفیق کی اس بے جا حرکت کو ظلم و جبر اور مداخلت بے جا جانا۔ اس کو اپنے بھولے بھالے رفیقِ حیات سے ایسی امید نہیں تھی کہ وہ اس کی آزادی میں روڑے اٹکائے گا بلکہ وہ تو شاداں و فرحاں تھی کہ خوش قسمتی سے اسے ایسا شوہر ملا ہے جو اس کی آزادی کو قبول نظروں سے دیکھتا ہے۔ رفیق کی یکایک اس تبدیلی سے وہ حیران بھی ہو گئی لیکن وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ آج کے انگریزی رقص میں ضرور جائے گی۔ ایک فوجی کلب کے چند افسروں کی جانب سے جو کالج لائف میں اس کے ہم جماعت رہ چکے تھے اسے مدعو کیا گیا تھا اور وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس دعوت کو رد کر کے سب کہا ثریا کی خاطر اپنے جدّت پسند اور فیشن ایبل دوستوں کا دل توڑ دے لہذا اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ چاہے کچھ ہو جائے وہ ناچ میں ضرور حصہ لے گی چنانچہ دوپہر کے بعد ہی سے اپنا سنگار شروع کر دیا اور دو چار گھنٹوں کی محنت شاقہ کے بعد فرنگی تہذیب کی عاشق و دلدادہ ثریا اور اطلاق کے ساتھ نت نئی خوشبو بکھیرتی ہوئی جلوہ افروز ہوتی ہے جسم [illegible] اور طرحدار کپڑوں کا حسن خوب تر تھا۔ تابکی

لہذا حکمت سے سجایا گیا تھا کہ مردہ دل بھی دیکھے تو لچک کر رہ جائے غضب کی جوانی سراپا حسن و ادا اور پھر زیبائش مادی اشتعال آمیز چیزیں اکٹھی ہوں تو بھلا آگ نہ بھی دھواں بھی ذرا اٹھے تو مقام تعجب ہے۔

چھ بج چکے تھے لیکن ابھی رفیق دفتر سے لوٹا نہ تھا۔ اور ادھر ثریا مضطرب انتظار تھی رفیق کی نہیں بلکہ موٹر کی۔

دن بھر کا کام کر کے رفیق تھکا ہارا مکان میں داخل ہوا اس نے ثریا کو مکمل تیاریوں کے ساتھ باہر جانے کے لئے تیار دیکھا تو اس کا دل بیٹھ گیا۔ ثریا کے شانوں تک گداز بانہوں اور گھٹنوں کے اوپر تک برہنہ مرمریں پنڈلیوں کو دیکھ کر مارے غصے کے اس کا خون کھولنے لگا۔ وہ اس کے باہر جانے کے لئے مانع ہوا۔ سمجھا بجھا کر باز رکھنے کی کوشش کی، آخر ڈانٹ بتائی، اس سے پیدا ہونے والے خراب نتائج کی پیشین گوئی کی لیکن غیر متزلزل ارادے کی مالک ثریا ٹس سے مس نہ ہوئی۔ کار آ گئی اور وہ اپنے رفیقِ حیات کو جھنجھلاتا ہوا چھوڑ کر یہ جا وہ جا۔

رفیق حسرت بھری نگاہوں سے کار کو دیکھتا رہا جب تک کہ وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی اس کے حسین و رنگین، خوابوں کی دنیا، تمناؤں کا مرکز، سرمایہ حیات اس کی روح لیے شریک زندگی اس طرح اس کے ہاتھوں سے کھوئی جا رہی تھی اور وہ خاموش بیٹھا کف افسوس مل رہا تھا۔

آخر روز روز کے اس قسم کے جھگڑوں سے تنگ آ کر رفیق نے اپنا آخری حربہ بھی استعمال کر ڈالا یعنی طلاق کی دھمکی دی لیکن آفرین ہے ثریا پر کہ اس نے اس فیصلہ کا خندہ جبینی کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ اس سانحے سے رفیق کو اس قسم کا اندازہ ہو چکا ہوگا کہ شاید مدت سے ثریا اس سے علیحدگی کی متمنی تھی اور پہل بھی اسی سے چاہتی تھی۔

ازدواجی زندگی کو خیرباد کہنے کے بعد تہذیب نو کی حامل

ثریا نے اندھی تقلید اور فیشن پرستی کے میدان میں تکمیل شوق کے صبا رفتار گھوڑے کو بے لگام سرپٹ چھوڑ دیا۔ اس کا مطمح نظر صرف یہی تھا کہ دنیا کی ہر سوسائٹی ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور ہر فرد آزادی کا طلب گار ہے تو پھر وہ کیوں کسی کی نگاہ ترحم کی محتاج اور کسی کی دست نگر رہ کر تاریک، گمنام اور غلامانہ زندگی بسر کرے اور یہی بات تھی جس نے ثریا کو چراغ خانہ کی بجائے شمع محفل بنا دیا۔ واقعی یہ ترقی قابل داد ہے؟

اے کاش! ہماری بہنیں آزادی کے مفہوم کو سمجھ سکیں۔

پریتم کمار

ٹوٹا ہوا بیل

ایک شخص کے مویشی تالاب میں پانی پی رہے تھے ایک بیل کو اس نے پانی میں پیشاب کرتے دیکھا تو جھٹ اس کو یہ کہتے ہوئے ذبح کر ڈالا کہ ایسا بیل بھی کس کام کا جو ٹوٹا ہوا ہو

اُستاد۔ حامد دنیا کے گول ہونے کے کوئی تین ثبوت بتاؤ؟

حامد۔ حضور! ایک تو آپ کہتے ہیں، دوسرے ابا کہتے ہیں اور تیسرے کتاب میں لکھا ہوا ہے۔

سید رضی الدین احمد
پٹنہ

نونہال کلب کے ممبر بن کر ایڈیٹری کے انتخاب میں حصہ لیجئے۔

دُنیا نئی بسائیں

۱۔ اک جنت اس جگ سے نرالی
سُندر، پریمی، بھولی بھالی
سکھ امرت برسانے والی
رس کے ساگر میں لہرائیں
آؤ!
دُنیا نئی بسائیں

۲۔ ایک ہو اس ساگر کا سفینہ
ایک ہو اس منزل کا زینہ
یکساں مرنا، یکساں جینا
گھل مل کر سب ایک ہو جائیں
آؤ!
دُنیا نئی بسائیں

۳۔ گورے، کالے، سچے، جھوٹے
موت کا رہزن سب کو لوٹے
جانے کب یہ رشتہ چھوٹے
قدرت کے سب مل گن گائیں
آؤ!
دُنیا نئی بسائیں

اعجاز احمد لغاری لاہور

ربڑ

صبح کا وقت تھا۔ میں سکول کا کام ختم کر کے "قوم" پڑھ رہا تھا۔ رفیق میرے ٹکٹوں والے البم میں ٹکٹیں دیکھ رہا تھا

اچانک رفیق بولا۔

بھیا! لنکا کے ٹکٹ پر عورت کیا کر رہی ہے؟

میں۔ رفیق! یہ عورت ربڑ کے درخت سے دودھ حاصل کر رہی ہے۔

رفیق (ربڑ کا ٹکڑا دیکھتے ہوئے) یہی ربڑ؟

میں۔ ہاں

رفیق۔ تو بھیا ربڑ کی کہانی سنائیے کہ یہ کس طرح حاصل ہوتا ہے؟

میں۔ تو سنو!

[illegible] میں مشہور سیاح کولمبس دریائے ایمزن کی وادی میں سفر کر رہا تھا وہیں اس نے ربڑ کے لمبے لمبے درختوں کی کاشت ہوتے دیکھی اور بطور نمونہ اس نئی چیز کو اپنے وطن لے گیا۔ اس وقت اس کی طرف کسی نے دھیان نہ دیا۔ کچھ عرصہ بعد ایک شوخ لڑکے نے کسی طرح یہ معلوم کر لیا کہ ربڑ پنسل کی تحریر مٹا سکتا ہے پھر کیا تھا عام چرچا ہو گیا اور روز بروز اس کی مانگ بڑھتی گئی پہلے پہل ایمزن کی وادی میں ہی ربڑ ہوتا تھا پھر بعد میں جب ضرورت اور بڑھی تو ملایا، سیام اور لنکا میں بھی اس کی کاشت شروع ہو گئی۔ اس نئے ٹکٹ پر ربڑ کا درخت دودھ حاصل کرنے وقت کی تصویر ہے کہ ربڑ لنکا میں کافی ہوتا ہے۔

رفیق۔ بھائی جان! ربڑ کے درخت سے دودھ کس طرح حاصل ہوتا ہے؟

میں۔ ربڑ کے درختوں سے ۷ سال کی عمر میں دودھ لینا شروع کرتے ہیں اور تیس چالیس سال کی عمر میں دودھ آنا بند ہو جاتا ہے۔ ان سے سال بھر میں دو سیر کے قریب دودھ حاصل کیا جا سکتا ہے یعنی دس پندرہ سیر بھی دودھ دیتے ہیں۔ چھری سے نشان کر کے دودھ حاصل کیا جاتا ہے اور دودھ کو خشک کر کے ربڑ بنایا جاتا ہے۔

ٹن ——— ٹن ——— ٹن

او نو بج گئے لو میں کالج جاتا ہوں پھر کبھی کسی اور چیز پر بات چیت ہو گی۔

نور محمد صابر فاروقی
مالیر کوٹلوی

شٹ اپ

جاوید کوئی کتاب پڑھنے میں محو تھا اتنے میں اس کی ننھی بہن اس کے پاس آئی اور بولی۔

منی۔ بھیا یہ کیا ہے؟

جاوید (چونک کر غصہ سے) شٹ اپ

منی۔ (بھولے پن سے) اچھا شٹ اپ ہے۔

ایم۔ ایس۔ ا۔ بلقیس نائب
بھوپال

بوٹ سنگھ

عرصہ گذرا کسی شہر میں ایک شخص ٹرچی نامی رہا کرتا تھا۔ باپ نے کچھ دولت چھوڑی تھی ایک عرصہ تو آرام سے کھاتا رہا لیکن آخر جب روپیہ ختم ہو گیا تو بیچارہ بھوکوں مرنے لگا نہ تو کوئی پیشہ آتا تھا اور نہ ہی کام کرنے کی عادت تھی کرتا تو کیا کرتا۔ بیوی بھی [illegible] اور دل ہی دل میں ہزار ہزار صلواتیں سناتی [illegible] عورتوں کی طرح بیٹھ رہے آخر سب یہ دیکھا کہ [illegible] ایک دن [illegible] [illegible] کیا [illegible] [illegible] تو کچھ نہ [illegible]

نوکری کی تلاش میں چل نکلا۔ نوکری لیے کو کیا فرک ملتی سب نے کورا جواب دیا کہ میاں کوئی ہنر آتا ہو تو نوکر بھی رکھیں۔ آخر مایوس ہو کر ایک طرف کو چل پڑا چلتے چلتے ایک ندی راستے میں آئی۔

ایک طرف گلشن، بہار کا نکھار، قسم قسم کے پھلدار درخت رنگا رنگ کے پھول عجب بہار دکھا رہے تھے ساتھ ندی کی دلکش آواز، جی مچل گیا۔ گھر سے ستایا ہوا تو تھا ہی وہیں ایک برگد کے درخت کے نیچے بیٹھ تپسیا شروع کر دی ایک پاؤں ندی کے پانی میں رکھا دوسرا درخت کی جڑ پر اور ایک برتن سے جڑ کے قریب ایک سوراخ میں پانی ڈالنا شروع کر دیا اس طرح پانی ڈالتے ڈالتے کافی عرصہ گذر گیا۔

آخر ایک دن اس سوراخ میں سے عجیب قسم کی آوازیں آنے لگی وہ کچھ سہم سا گیا۔ اور پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک خوفناک اژدہا پھنکارتا ہوا باہر نکل آیا۔ رچی کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ خوف کی وجہ سے ایک طرف کو بھاگ لیا۔ اژدھا بھی دوڑ کر اس کے قریب آیا اور بولا۔ مانگو کیا مانگتے ہو۔ تم نے مجھے جادو کے اثر سے چھڑایا ہے۔ آج مجھے تمہارا پانی پہنچا ہے اور میں جادو کے چنگل سے باہر نکلا ہوں۔ بتاؤ تم کیا چاہتے ہو۔

رچی حیران ہو گیا کہ میں تو دو سال سے پانی ڈال رہا ہوں اور اسے آج ملا ہے اس کے دل سے کچھ خوف و ہراس دور ہوا وہ اٹھ بیٹھا اور ہمت کر کے بولا اے دیوتا۔ میں بہت مصیبت زدہ ہوں گھر سے نکالا ہوا اور دنیا سے دھتکارا گیا ہوں۔ دو سال سے میں یہاں بیٹھ کر تپسیا کر رہا ہوں کہ شاید ایشور میری بات سنے اور میری مصیبت کو دور کرے تو مجھے وہ چیز دے جس سے زندگی آرام سے گذر سکے۔

اژدھا بولا۔ اچھا میں تمہیں ایک سنکھ دیتا ہوں جو ہر روز تمہیں ایک روپیہ دیا کرے گا یہ کہہ کر اژدہا سوراخ کے اندر گیا اور تھوڑی دیر بعد واپس آیا اور ایک سنکھ رچی کے ہاتھ میں دے کر بولا۔ ہر صبح نہا دھو کر ایک صاف چوکی پر بیٹھ جایا کرو اور اسے سجدہ کر کے کہا کرو دیوتا روپیہ دو۔

رچی سنکھ لے کر چل پڑا۔ راستے میں ایک گاؤں پڑتا تھا رچی نے دل میں کہا کہ رات یہیں گذار دو اور صبح کو چل پڑو اور اس سنکھ کو آزماتے چلو۔ شام ہونے والی تھی وہ ایک سرائے میں اتر پڑا۔ صبح ہوئی اس نے اژدہا کے کہنے کے مطابق ایک چوکی پر سنکھ کو رکھ دیا اور سجدہ کر کے کہا دیوتا روپیہ دو۔ جونہی اس نے یہ کہا سنکھ میں سے ایک چھوٹا سا آدمی نکلا اور ایک روپیہ رچی کے سامنے پھینک کر اور غائب ہو گیا۔ سرائے کا مالک یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا روپیہ دیکھ کر اس کی بھی رال ٹپک پڑی۔ اس نے نظر بچا کر ایک اور سنکھ وہاں رکھ دیا اور رچی والا سنکھ خود اٹھا لیا۔

رچی وہی سنکھ اٹھا کر چل پڑا اور راستے میں بڑا خوش کہ آرام سے گذرے گی۔ خیالی پلاؤ پکاتا ہوا چلا کہ اب میں یوں کروں گا وہ کروں گا۔ آخر گھر پہنچا۔ بیوی بھی سن کر بہت خوش ہوئی۔ اگلی صبح رچی نہا دھو کر چوکی پر بیٹھ گیا اور سجدہ کر کے بولا۔ دیوتا روپیہ دو۔ پھر دوسری دفعہ کہا، پھر تیسری دفعہ لیکن دیوتا وہاں ہوتا تو دیتا۔ رچی بغلیں جھانکنے لگا۔ سمجھ گیا کہ سرائے والا داؤ کھیل گیا ہے پھر ترچھی نظروں سے بیوی کو دیکھا جو ٹکٹکی لگائے سنکھ کو دیکھ رہی تھی آخر بیوی سمجھ گئی کہ یہ اسے دھوکہ دے رہا ہے جھٹ جوتا پکڑ لیا۔ ایک تو اور مار مار کر گدی پلپلی کر دی ______ نکھٹو۔ بدذات دھوکہ دیتا ہے ہیں۔ کم بخت پتہ نہیں کہاں رہا اتنا عرصہ۔ سویرے چل نکل یہاں سے۔

رچی پھر ندی میں پہنچا اور برتن سے اسی سوراخ میں پانی ڈالنا شروع کر دیا عرصہ دو ماہ کے بعد وہی اژدھا پھنکارتا ہوا نکلا اور بولا۔ کہو کیا چاہتے ہو۔

رچی نے ساری سرگذشت کہہ سنائی۔ اژدہے نے اسے ایک سنکھ اور دو روپے دیتے ہوئے کہا کہ لو یہ ناگ دیوتا کا پیو

سکہ ہے۔ [illegible] اسی طرح سرائے میں لیجا کر صبح کے وقت
[illegible] دیکھنا اور ایک روپیہ کا مطالبہ کرنا اس میں سے
[illegible] ایک نہیں دو اور تم دو روپے
[illegible] اپنے پاس سے یہ دو روپے چھپا کر جیب میں
ڈال لینا [illegible] دیتے [illegible] نہیں اس طور سے سرائے
والا تمہارے دام میں آجائے گا۔

رگھو نے اسی طرح کیا جیسا کہ ناگ دیوتا نے کہا تھا جب سرائے
والے نے دیکھا کہ یہ دوسرا سکہ ایک کی بجائے دو دیتا ہے تو اس سے
[illegible] اور پہلا سکہ رگھو کی گدڑی میں ڈال دیا اور لپوٹ سکہ نکال
لیا۔ رگھو [illegible] کر چنتا بنا اور آرام سے بسر اوقات کرنے لگا۔

اب سرائے والے کی سنئے۔ بیچارہ صبح سویرے اٹھا اشنان
کیا تلک لگایا اور سکہ کو ماتھا ٹیکا اور کہا کہ مہاراج دیوتا ایک
روپیہ تو دو" اتنے میں ایک بونا پھرتی سے ایک زریں تھیلی لئے
ہوئے باہر نکلا اور تھیلی میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا مہاراج ایک
کیا دو لو" سرائے والا بولا۔ اچھا دو دے دو۔ جواب ملا۔
"جناب دو کیا چار لو"۔ سرائے والے نے کہا "دیا آپ کی چار ہی
دے دیں"۔ بونا بولا "بس چار ہی پر بس ہے چار کیا ہیں چاہو تو آٹھ
لے لو۔ سرائے والے کی آٹھ کا نام سن کر آنکھیں کھل گئیں ایکدفعہ
پھر ماتھا ٹیکا اور بولا مہاراج آپ مجھ پر کرپا کریں اور آٹھ ہی عنایت
کریں۔ بونا بولا آپ بہت چھوٹے دل کے آدمی ہیں۔ فرمائے تو
کہئے تو سولہ دے دوں۔ سرائے والا اس کھینچا تانی سے تنگ آچکا
تھا [illegible] آپ کچھ دیں گے بھی یا یوں ہی دل لگی کرتے چلے جائیں گے
بونا بولا اچھا میں لاتا ہوں انتظار کرو اور جھٹ سے بھاگ کر سکہ
میں غائب ہوگیا۔ بیچارے سرائے والے سے روز یوں ہی ہونے لگی آخر تنگ
آگیا لیکن اس نے بونے سے تھیلی چھیننا چاہی پھر کیا تھا بونے نے اس کے
ہاتھ [illegible] تڑپ تڑپ کر مر گیا اور بونا ناگ دیوتا کے روپ میں پھنکارتا
ہوا اپنے سکہ میں غائب ہوگیا۔

محمد منیر، امرتسر

جج ملزم

جج۔ ملزم سے ! تمکو عمر قید کی سزا دی جاتی ہے۔
ملزم۔ حضور ! مجھ پر رحم کیجئے۔
جج۔ خاموش ! زیادہ بولے تو دو تین سال اور بڑھا دونگا۔

صابر فاروقی
مالیر کوٹلہ

"انڈیا" اینڈ "جرمنی"

(ماخوذ)

عزیز نونہالو !

آج ایک لطیفہ یاد آگیا ہے ذرا دلچسپ اس لئے سوچا
کہ کیوں نہ اسے نونہال کلب کے صفحات میں شائع کر دیا جائے
اوہو۔ آپ تو اس لطیفہ کو سننے کے لئے بے چین ہوگئے ہیں اچھا
تو سنئے :-

آج سے کوئی ۴۰ سال پہلے کی بات ہے ایک ہندوستانی
آدمی جن کا نام تو کچھ اور تھا لیکن آپ تھوڑی دیر کے لئے ان کا
نام . . . . انکا نام . . . .
مسٹر اشرف تصور کر لیجئے۔ ہاں تو میں آپ کو بتا رہا تھا کہ آج سے
چالیس سال پہلے اشرف نامی ایک صاحب برلن (جرمنی) میں
قیام پذیر تھے اور کیونکہ کافی عرصہ سے وہاں رہتے تھے اس لئے
جرمنی زبان خوب اچھی طرح جانتے تھے اور ان کی چند خوبیوں کی
بنا پر وہاں کے باشندے بھی ان کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتے
تھے ایک روز قہوہ خانے میں ان کی ملاقات ایک ہندوستانی سے
ہوئی۔ ہموطن ہونے کی وجہ سے دونوں میں خوب دوستی ہوگئی

اور وہ روزانہ قہوہ خانے میں ملنے لگے رفتہ رفتہ ان کے تعلقات اسقدر وسیع ہو گئے کہ انہوں نے ایک ہی جگہ رہنا شروع کر دیا۔ لیکن ان کے دوست کا کام جرمنی میں نہ چلا اس لئے وہ دلی جانا چاہتے تھے ہاں ہم نے آپکو یہ تو بتایا ہی نہیں کہ مسٹر اشرف کے دوست کا نام رام پرشاد تھا رام پرشاد کچھ تھوڑی سی تک بندی کر لیا کرتے تھے ایک روز انہوں نے اشرف صاحب سے کہا مسٹر اشرف آپکو معلوم ہے میرے کاروبار کی جو حالت یہاں ہے وہ اس قابل نہیں کہ میرا گذارہ ہو سکے اسلئے میں دلی جانا چاہتا ہوں مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہاں حکومت کو چند ہندوستانیوں کی سخت ضرورت ہے لیکن میرے پاس اتنی رقم نہیں کہ میں دلی جا سکوں کیا تم مجھے اتنی رقم ادھار دے سکتے ہو۔ میں وہاں پہنچتے ہی تمہاری تمام رقم واپس کر دونگا۔

”عزیز دوست یہاں پردیس میں ہندوستانیوں کی ایسی حالت نہیں ہے کہ وہ کسی کو قرضہ دے سکیں“ مسٹر اشرف نے کہا۔ —— ”تو پھر کیا کرنا چاہیئے؟“ رام پرشاد نے سوال کیا —— تھوڑی دیر تک سوچتے رہنے کے بعد مسٹر اشرف اچھل پڑے اور بولے میرے خیال میں یہ رقم ہندوستانیوں کی بجائے جرمنوں سے وصول کرنی چاہیئے۔

”لیکن جرمن ہم کو روپیہ ادھار نہیں دینے لگے“ رام پرشاد صاحب نے انتہائی مایوسی کی حالت میں جواب دیا ”لیکن دوست اگر تم کہو تو میں تمہیں ایک ایسی ترکیب بتاؤں کہ مطلوبہ رقم صرف چند گھنٹوں میں وصول ہو جاتے“۔ اشرف صاحب نے کہا —— تو پھر انتظار کس بات کا ہے۔ رام پرشاد صاحب بولے —— اور اشرف صاحب بولے [illegible]

”غالب صاحب سے [illegible] طرح واقف ہو نگے [illegible] ہندوستان کے بہت بڑے شاعر گذرے [illegible] ہیں، [illegible] بہت بڑا شاعر گذرا ہے [illegible] تھا۔ مرزا غالب کو شراب پینے کی عادت تھی اسی وجہ سے ان کی تمام عمر تنگ دستی میں گذری اور —— ” ابھی اشرف صاحب اپنا جملہ پورا بھی ذکر پائے تھے کہ ان کے دوست نے گرجتے ہوئے کہا ارے بھائی جہنم میں جائیں غالب اور گوئٹے مجھے تو آپ روپیہ وصول کرنے کی ترکیب بتائیں آپ ذرا اطمینان کے ساتھ سنیں میں آپ کو روپیہ وصول کرنے کی ہی ترکیب بتا رہا ہوں —— ہاں تو کل آپ ہمبرگ ہال میں گوئٹے اور غالب کی شاعری پر ایک تقریر کریں گے اور داخلہ بذریعہ ٹکٹ ہوگا کیوں ٹھیک ہے نا —— لیکن جناب میں تو جرمنی زبان جانتا بھی نہیں اور نہ ہی مجھ میں اتنی قابلیت کہ غالب اور گوئٹے کی شاعری پر کوئی لیکچر دے سکوں مسٹر اشرف کے دوست بولے۔

اجی حضرت جرمنی زبان کی کوئی ضرورت نہیں آپ اردو میں لیکچر دیں گے جو کچھ بھی آپ کی سمجھ میں آتا جائے کہتے جائیے گا بس اتنا خیال رہے کہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد آپ غالب اینڈ گوئٹے کہتے رہیں۔

ترکیب معقول تھی رام پرشاد فوراً رضامند ہو گئے اگلے روز جرمنی کے تمام اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی کہ کل شام ۸ بجے ہندوستان کے بہت بڑے ادیب جناب لالہ رام پرشاد صاحب ہمبرگ ہال میں غالب اور گوئٹے کی شاعری پر ایک لیکچر دیں گے۔ داخلہ بذریعہ ٹکٹ ہوگا۔ اور ٹکٹ ہمبرگ ہال پر دستیاب ہو سکیں گے۔

تاریخ مقررہ پر ۱۲ بجے سے ہی لوگ جوق در جوق ہمبرگ ہال کی طرف جانے لگے اور ۲ بجے تک تمام ہال بھر گیا جرمنی کے ایک مشہور ادیب کو صدارت کی کرسی پہ بٹھایا گیا اور ٹھیک چار بجے ہندوستان کے مایہ ناز ادیب جناب لالہ رام پرشاد صاحب نے یوں کہنا شروع کیا۔

بھائیو! مرزا غالب سے تو آپ اچھی طرح واقف ہونگے

وہ ہندوستان کے بہت بڑے شاعر گذرے ہیں اسی زمانے میں جرمنی میں بھی گوئٹے نام کا ایک زبردست شاعر گذرا ہے مرزا غالب کو شراب پینے کی بہت عادت تھی اسی وجہ سے ان کی تمام عمر تنگدستی میں گذری "غالب اینڈ گوئٹے"

لالہ جی کے منہ سے جونہی "غالب اور گوئٹے" کے الفاظ نکلے جرمن لوگوں نے فوراً تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ تھوڑی دیر تک ہال تالیوں کی آواز سے گونجتا رہا اور لالہ جی نے پھر کہنا شروع کیا۔

مرزا غالب دہلی میں رہتے تھے دہلی ہندوستان کا دارالخلافہ ہے وہاں کا گھنٹہ گھر ہے اور وہاں ایک چاندنی چوک بھی ہے چاندنی چوک میں بڑی بھیڑ رہتی ہے ہر وقت سودے والوں کی آوازیں آتی رہتی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ سب کہہ رہے ہوں "غالب اینڈ گوئٹے" اپنے ملک کے شاعر کا نام ہندوستانی ادیب کے منہ سے سن کر عوام بہت خوش ہوئے اور ایک مرتبہ ہال پھر تالیوں کی صدا سے گونج اٹھا۔ تھوڑی دیر بعد لالہ جی نے اپنا لیکچر شروع کر دیا اور بولے۔ دہلی سے سو میل کے فاصلہ پر سہارنپور ہے وہی میرا ضلع ہے وہاں کے گنے بہت مشہور ہیں۔ یہ غالب اور گوئٹے کی بدقسمتی تھی کہ وہ سہارنپور تک نہ پہنچ سکے اگر وہ ایک مرتبہ وہاں کے گنوں کا رس پی لیتے تو پھر عمر بھر شراب کا نام بھی نہ لیتے اور اس سے بھی زیادہ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ وہ ضلع مظفر نگر تک بھی نہ پہنچ سکے اگر وہ وہاں کا گڑ کھا لیتے تو پھر بسکٹ کھانا بھی بھول جاتے "غالب اینڈ گوئٹے" یعنی "انڈیا اینڈ جرمنی"۔

اس مرتبہ غالب اینڈ گوئٹے کے ساتھ ساتھ انڈیا اینڈ جرمنی کے نعرے پر سہاگہ کا کام کیا لوگوں نے تالیاں بجانا اور شور مچانا شروع کیا۔ تقریباً آدھ گھنٹہ تک لوگ خوب غل مچاتے رہے بڑی مشکل سے صدر صاحب نے ان سب کو خاموش کیا تو لالہ جی نے پھر کہنا شروع کیا۔

بھائیو! اب میں آپ کے سامنے غالب کی شاعری کے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔ ملاحظہ ہوں:۔

؎ عشق نے غالبؔ نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

اس شعر کو سن کر مسٹر اشرف کرسی پر سے اچھل پڑے انہوں نے تالی بجائی اور ان کی تقلید میں ہال پھر اسی آواز سے گونج اٹھا

بھائیو اور سنئے ایک جگہ غالب صاحب فرماتے ہیں:۔

؎ پاگلوں کی کمی نہیں غالبؔ
جرمنی میں ہزاروں ملتے ہیں

اس شعر کو سن کر لوگوں نے پھر تالیاں بجائیں۔ ہال واہ واہ اور "انڈیا اور جرمنی" کے فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھا۔ معلوم ہوتا تھا غالب کی شاعری ان لوگوں کو بہت پسند آئی۔ اس کے بعد لوگوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لالہ جی اسٹیج سے نیچے اترے اور مسٹر اشرف نے اسٹیج پر چڑھ کر جرمنی زبان میں کہا کہ میں آپ لوگوں کا بہت مشکور ہوں کہ آپ نے اپنا قیمتی وقت یہاں ضائع کیا آج میرے ہم وطن نے ایسی تقریر کی ہے جو شاید برلن میں آج تک نہ ہوئی ہو میں اس تقریر کا ترجمہ کل ملک کے تمام اخباروں میں شائع کراؤں گا تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کے مایۂ ناز ادیب نے آپ کے سامنے کیا کیا گل افشانیاں کی ہیں۔ ہال ایک مرتبہ پھر تالیوں کی صدا سے گونج اٹھا۔ لوگ رام پرشاد صاحب سے ہاتھ ملانے کو آگے بڑھے اور گھنٹہ بھر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

شام کے وقت جب مسٹر اشرف ہندوستان کو روانگی کے لئے برلن کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو ان کی اور ان کے دوست دونوں کی جیبیں نوٹوں سے بھری ہوئی تھیں اور وہ بہت خوش تھے جب گاڑی روانہ ہوئی تو مسٹر اشرف نے اپنا رومال ہلاتے ہوئے "غالب اینڈ گوئٹے" کا نعرہ لگایا اور جواب میں لالہ جی نے [illegible]

گرجدار آواز میں "انڈیا اینڈ جرمنی" "سائیفروگیا" اور مسٹر اشرف غالب کا یہ شعر پڑھتے ہوئے اپنی جائے قیام کی طرف روانہ ہوئے

؎ پاگلوں کی کمی نہیں غالب
جرمنی میں ہزاروں ملتے ہیں

ضیاء الاسلام انصاری ضیا

چوٹیں

ملازمہ:- میں دیکھوں تو کہ بیگم صاحبہ مکان میں ہیں یا نہیں۔
(واپس آکر) مجھے افسوس ہے کہ بیگم صاحبہ اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔

مہمان نووارد عورت:- کیا اتفاق ہے کہ میں اپنا تعارفی کارڈ بھی ساتھ نہ لائی۔

ملازمہ:- ارے اس کا مضائقہ نہیں میں نے بیگم صاحبہ سے کہہ دیا ہے کہ آپ کون ہیں۔

ایک شخص نے کسی بہت موٹے آدمی کو ریل میں زیادہ جگہ گھیرے بیٹھا ہوا دیکھ کر کہا۔
کیا ریل ہاتھی کے بچوں کے لئے مخصوص ہے؟
موٹے آدمی نے جواب دیا۔ نہیں صاحب کتے۔ بلی۔ گدھے سب کے لئے ہے آئیے بیٹھئے "چشم ما روشن دل ما شاد"

ذکیہ کرامت، لاہور

نئے سال کا ترانہ

پوچھتے ہو۔ اب حال کیا ہے؟
ہر دل میں ایک خیال نیا ہے۔
نئی امنگیں۔ سال نیا ہے۔
قحط وطن سے دور کریں گے
جو کہتے ہیں منظور کریں گے
امن کا جھنڈا ہاتھ میں لیں گے
ملت کی قسمت بدلیں گے
آزادی کا دن دیکھیں گے
خود غرضی اب چھوڑیں گے ہم
دشمن کا منہ موڑیں گے ہم
پھول کھلیں گے پیارے پیارے
جیسے ہوں آسمان پہ تارے
قدم بڑھائیں گے ہم سارے
محنت سے ہر کام کریں گے
اونچا وطن کا نام کریں گے

کنور چرن سنگھ نرمان

موسم بہار کا منظر

دنیا میں چار موسم ہیں ان میں سے ایک موسم بہار ہے یہ موسم اپنے ساتھ دنیا کے لئے فرحت کا سامان لاتا ہے سوکھے ہوئے درخت اور پتے ہرے بھرے ہو جاتے ہیں گویا

ہیں [illegible] بعض ڈالیاں پھولوں کے بوجھ سے جھک کر زمین
پر [illegible] پھول اپنی خوبصورتی سے بھونروں کو اپنی طرف
[illegible] بھی ہوا کا جھونکا آتا ہے تمام باغ پھولوں
کی خوشبو سے مہک اٹھتا ہے۔ طرح طرح کے پرندے اس سے
لطف اٹھانے کے لئے درخت پر اڑتے رہتے ہیں۔ کہیں بلبل
چہچہاتی ہے کہیں قمری گاتی ہے۔ کہیں کوئل کوکتی ہے اور کہیں
[illegible] کرتی ہے۔ چڑیاں [illegible] ادھر ادھر اڑتے پھرتے نظر آتے
ہیں [illegible] خوش ہیں کہ ان کی محنت ٹھکانے لگی۔

قدرت کے مناظر دیکھنے کے لئے شوقین لوگ شہر کے باہر [illegible] چلے جاتے ہیں اور قدرت کے مناظر سے جی خوش کرتے ہیں۔ دن بھر کے غم اور تکالیف بھول جاتے ہیں مستانہ وار بلبلوں کے نغمے سنا کرتے ہیں۔ اپنا تھکا ہوا دماغ تازہ کرتے ہیں۔ موسم بہار میں دنیا دلہن کی طرح بن سنور جاتی ہے۔ اور آنکھوں کو خوش کرتی ہے۔

سید غوث

ہمارے بھائی جان

بھائی جان ہر وقت اپنی بڑائی کرنے میں مصروف رہتے ہیں میں اور شمیم ان کی بیجا شیخیوں سے بہت پریشان ہوتے ہیں لیکن کر کیا سکتے ہیں۔ آخر بڑے ہیں۔

ایک دن میں اور شمیم کیرم کھیل رہے تھے کہ اتنے میں بھائی جان آ گئے اور آتے ہی کہنے لگے۔ شمیم تمہیں بالکل کھیلنا نہیں آتا کوشش سے ادا رکھی ہے مگر تم اسے نہیں لیتے۔

حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ بھائی خود کئی مرتبہ شمیم سے ہار چکے تھے شمیم نے جھنجلا کر کہا تو آپ ہی کر کے دکھائیے اسے۔ مسکرا کر بولے۔ لاؤ ایک ہی بار میں پہونچا دوں اسے تمنے مجھے سمجھا کیا ہے۔

لیکن تین مرتبہ میں بھی کوئن اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں تب وہ بولے۔ یہ اسٹرائیکر بہت خراب ہے میں دوسرا اسٹرائیکر لے آؤں۔ یہ کہکر وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔ ہم نے کھڑکی میں سے دیکھا وہ سائیکل پر کہیں جا رہے تھے۔

ایک دن میں اور شمیم کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں وہ آ گئے اور کہنے لگے۔ کیوں پڑھ نہیں رہے ہو۔

میں نے کہا۔ میں آج ایک بات سوچ رہا ہوں کہ درجہ میں میری ایک لڑکے سے بحث ہوئی ہے بات دراصل یہ ہے کہ وہ لڑکا کہتا ہے کہ سورج زمین سے صبح کے وقت زیادہ نزدیک ہوتا ہے اور ثبوت یہ دیتا ہے کہ صبح کے وقت سورج زیادہ بڑا دکھائی دیتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ سورج دوپہر کو زمین سے قریب ہوتا ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ دوپہر کو گرمی زیادہ ہوتی ہے اس لئے وہ بہ نسبت صبح کے زمین سے زیادہ نزدیک ہوتا ہے کیونکہ صبح تو بہت ٹھنڈک ہوتی ہے۔ بھائی جان آپ بتائیے کون درست کہتا ہے میں یا وہ۔

بھائی جان کچھ جواب نہ دے پائے اور یہ کہہ کر چلے گئے مجھے چچا جان بلا رہے تھے۔ میں اور شمیم زور سے ہنسے۔

دیکھا آپ نے ہمارے بھائی جان کو پھر کبھی ان کی دلچسپ باتیں آپ کو سنائی جائیں گی۔

(مضمون نگار صاحب نام لکھنا بھول گئے)

فہرست ممبران نونہال کلب ۱۹۴۷ء

۱/ح - ضیاء الاسلام انصاری ضیا ولد محمد فاروق صاحب بیری والا بازار رڑکی ۱۹۳۰ء

۲/ح - ایم۔ زیڈ جابر قریشی ولد ایم طاہر صاحب نئی بستی علیگڈھ ۱۹۲۹ء

۳/ح عبدالغنی انوتی ولد عبدالحمید صاحب نواب گنج ذکر باسل دہلی ۱۹۱۳ء

سنہ ۱۹۳۲ء

۴۔ عطاء الرحمن انصاری ولد محمد فاروق صاحب ۴۹۷۰ بیری والا باغ دہلی

۵۔ سید انعام الہی شمسی ولد شیخ ظہور الٰہی صاحب سی لٹ ویرشنکیٹا جی کشنہ ۲

۶۔ اعجاز احمد بخاری ولد نواب مولانا حسن صاحب ۱۹ فیروز پور روڈ لاہور سنہ ۲۲ء

۷۔ عرفان الٰہی حق شمسی ولد نور الٰہی صاحب شوبلڈنگ محلہ کٹرہ کالا عراد آباد سنہ ۲۹ء

۸۔ نور احمد نوری ولد نواب علی صاحب سار نگپور مسجد قصائی کی جوتی چال احمد آباد سنہ ۳۱ء

۹۔ فضل الرحمن ولد حاجی ایم فاروق صاحب الشار منزل باہمی پنجابیان،
پل بنگش دہلی سنہ ۱۹۳۵ء

۱۰۔ عثمان احمد ولد رضوان احمد صاحب معرفت حکیم محمد ادریس صاحب۔
نواب گنج دہلی سنہ ۱۹۲۹ء

۱۱۔ منیر احمد ولد ظہیر احمد صاحب ۳۸۴۳ کھاری باغ دہلی سنہ ۳۰ء

۱۲۔ احسان احمد ولد افتخار احمد صاحب نواب گنج مظفر نگر یو۔پی سنہ ۳۲ء

۱۳۔ ایم۔ اے۔ ایم لطیف ولد ایس۔ ایم حنیف صاحب بیری والا باغ دہلی سنہ ۳۱ء

۱۴۔ توفیق حسین بخاری ولد سید محمد حسن صاحب کوٹ پیراں والا قصور
ضلع لاہور سنہ ۳۱ء

۱۵۔ محمد خالق ولد محمد عبد التواب صاحب ۳۰۹ شو بازار اسٹریٹ کلکتہ سنہ ۲۵ء

۱۶۔ عبد الجبار صاحب شمسی ولد شمس العارفین اسٹینڈرڈ ہوٹل ہاؤس آگرہ سنہ ۳۰ء

۱۷۔ ذکر الرحمن سوت والا ولد حبیب الرحمن صاحب ۸۲۷ بیری والا باغ دہلی سنہ ۲۷ء

۱۸۔ آمنہ بیگم بنت فضل احمد صاحب معرفت شیخ کمپنی ۹ کولوٹولہ اسٹریٹ
کلکتہ

۱۹۔ اے بشیر احمد ولد اے فقیر احمد صاحب ۹ ویسٹ سکاسی پالم ترچناپلی

۲۰۔ مس زکیہ کرامت بنت شیخ کرامت علی صاحب ایم۔ ایل۔ اے دار الکرامت
شیخوپورہ لاہور

۲۱۔ ملک غلام محمد اختر ولد صوبیدار گل محمد صاحب گارڈن کالج راولپنڈی سنہ ۲۹ء

۲۲۔ محمد یوسف ولد اے۔ کے رشید صاحب ۱ عذرا اسٹریٹ کلکتہ سنہ ۲۹ء

۲۳۔ محمد اسرار الحق ولد محمد ظہور الاسلام صاحب پٹھان ٹولی شاہ آباد سنہ ۳۰ء

۲۴۔ بی۔ ایم تکیہ گل ولد عبد الحی گل منزل حلوائی بازار،
انبالہ چھاؤنی سنہ ۲۹ء

۲۵۔ نور محمد صابر فاروقی ولد چودھری محمد نعمت اللہ صاحب سرہند کی گیٹ
مالیر کوٹلہ سنہ ۳۲ء

۲۶۔ سلطان احمد ولد عبد الحمید صاحب دوائی والے میڈیسن سپلائی ایجنسی
۸۱ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ سنہ ۳۱ء

۲۷۔ نور الدین احمد ولد حافظ محمد شفیع صاحب ۵۸/۱ مرغی ہٹہ کلکتہ

۲۸۔ عبد القیوم صاحب ولد عبد الولی صاحب کھاری باغ روشن آرا روڈ دہلی

۲۹۔ مسماۃ خانم بنت محمد وسیم صدیقی صاحب ۳۹۴۳ قرول باغ دہلی

۳۰۔ ایم۔ ایم عابد ولد ایم۔ ایم حامد ۱۰/۱ ماچیدہ روڈ ڈرائین اے سی سول لائن
دہلی سنہ ۱۹۳۰ء

۳۱۔ اسد اللہ احمد ولد عبد اللہ صاحب اقبال منزل کاچی گوڑہ حیدرآباد دکن سنہ ۳۰ء

۳۲۔ محمد حنیف صدیقی ولد محمد حسین صاحب مولینا انگلو ورنیکلر،
ہائی اسکول پونہ سنہ ۱۹۳۱ء

۳۳۔ ساجدہ خاتون بنت پروفیسر صغیر احمد جان گنگوہی ایم والی منہاپ گنج دہلی

۳۴۔ ملک عبد الغنی اعوان ولد ملک احمد سعید صاحب کمرہ نمبر ۵ ویسٹ ہال
ایف سی کالج لاہور سنہ ۳۰ء

۳۵۔ محمد یحییٰ ولد محمد اسحاق صاحب نائی منڈی طالب پورہ آگرہ سنہ ۳۲ء

۳۶۔ سید فیاض الدین احمد ولد سید کبیر الدین احمد صاحب ڈاکٹر
سرش سرکار روڈ ڈاکخانہ انٹالی کلکتہ سنہ ۳۳ء

۳۷۔ فقیر احمد غنی شمسی ولد عبد الوہاب صاحب بازار شاہی مسجد مراد آباد [illegible]

۳۸۔ خالد لطیف قریشی ولد محمد حیات صاحب ۳۹ قیسر ملا،
سودی اسٹریٹ بمبئی ۱ سنہ ۲۹ء

۳۹۔ مسعود پرویز ولد جی۔ ایس شیخ صاحب ڈگری گیٹ کریم بخش بلڈنگ
پشاور سنہ ۳۲ء

۴۰۔ مس اختر النساء فرحت بنت چودھری حبیب اللہ خاں صاحب گوجرانوالہ سنہ ۳۱ء

۴۱۔ ممنون علی خاں ولد امین علی خاں صاحب محلہ والا ڈاکخانہ شاہجہانپور یو۔پی

۴۲۔ رضا علی خاں ولد مظہر علی خاں صاحب " سنہ ۳۱ء

۴۳۔ سید رضی الدین احمد ولد سید وصی احمد صاحب جوگیہ ٹولہ پٹنہ سٹی سنہ ۳۳ء

۴۴۔ بسم اللہ خاں ولد محبوب علی خاں صاحب قاسم پورہ سنہ ۳۰ء

۴۵۔ سید احمد سعدی ولد سید قدرت علی صاحب نمبر ۳ مارکیٹ اسٹریٹ
کلکتہ ۱۶ سنہ ۱۹۳۰ء

۴۶۔ محمد یوسف ولد حاجی محمد امین صاحب ۵۵۹۹ نیا محلہ پل بنگش دہلی سنہ ۳۰ء

۴۷۔ ساجد حسین ولد فرحت حسین صاحب ۷۲ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ سنہ ۱۹۲۶ء

۴۸۔ خان زمان خاں ولد شاہ جہان خاں صاحب تحصیل کیمبل پور ڈاکخانہ خورشتی

۴۹۔ پرویز جمال زبیری ولد محمد حسین صاحب بلاک ۵/۴۵ ریلوے کوارٹر
سول لائن الہ آباد سنہ ۳۲ء

۵۰۔ محمد عطاء اللہ خاں ولد محمد عطاء اللہ خاں صاحب پارک نمبر ۴ شاہجہانپور ضلع میرٹھ ۱۹۳۰ء

۵۱۔ محمد مسعود خاں ولد ملک غلام علی خاں تحصیل فتح جنگ ضلع کیمبل پور ۱۹۳۲ء

۵۲۔ نسیم احمد آزاد ولد اشتیاق احمد صاحب تعلقدار میکل کمپنی منظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد دکن ۱۹۳۲ء

۵۳۔ محمد تقی شملہ ولد حاجی محمد صدیق صاحب پنجابی اسلامیہ ہائی اسکول صدر بازار دہلی ۱۹۳۱ء

۵۴۔ حمیدہ بنت خلیفہ محمد اسلم صاحب سیف آباد گیٹ ریاست پٹیالہ

۵۵۔ محمد عبد اللہ ولد حاجی احمد صاحب ۳۰ کالیکٹ اسٹریٹ فورٹ بمبئی ۱۹۲۹ء

۵۶۔ محمد صابر بمبئی ولد محمد باقر صاحب معرفت محمد ایوب صاحب ۱۲۷ دین روڈ بمبئی ۸ ۱۹۳۲ء

۵۷۔ مرزا انور بیگ ولد مرزا احمد دین صاحب چک نمبر ۸۹ ڈاکخانہ شہانہ ضلع لائلپور ۱۹۳۰ء

۵۸۔ حمیدہ رشیدہ بنت مرزا سمیع اللہ خاں صاحب جاگیردار بہاولنگر ریاست بہاولپور ۱۹۲۹ء

۵۹۔ منور علی خاں ولد کشور علی خاں صاحب محلہ والدوالک شاہجہانپور یو۔پی

۶۰۔ صالح محمد مسرور ولد عبد الرحمن صاحب کشلری درخت کھجور بازار کراچی ۲ ۱۹۲۹ء

۶۱۔ محمد یوسف ولد باقر علی صاحب ٹمبر روڈ گلزار بلڈنگ کراچی ۱۹۳۲ء

۶۲۔ محمد عثمان ولد محمد یعقوب صاحب معرفت فضل الرحمن صاحب ریلوے گارڈ نوشہرہ ریلوے اسٹیشن ۱۹۳۲ء

۶۳۔ اسمٰعیل غلام ولد حسین صاحب ۸۲ ٹیمبکر اسٹریٹ بمبئی ۸ ۱۹۳۲ء

۶۴۔ پیر رشید کاولہ نقیر محمد صاحب ۲۶ اے درگاہ روڈ پوسٹ سرکس کلکتہ ۱۷ ۱۹۳۳ء

۶۵۔ عبد الودود ضیا صدیقی ولد فضل الٰہی صاحب محلہ ڈھکی شریف مکان نمبر ۳۴۴۷ پشاور ۱۹۳۱ء

۶۶۔ سیدہ مٹی تجمل ہاشمی ولد سید فخر الدین ہاشمی من دیو دھرم سالہ ضلع کانگڑہ (پاکستان) ۱۹۳۲ء

۶۷۔ سید رضی الدین ہاشمی ولد سید فخر الدین صاحب ہاشمی من دیو دھرم سالہ ضلع کانگڑہ (پاکستان) ۱۹۲۹ء

۶۸۔ رضیہ رشیدہ بنت مرزا سمیع اللہ خاں صاحب بہاولنگر ریاست بہاولپور

۶۹۔ [illegible]

۷۰۔ سیدہ خاتون [illegible]

۷۱۔ کے۔ ایم حسین ناصر ولد خواجہ غلام حسن صاحب معرفت کاشمیری بھائیوں کی دکان کٹرہ گھسیاں امرتسر ۱۹۳۰ء

۷۲۔ منصور احمد رضی ولد عظمان صاحب دوست محمد خاں صاحب سیکنڈری ہائی اسکول سلیم یارخاں ۱۹۳۰ء

۷۳۔ سرور خاں خوش دل ولد محمد جان صاحب اسلامیہ اسکول پشاور ۱۹۳۲ء

۷۴۔ سید ابرار حسین اظہر ولد خان صاحب سید مظفر حسین مولا چڑہ امراؤتی برار ۱۹۳۱ء

۷۵۔ محمد نعیم الرحمن ولد محمد عبد الجلیل صاحب کوچہ حیدر حسین دائی مدراس ۱۹۳۲ء

۷۶۔ حافظ محمود الحسن ناصر ولد مولوی محمد یونس صاحب عبد اللہ پور ضلع لائلپور ۱۹۲۹ء

۷۷۔ سید مقصود علی ولد سید رمضان علی صاحب قومی لائبریری عمرانی محلہ بھوپال ۱۹۳۰ء

۷۸۔ عبد الرحمن ولد عبد الحق صاحب سمنٹ چال نمبر ۲ روم نمبر ۱۴ مومن پورہ ۱۹۳۱ء

۷۹۔ سید محمد قمر سبا ولد سید بندہ علی صاحب ۱ آغاخاں بلڈنگ مانڈوی محلہ امام بارہ روڈ بمبئی ۹ ۱۹۲۸ء

۸۰۔ محمد منیر ولد چودھری محمد اقبال صاحب کوچہ حاجی امام دین کشمیری بازار سیالکوٹ ۱۹۳۰ء

۸۱۔ عمران احمد ولد رضوان احمد صاحب معرفت خلیفہ محمد ادریس صاحب نواب گنج دہلی ۱۹۳۲ء

۸۲۔ محمد مصطفیٰ مرادآبادی ولد محمد حسن صاحب نوولٹی اسٹور فرسٹ فلور ۵۹ بنیان روڈ بمبئی ۳ ۱۹۳۰ء

۸۳۔ شکیلہ بیگم بنت عبد الحمید صاحب ہوٹل جامع مسجد کی دیوار والی احاطہ کالے خاں دہلی

۸۴۔ سراج احمد قادری ولد شفیع احمد صاحب معرفت کرم غنی صاحب ہند موتی محلہ اجمیر ۱۹۲۹ء

۸۵۔ سید محمد منظور الحسن ولد حکیم محمد تقی صاحب ۱۴/۱ بہادر گنج الہ آباد یو۔پی ۱۹۲۳ء

۸۶۔ عبد القیوم ولد محمد خلیل اللہ صاحب ۱۹ ارل ہوسٹل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۲۸ء

۸۷۔ حافظ محمد ایوب خانی ولد محمد یوسف صاحب چک نمبر ۲۲۲ لائلپور ۱۹۳۰ء

۸۸۔ سمیع اللہ صدیقی ولد عنایت اللہ صاحب ۹۰ پی۔ڈی کیڈ گنج الہ آباد ۱۹۳۱ء

۸۹۔ ایس رشید احمد شمسی ولد ایس ایم رحمان صاحب معرفت رحمان الحق خاتون کتاب گھر اردو بازار دہلی ۱۹۲۹ء

۹۰۔ ضمیر احمد ولد شیخ حبیب الرحمن صاحب ۷۴۸ بیری والا باغ دہلی ۱۹۳۰ء

۹۱۔ نفیس احمد ولد نواب صاحب چرچ روڈ دہلی چھاؤنی ۱۹۳۱ء

۹۲۔ عبد الرشید قریشی ولد عبد الغنی صاحب مرحوم گلی مکھن والی بیریوالا باغ دہلی ۱۹۳۰ء

۹۳۔ علیم حکمت صدیقی ولد حسام الدین صاحب ۱۳۹ کیڈ گنج الہ آباد ۱۹۳۲ء

۹۴۔ ایم سعید پاکستانی ولد ایم اسحاق [illegible] دہلی ۱۹۳۰ء

۹۵۔ محمد الیاس [illegible] ۱۹۳۲ء

۹۶۔ محمد حنیف ولد عبداللہ صاحب انگو دیپو ۹ ملا ابیکاؤنی ناسک ۳۰ سنہ

۹۷۔ محمد حسن آنند ولد حاجی عبداللہ صاحب پاپڑ اقبال روڈ مالیگاؤں ناسک ۳۰ سنہ

۹۸۔ لیلیٰ ناہید عرفانی بنت محمد احمد صاحب عرفانیہ بلڈنگ قادیان پنجاب پاکستان

۹۹۔ جمیلہ پروین عرفانی ولد محمود احمد صاحب عرفانیہ بلڈنگ قادیان پنجاب پاکستان

۱۰۰۔ محمد ضیاء الحق ولد محمد وحید الحق صاحب ۵ لوالا فی دت اسٹریٹ کلکتہ ۳۲ سنہ

۱۰۱۔ شاہ جمیل ولد محمد رفیع خان صاحب ۲ لیرش سکوائرین کلکتہ ۳۱ سنہ

۱۰۲۔ عبدالرحمن ولد امیر محمد خان صاحب کوچہ ثناءاللہ خان چوک ناصر خان پشاور ۱۹۳۱ سنہ

۱۰۳۔ عبدالحلیم ولد ریحان صاحب حکیم بک اسٹال رائے پور ۳۱ سنہ

۱۰۴۔ نعیم الرحمن ولد خان بہادر محمد فضل الرحمن صاحب محلہ چوک سہارنپور یو۔پی ۳۰ سنہ

۱۰۵۔ سعید احمد ولد شبیر احمد صاحب ۳۳ شری رام بھون بندر روڈ داور بمبئی ۳۰ سنہ

۱۰۶۔ شہزادہ افتخار حسین ناز ولد محی الدین صاحب کلاتھ مرچنٹ کٹرہ کرم سنگھ امرتسر ۲۹ سنہ

۱۰۷۔ آمنہ سلطانہ بنت سید محمد تقی صاحب ۱۵ بہادر گنج الہ آباد

۱۰۸۔ اسلام محمود اختر سالک ولد کرم الٰہی صاحب ہیڈ منشی محلہ تلیانوالہ منٹگمری ۳۲ سنہ

۱۰۹۔ آفتاب احمد ولد رحمت الٰہی صاحب احاطہ کالے صاحب گلی قاسم جان دہلی ۳۰ سنہ

۱۱۰۔ شبیر احمد ولد حافظ رحمت الٰہی صاحب " " " ۳۲ سنہ

۱۱۱۔ وحیدہ خاتون بنت حاجی میر احمد حسین صاحب ہارون مینشن نیو کالونی ناگپور

۱۱۲۔ سیف الدین ظفی ولد رحمت علی صاحب لکھیرا والی رائے پور ۳۲ سنہ

۱۱۳۔ سید منور علی ولد سید مقصود علی صاحب ناظم سری پورہ کوٹہ راجپوتانہ ۳۰ سنہ

۱۱۴۔ قمر الحق ولد سلمان محمد صاحب ۲ حمام الہ آباد یو۔پی ۳۲ سنہ

۱۱۵۔ ایس۔ ایم یوسف ولد اے حمید صاحب ایم حنیف ایس اے غفور منشی بازار آسنسول ۳۲ سنہ

۱۱۶۔ ایس اے غفور ولد ولی محمد صاحب منشی بازار آسنسول ۲۵ سنہ

۱۱۷۔ عبدالعزیز نعمہ ولد لاڈلے صاحب ۱۵/۱ اتوار پیٹھ شولاپور ۳۰ سنہ

۱۱۸۔ محمد خورشید ندوی ولد عبدالعزیز صاحب مہاجرین ہائی اسکول ننگلہ کنڈ ملیا کیپ آسنسول ۳۱ سنہ

۱۱۹۔ پروین کوثر ولد ایس۔ بلہ صاحب اسلام گنج دہلی

۱۲۰۔ منصور الحق ولد مفتاح الحق صاحب ۲/۱۴۶ لکھے۔ ایل کیڈ گنج الہ آباد ۳۱ سنہ

۱۲۱۔ پروین خانم بنت محمد سلیمان صاحب قریشی لائبریری دفتر امرتسر ۳۱ سنہ

۱۲۲۔ حامد یار خاں ولد محمد یار خاں صاحب معرفت حامد یار خاں آزاد کرنیل گنج کانپور

۱۲۳۔ اسعد یار خاں آزاد ولد محمد یار خاں صاحب کرنیل گنج کانپور ۳۱ سنہ

۱۲۴۔ محمد ناظم ولد محمد یوسف صاحب تمباکو اسٹریٹ مراد آباد ۳۴ سنہ

۱۲۵۔ محمد صادق ولد محمد عاشقین معرفت شوا امپوریم شو مارکیٹ آگرہ ۳۱ سنہ

۱۲۶۔ مس نسیم شہناز بنت حکیم جمال الدین صاحب گلی عوض خاں منصور نمبر ۱ بیڈی دہلی ۳۰ سنہ

۱۲۷۔ انور صلاح الدین ولد " " " " " "

۱۲۸۔ ایس یامین الدین ولد ڈاکٹر کمال الدین صاحب " " " ۳۲ سنہ

۱۲۹۔ نثار الحق کاشمیری ولد میاں نظام الدین بازار حکیماں کوچہ فقیراں اندرون بھاٹی گیٹ ۳۰ سنہ

۱۳۰۔ عابد رضا عابد ولد محمد علی صاحب معرفت زین العابدین گلی امام باڑہ محلہ نمازکا اجمیر ۲۹ سنہ

۱۳۱۔ ڈی ایم لطیف ولد ڈی۔ ایم اوبیا صاحب جامع مسجد روڈ منگلور ۲۹ سنہ

۱۳۲۔ صالح احمد ولد حافظ محمد ادریس صاحب جاپان ہاؤس کلکتہ ۲۹ سنہ

۱۳۳۔ اصغر علی قریشی ولد دین محمد صاحب کوچہ امام نصیر الدین جالندھر ۲۹ سنہ

۱۳۴۔ محمد سلیمان ولد محمد اسمٰعیل صاحب جان معرفت فیروز شاہ مہتہ روڈ فورٹ بمبئی ۳۱ سنہ

۱۳۵۔ کنیز فاطمہ عشرت سندیلوی بنت اسعد علی خاں صاحب علی منزل وزیر گنج لکھنؤ

۱۳۶۔ محمد الحق قادری ولد چودھری نصیر الدین صاحب کوچہ نقاداں قلعہ بھنگیاں امرتسر ۳۶ سنہ

۱۳۷۔ محمد عابد سلام انصاری مسلم اینگلو عربک اسکول چادر گنج پٹنہ سٹی ۳۴ سنہ

۱۳۸۔ ایس۔ اے سلطانہ بنت محمد یونس صاحب یونس منزل تمباکو اسٹریٹ مراد آباد

۱۳۹۔ محمد رفیق نور ولد نظام الدین صاحب کوچہ امام ناصر الدین صاحب جالندھر ۳۰ سنہ

۱۴۰۔ ایم ایس الملقب فاطمہ غائب بنت سید تصدق حسین اندرون پیر دروازہ بھوپال

۱۴۱۔ قدسیہ خاتون بنت بدر الدین احمد صاحب سجاد منزل بیگم گنج بارہ بنکی ۳۴ سنہ

۱۴۲۔ ایم۔ ایس عتیق انعر وز ولد سید تصدق حسین صاحب اندرون پیر دروازہ بھوپال

۱۴۳۔ منورہ جمال بنت محمود الحسن صاحب نیو کالونی ناگپور

۱۴۴۔ اختر جمال بنت محمود الحسن صاحب " "

۱۴۵۔ نسیم فاطمہ بنت ڈاکٹر رحمت بیگ صاحب مرزاپور روڈ مرزاپور احمد آباد

۱۴۶۔ محمد رفیق غمگین ولد عمر دین صاحب غمگین راجپوت اسپورٹس کمپنی بمبئی ۲۹ سنہ

۱۴۷۔ محمد سعید ولد محمد نسیم صاحب احاطہ کالے صاحب دہلی ۳۲ سنہ

۱۴۸۔ محمد اظہار الحق ولد عنایت کریم صاحب ۳۵ زملی گلی ہندرلین کلکتہ ۳۲ سنہ

۱۴۹۔ نفیس الدین ولد نسیم الدین صاحب معرفت جانس واچ ہاؤس صدر بازار میرٹھ ۳۱ سنہ

۱۵۰۔ ایس۔ ایم رفیع الدین ولد ایس عزیز الدین صاحب صدر بازار میرٹھ ۳۰ سنہ

۱۵۱۔ افسر علی خاں ولد سردار علی خاں صاحب ۵۸ خان شاہی حیدرآباد دکن ۳۲ سنہ

۱۵۲۔ محمد منیر ولد محمد منظور خاں صاحب نمبر بنیلوی پشاور ۱۹۲۹ سنہ

۱۵۳۔ اے کے گلفام ولد عبدالرحیم صاحب معرفت آدم اسٹور [illegible] ترچناپلی ۲۹ سنہ

۱۵۴۔ عبداللہ احمد ۲۳ سالی گلی اسٹریٹ بمبئی فورٹ ۱۹۲۹ سنہ



کہنے کی باتیں
چندو لال شاہ کی عجیب منطق

رنجیت فلم کمپنی اور چندو لال شاہ کو صنعتِ فلمسازی میں ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اور اسکے ساتھ ساتھ دوسرے پروڈیوسر بھی انکا کافی احترام کرتے ہیں اور بیتے تجربات کی بنا پر شاہ صاحب کی ہمارے دل میں بھی عزت ہے مگر یہ اطلاع سنکر ہمکو بیحد صدمہ پہنچا کہ رنجیت فلم کمپنی کے ملازمین نے موجودہ گرانی سے تنگ آکر جو استدعا استاذ کی شاہ جی کی خدمت میں پیش کی تھی وہ بڑی حقارت کے ساتھ نامنظور کردی گئی، اور یہی نہیں بلکہ سٹاف کی نظر ثانی کی درخواست پر اب یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر یہ لوگ یوں باز نہ آئے تو کمپنی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کردی جائیگی۔

ہم نہیں سمجھ سکے کہ کمپنی کا بند کردینا کن حالات میں مفید سمجھا گیا اگر یہ صرف سرمایہ دارانہ ذہنیت کا مظاہرہ ہے تو حالات کے اعتبار سے اسکو ذہنی دیوالیہ پن سے تعبیر کیا جائیگا کیونکہ زمانہ تیزی سے بدل رہا ہے مزدوروں کی زندگیاں ۔۔۔ تماشہ نہیں ہیں یہاں تک کہ خود موجودہ حکومت انکی پشت پناہی کرنے پر مجبور ہوگئی ہے دو سب بڑے بڑے سرمایہ دار اور مل مالک مزدوروں کی طاقت کے آگے سر جھکانے پر مجبور ہیں تو پھر شاہ صاحب کس گنتی اور شمار میں ہیں لاکھوں اور کروڑوں روپیہ ان فنکاروں اور ٹیکنیشنوں کے تعاون سے کمایا جا رہا ہے آخر ان میں سے ایک جائز حق نہ دینا کیا معنی رکھتا ہے وقت کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ خود ان غریبوں کی تنخواہوں میں اضافہ کرتے اور اگر دولت کے نشے نے ابھی انکو یہ سوچنے کی مہلت نہیں دی تھی تو اس درخواست پر ہمدردی سے غور کرنا اور بھی لازم آجاتا ہے لیکن کمپنی کے بند کر دینے سے مزدوروں کو ۔۔۔ نقصان ۔۔۔ شاہ جی ہمیشہ کیلئے تباہ ہو جائینگے اگر سرمایہ کے زعم میں ۔۔۔ بیٹھے ۔۔۔ وہ اسکا تریک کر بیٹھے تو یہ انکی فاش غلطی ہے کیونکہ اجتماعی طاقت کے مقابلہ میں بڑے بڑے سرمایہ دار بھی ۔۔۔ ہتھیار ڈال چکے ہیں ۔۔۔ ہم انکو مخلصانہ مشورہ دیتے ہیں کہ شاہ جی اس قسم کی ضد اور ہٹ کا مظاہرہ کئے بغیر ان مطالبات کو خندہ پیشانی سے منظور کریں تاکہ انکی کمپنی تباہی کا شکار نہ ہو ہمکو امید ہے کہ شاہ صاحب ہمارے مشورہ پر تمام حالات پر سنجیدگی سے غور کرنے کی زحمت گوارا فرمائینگے۔

ایڈیٹر

دو دو باتیں
ڈائرکٹر شانتارام سے

محترم

تسلیم!

تازہ ترین اطلاعات کے مطابق اُمید ہے کہ آپ واپس آچکے ہونگے اور ابھی آپ شاید اس قدر مصروف بھی نہیں ہونگے کہ میری ان باتوں کو سننے کیلئے آپ وقت نہ نکال سکیں۔ سب سے پہلے تو مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ میں آپکی بیحد عزت کرتا ہوں اور آپکی فنی صلاحیتوں کا بھی میں معترف ہوں میری رائے ہے کہ آپ ہندوستانی فلم انڈسٹری کو دوسرے ممالک کے مقابلہ میں پیش کرنے کی تمنا اپنے دل میں لئے ہوئے ہیں اور آپکا سفر اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھا۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپنے گرانقدر پیشکش کے باوجود ۔۔۔ کے اس آفر کو ٹھکرا دیا جسکے ذریعہ سے مسٹر شانتارام (رجے کھتری) اور آپ سے ایک امریکن فلم میں کام کرنے کی استدعا کی گئی تھی جس وطنی جذبہ کے تحت آپنے اس پیشکش کو نامنظور کیا ہے اس کام کرنے کی استدعا کی گئی تھی جس وطنی جذبہ کے ماتحت آپ نے اس وطنی جذبہ کے ماتحت آپنے اس پیشکش کو نامنظور کیا ہے اس کو جس قدر بھی سراہا جائے وہ کم ہے اور ایک ہندوستانی کی حیثیت سے آپکو اس پر دل کی گہرائیوں سے ۔۔۔ مبارکباد پیش کرتا ہوں مگر اسی سلسلہ میں مجھے آپ سے ایک اور ۔۔۔ بھی کہنا ہے ۔۔۔ کہ آپ نے ہندوستانی فلموں میں کام کرنے والے ۔۔۔ ایک مرد اور چار ایکٹریسوں سے معاہدہ کرلیا ہے جس میں ۔۔۔ مشہور ایکٹر ۔۔۔ کمپنی کا نام نمایاں ہے ۔۔۔ سکتا ہے کہ آپ نے کسی ذاتی مصلحت کی بنا پر یہ عمل کیا ہو مگر جہاں تک کہ میرا خیال ہے آپکا یہ اقدام تجارتی اور مفاد عامہ کے اعتبار سے ہندوستانی اداکاروں کیلئے بڑا نقصان دہ ہے کیونکہ اس کا امکان زیادہ ہے کہ آپکی دیکھا دیکھی ہندوستان کے دوسرے بڑے بڑے پروڈیوسر بھی بیرونی فنکاروں کو اپنی فلموں کیلئے گرانقدر معاوضوں پر منتخب کریں اور اس نقل کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان کے ہنرمند اداکار ۔۔۔ سے محروم ہو جائینگے دوسری بات یہ ہے کہ ۔۔۔ تعلیم و تربیت کے بھی یہ اداکار ہماری فلموں میں ہماری معاشرت کے مطابق کام نہیں کرسکینگے اور شاید ہندوستان کے عوام بھی انکو پسند نہ کریں ۔۔۔ آپکا ۔۔۔ معاہدے ہیں ۔۔۔ منسوخ کردیجئے ورنہ ہندوستان ۔۔۔ کوئی انتخاب ہیں آپکا ۔۔۔

آنسہ ثریا بی۔اے (آنرز)

یوپی میں صنعت فلمسازی کا درخشاں دور

ماہرین اقتصادیات کی رائے ہے کہ اس جنگ کی وجہ سے فلم انڈسٹری کو مالی اعتبار سے جو فائدہ پہونچا ہے وہ صرف عارضی قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ ایسی شاندار ترقی دراصل پیش خیمہ ہوتی ہے۔ اس کساد بازاری کی جس سے آگے چلکر ہر صنعت کو کافی نقصان پہونچا کرتا ہے اگر ہم ان ماہرین اقتصادیات کے ان جملوں پر سنجیدگی سے غور کریں تو ایک صاف معنی یہ نظر آتے ہیں کہ آئندہ چلکر اس صنعت کو مالی اعتبار سے کافی نقصان پہونچے گا۔ یہ صحیح ہے کہ ایک ایسے وقت میں جبکہ تجارتی منڈیوں میں منافع کی بہت کم توقع ہے سرمایہ داروں کے جوش و خروش اور روپیہ کے بے تحاشہ صرف نے ایک ایسی گرانی پیدا کردی ہے جس کی مثال صنعت فلمسازی کی تاریخ میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتی مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ حالت کب تک رہیگی ؟

اور جب ہم اس سوال کو حل کرنے کے لئے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہیں تو ہمکو یہ ماننے کے لئے مجبور ہونا پڑتا ہے کہ زمانہ مستقبل میں یقینی طور پر اس صنعت کو کسی حد تک کساد بازاری سے دو چار ہونا پڑیگا لیکن ابھی کئی سال تک یہ کساد بازاری اس صنعت کو متاثر نہیں کر سکتی اور ایک طویل عرصہ تک سرمایہ لگانے والے اشخاص اس سے کافی نفع اٹھا سکتے ہیں۔ ہر حال صنعت فلمسازی کا موجودہ زمانہ خواہ کتنا ہی شاندار کیوں نہ ہو پھر بھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ صنعت ہندوستان میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے اور اس لئے ہم اس کی طرف سے غافل نہیں ہو سکتے، ورنہ ہم اسکے بنیادی اصولوں کو فراموش کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اب اس صنعت سے ہمارا چولی دامن کا سا ساتھ ہو گیا ہے۔

ہندوستان کے عوام نئے نئے حالات اور وقتی تقاضوں سے کافی متاثر ہو رہے ہیں اور انکے ذہنوں میں غیر شعوری طور پر بلندی پیدا ہوتی جا رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اب ایسی تصاویر چاہتے ہیں جو انکی زندگی سے قریب ہوں جن میں محض تخیل ہی تخیل کی کوہ پیمائیاں نہوں مگر معیاری فلموں کا ہندوستان میں قحط ہے اور جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ معیاری فلموں کے لئے کافی سرمایہ کی ضرورت ہے لیکن ہمارے فلم ساز قدرتی طور پر زیادہ سرمایہ لگانے سے ہمیشہ معذور رہے صرف اس لئے کہ یہ صنعت ان صوبوں تک محدود ہو کر رہیگی اور دوسرے صوبوں نے اس صنعت پر معلوم نہیں کیوں توجہ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی سوچو کیوں چلیئے صوبہ یو۔پی جیسے اچھے خاصے صنعتی علاقہ میں ایسی صنعت سے پہلوتہی اور ہچکچاہٹ جو جلد یا بدیر یقینی طور پر منفعت بخش ہو ناقابل فہم معلوم ہوتی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اسکی وجوہات وہ کمپنیاں ہوں جو صبح زندگی پاکر شام اجل ہو گئیں اور جو سرمایہ دار ہمیشہ کیلئے اپنے سرمایہ سے ہاتھ دھو بیٹھے اور پھر مزید کسی آزمائش یا تجربہ کیلئے انھوں نے اپنے میں ہمت نہ پائی۔ ناگفتہ بہ حالات کے بعد بھی مزید کوشش نہ کرنا اور ایک ایسی صنعت کی طرف توجہ مبذول نہ کرنا جس میں ترقی کی کافی گنجائش ہو تجارتی اور اقتصادی مصالح کے اعتبار سے ایک فاش غلطی ہے جبکہ ایک طرف یہ بھی نظر آرہا تھا کہ اس صوبہ کی ایک بڑی تعداد اداکار و فنکار کی حیثیت سے تمام بڑی بڑی کمپنیوں میں بکھری پڑی ہے۔ اس صوبہ کے افراد کا یہ کہنا تھا کہ اس صوبہ کی سرزمین پر ایسی کوشش کبھی شرمندہ تکمیل نہیں ہو سکتی ایسی سعی ہمیشہ نقش بر آب ثابت ہوگی مگر ساش ٹوڈا کے قیام سے آخرکار یہ نظریہ ہمیشہ کے لئے غلط ہو گیا۔

ساش ٹوڈا نے ایک لمیٹڈ کمپنی کی شکل میں جنم لیا اور مسٹر نسیم سندیلوی کی قیادت میں صنعت فلم سازی کے احیا کے لئے ایک اچھا ہنرمندانہ طریقہ سے کوشش کی گئی اور اس لئے اس ادارہ کو لمیٹڈ کرایا گیا کیونکہ مالی عدم سینے تجربہ یا ہے آرتھر ویک جیسی انگریزی کمپنیوں کے اصولوں کے مطابق فلم انڈسٹری اس طرح چلانا کہ وہ کسی فرد واحد کی تمام ملکیت بن جانے ہندوستان کے

پیچیدہ اقتصادی مسائل کے بالکل منافی تھا کیونکہ آئندہ چلکر اسکے اثرات اسقدر غلط مرتب ہوتے کہ اس ادارہ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جاتا۔ اب قابل اعتماد اور تجارتی ذرائع کے استعمال اور سائنٹفک کام کا زمانہ گذر چکا ہے مقابلہ کے اس دور میں زیادہ سے زیادہ سرمایہ کی ضرورت ہے اور سرمایہ کی فراہمی اس کی متقاضی ہے کہ ایک سے زیادہ حصہ دار ہوں اور انکا کمپنی پر پورا پورا قابو ہو تاکہ سرمایہ کی بے فکری کے ساتھ ساتھ اس کا جائز استعمال بھی ہوتا رہے مگر اسکے یہ معنی نہیں کہ یہ تمام افراد رہنمائی کے فرائض بھی انجام دیں ورنہ پھر وہ ہی مثال صادق آئیگی کہ

"ایک سے زیادہ باورچی اور شوربہ بدمزہ"

کیونکہ فلم کمپنی۔ روئی۔ جوٹ۔ مل۔ لوہا۔ کوئلہ یا پیٹرول کا کارخانہ نہیں جہاں زیادہ مال پیدا کرنے کے ذرائع پر غور کرنا پڑے یا انسانی دماغ اور مشین دونوں ملکر کم سے کم مہلت میں مکمل اشیا تیار کریں یہاں تو ایسے آدمی کی ضرورت ہوتی ہے جو اچھا نگراں ہونے کے علاوہ فنی باریکیوں اور ادبی پہلوؤں پر کافی عبور کے ساتھ ساتھ سلیقہ بھی رکھتا ہو۔ اسی لئے بورڈ آف ڈائرکٹرز کی ایک آدمی کے کام میں مداخلت جائز نظام کو درہم برہم کر سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے آدمی ہی پر کمپنی کی پوری کامیابی کا دارومدار ہوتا ہے اور اس لئے اسکے انتخاب میں پورے غور و فکر سے کام لینا پڑتا ہے۔ چنانچہ ساتھ لوگ کے حصہ داروں نے اس اہم ذمہ داری کے لئے نسیم بندیلوی جیسی بلند پایہ شخصیت کا انتخاب کیا۔ جو صحافتی۔ ادبی اور بلند پایہ فلمی صلاحیتوں کے پیش نظر اسکے لئے بہت موزوں تھا۔

پرانی روایات کی زنجیروں کو توڑ کر اختراع مشکل تو ضرور ہے لیکن یہ مشکل بہم اگر سر ہو جائے تو پھر یہی ترقی کی منزل کہلائے گی۔ کیونکہ پرانا نظام اور فرسودہ چیزوں میں اب ہمارے لئے کوئی کشش باقی نہیں رہی ہے چنانچہ نسیم بندیلوی نے رشید دلہن کے اداکاروں کے انتخاب میں ان پرانے اصولوں کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہدیا اور تمام نئے چہروں کو پیش کر کے [illegible] کافی تنوع پیدا کر دیا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ تنوع ہی مسرت کی روح ہے دوسرے تماشائی بور ہو جاتے ہیں گھسے پٹے اداکاروں کو بار بار دیکھتے ہوئے اکتا گئے ہیں اور عوام کے اسی تنفر کے باعث اچھی اچھی فلمیں محض اسی وجہ سے فیل ہو گئیں کہ ان کے اداکاروں کے انتخاب میں کسی جدت طرازی سے کام نہیں لیا گیا تھا اور اب تو عوام نے یہ قرار دے لیا ہے کہ فلم سازوں کی اختراعی صلاحیتیں بالکل مفلوج ہو گئی ہیں۔ ادھر پرانے پروڈیوسرز نے زیادہ سے زیادہ نئے چہروں کو پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے تو ہمیشہ پرانے ستاروں کی مقبولیت سے فائدہ اٹھانا چاہا صرف اس لئے کہ ان "مارکٹ ویلیو" اسٹاروں کے سوا انکی تصویروں میں اور کوئی جان نہیں ہوتی حالانکہ تصویر کے دوسرے پہلو اگر کامیاب ہوں تو نئے پرانے کی تفریق کی ضرورت باقی نہیں رہے فلم اگر باعتبار کہانی مکالمے نغمات اور موسیقی بلند ہو تو نئے چہرے اسکو اور زیادہ مقبول و کامیابی کے زیادہ امکانات پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کے پروڈیوسرز ابھی اس گر کی بات کو نہیں سمجھ سکے برخلاف اسکے ہالی ووڈ میں پچھلے دس سال کے عرصہ میں سیکڑوں پرانے ستارے غروب ہو گئے اور انکی جگہ نئے ستارے طلوع ہوئے جنھوں نے اپنی تابانیوں سے عوام کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا اور جو پرانے اداکار باقی رہ گئے ہیں بلحاظ اداکاری یہ انپر بھی سبقت لے گئے۔ اقتصادی نقطہ نظر سے نئے چہرے باعث نقصان نہیں بلکہ فائدہ مند ثابت ہوتے ہیں اور انکی وجہ سے اخراجات میں کافی کمی ہو جاتی ہے۔

۲۹ [illegible] نو عمر نسیم بندیلوی [illegible] اس مناسبتی مفہوم کو اچھی طرح اپنے ذہن نشین کر لیا اور یہی وجہ ہے کہ اسکی شخصیت اس صنعت کو متاثر کر رہی ہے جیسا [illegible] بھی انقلابی مراحل سے گذرنا ہے۔ اس موقعہ پر اگر ہم ہالی ووڈ کے مشہور پروڈیوسر آرسن ویلس کا ذکر کریں تو وہ اس لئے بیجا نہ ہوگا کہ نسیم بندیلوی اور آرسن ویلس کی افتاد طبع اور ذہنیت تقریباً ایک ہی ہے [illegible] آرسن ویلس نے اپنی متحرک تصویر "CITIZEN-KANE" والی شاہراہ کو چھوڑ کر ایک نئے اور برگزیدہ راستہ کا انتخاب کیا تھا تو ہالی ووڈ کے دوسرے فلم سازوں نے واویلا مچایا تھا کہ اللہ کی پناہ مگر اسکے باوجود آرسن ویلس کی تصویر نے ریلیز ہونے کے بعد تمام گذشتہ ریکارڈ توڑ دئے تھے اور دوسرے پروڈیوسرز کے یہاں صف ماتم بچھ گئی تھی انھوں نے اسے جب بھی اسکو اپنا خطرناک دشمن سمجھ کر اس پر تیر بیچھڑ اٹھالی لیکن وہ اس سے ذرا نہیں گھبرایا بلکہ پہلے سے زیادہ [illegible] کے رجحانات اور تقاضوں کے ماتحت تصاویر تیار کرنا شروع کر دیں جس کا نتیجہ ہے کہ وہ آج کا سب سے زیادہ ہردلعزیز پروڈیوسر اور ڈائرکٹر ہے آرسن ویلس کی طرح ہمکو نسیم بندیلوی سے بھی توقع ہے کہ وہ فلم انڈسٹری سے اسی طرح کام لیگا کیونکہ ہماری انڈسٹری ایک ایسی ارتقائی منزل پر پہنچ چکی ہے [illegible] اس سے تفریح کے علاوہ تعلیمی و معاشرتی مسائل کو حل کرنے کا کام [illegible] لیا جاسکتا ہے۔

نسیم بندیلوی اودھ کے ایک بلند خاندان کا چشم و چراغ ہے [illegible]

بچپن سے لیکر جوانی تک لکھنؤ ہی میں پرورش اور تعلیم و تربیت پائی اور اس شہر کی تمام رونقیں اور تفریحیں اس کی نگاہوں میں بسی ہوئی ہیں سلئے یہاں مسلم معاشرہ کی عکاسی کرنے والی تصویروں اس شہر کے تمدن و تہذیب کو پیش کرنے کی اس لئے ضرورت سمجھی کہ تاریخی اور معاشرتی حیثیت سے ابھی تک لکھنؤ کو ایک خاص شہرت رکھتا ہے۔ نسیم سنٹرل نے جن نت نئے طریقوں سے اس فلم کو تیار کیا ہے اسکو دیکھکر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فلم یو۔پی کا نام صنعت فلمسازی میں بہت بلند کریگا اور یو۔پی کا نام اونچا کرنے کی دھن میں وہ اس قدر منہمک ہے کہ روزانہ اٹھارہ گھنٹہ کام کر رہا ہے تاکہ رشید دلمن ٹیکنک کے اعتبار سے بھی دوسرے ممتاز ہدایت کاروں کی تصویر سے ٹکرے سکے۔ اگر ایک طرف اُسنے پرانے چہروں کے بجائے نئے چہرے لئے ہیں تو دوسری طرف ٹیکنیشن کے انتخاب میں اسنے اس بات کو بطور خاص ملحوظ رکھا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ پرانے اور تجربہ کار ہوں کیونکہ فنی پختگی صرف تجربات کی مرہون منت ہوتی ہے اس میں نووارد ذرا بھی کامیاب نہیں ہو سکتا اور نسیم کی یہ دور اندیشی دلالت کر رہی ہے اس بات پر کہ ساؤنڈ لینڈ یو۔پی میں صنعت فلمسازی کو بام عروج پر پہونچا دیگی۔ اور فلم سازی کا یہ نیا دور یو۔پی کی فلمی تاریخ میں آب زر سے لکھا جائیگا۔ حال ہی میں نسیم نے ایک پریس کانفرس میں سگرٹ سلگاتے ہوئے اپنے مخصوص لہجہ میں مسکرا کر کہا۔

میں آیا

میں نے دیکھا

اور فتح کرلیا

واقعی اس نے یہ سچ کہا کیونکہ اسکی فاتحانہ حیثیت تقریباً تسلیم کی جا چکی ہے۔

تلخ و شیریں :—

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

پرائے بس میں

انڈیا یونائیٹڈ پکچرز کی ناکام پیشکش

پرائے بس میں

پیشکش ——	انڈیا یونائیٹڈ پکچرز
زبان ——	اردو
کہانی ——	شاہجہاں بیگم
مکالمے ——	احسان بی۔اے
نغمات ——	عزیز کاشمیری طفیل ہوشیارپوری
موسیقی ——	نیاز حسین شامی۔ ونود
نگران رقص ——	آر۔ ٹی گنگولی
عکاس ——	ٹی آر۔ جوشی
صدابند ——	اسحان گھوش
ترتیب ——	ایم۔اے لطیف
تزئین ——	چارلی۔ رتی لال
نمائش گاہ ——	کمار ٹاکیز

—— اداکار ——

آشا پوسلے۔ پران۔ زبیدہ۔ ظہور شاہ۔ رام لال۔ مالا۔ دیپک۔ ملنظر۔ وزیر بیگم
بیبی رضیا سلیم۔ غلام قادر وغیرہ۔

—— ہدایت کار ——

داؤد چاند

اس تصویر کی تیاری کے زمانہ میں اسکی شاندار پبلسٹی کے ذریعہ عوام کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی گئی تھی کہ یہ تصویر وقت کے تقاضوں کے مطابق ہے اور ٹیکنک کے اعتبار سے یہ ایک شاہکار ثابت ہوگی مگر اس تصویر کو دیکھنے کے بعد اس دعوی کی حقیقت نقش برآب ثابت ہوئی کیونکہ عام تصاویر کی طرح اس میں بھی فرسودہ محبت کا سوانگ رچایا گیا ہے اور فنی نقطہ نظر سے اس میں کوئی بات نہیں ہے۔

کہانی۔ شاہجہاں بیگم کے نام سے موسوم کی گئی ہے ہمکو افسوس ہے کہ یہ نام آج سے قبل ہماری نظر سے کبھی نہیں گذرا ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی فرضی نام ہو کیونکہ آجکل خواتین کے نام سے کہانیاں مکالمے اور گانے لکھنے کا ایک فیشن سا ہوگیا ہے جیسے کہ دیوالیہ پروڈیوسر شہزادہ ریاض نے اپنی بیگم کو افسانہ نگار و مکالمہ نویس کی حیثیت سے روشناس کرانے کی کوشش کی تھی۔ بہرحال کہانی شاہجہاں بیگم کی ہو یا کسی ایسے صاحب کی جنہوں نے شاہجہاں بیگم کے نام کا نگینہ اور فرضی نقاب پہن رکھا ہے پھر بھی کہانی نہ میں کسی حد تک جان ضرور ہے اور جس مقصد کو مرکزی خیال بنا کر اسے سپرد قلم کیا گیا ہے وہ فرسودہ تو ہے مگر ابھی اسے اکتا دینے والا موضوع نہیں کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہنا پڑیگا کہ اس کہانی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ میاں ایم اسلم کی "نرگس" اور قاضی عبدالغفار کے "لیلی کے خطوط" کا چربہ ہے۔ اور لکھنے والے یا لکھنے والی نے ان دونوں کتابوں کے پلاٹ کو مسخ کرنے کے بعد فلم کے کردار میں سمونے کی سعی ناکام فرمائی ہے مگر اس زبردستی کی ٹھونس ٹھانس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بجائے حسن پیدا ہونے کے اس مقصد کو نقصان پہنچ گیا جس کی وجہ سے یہ کوشش کی گئی تھی اس اہم لغزش سے قطع نظر کہانی میں پرانے جاسوسی ناولوں کی طرح دہشت پیدا کی گئی ہے اسنے کہانی کی لطافت کو بالکل ہی فنا کر دیا ہے اسی طرح جن کرداروں کو زیادہ ابھارنا چاہیئے تھا۔ انکو بالکل ہی دبا دیا گیا مثلاً ڈاکٹر کپور کا کردار کہانی کے آخری حصہ میں کافی اہمیت رکھتا ہے مگر منصفہ شروع سے لیکر آخر تک اس پر کسی خاص توجہ کی ضرورت نہیں سمجھتی اگر اسکو ذرا واضح کر دیا جاتا تو کہانی میں سسپنس زندہ رہتا۔ اسی طرح ٹھاکر کا کردار بالکل غیر ضروری طور پر ظلم کو بڑھانے کے لئے پیدا کیا گیا جہاں تک اسکی حیثیت مالک کمپنی کی تھی۔ اس تک

یہ درست ہے مگر پشپا اور جیون پر اسکی حکومت فطرت کے عین خلاف معلوم ہوتی ہے جیون کی رگوں میں شریف خون گردش کر رہا ہے مگر بھوک و افلاس کی وجہ سے اس کا ضمیر مردہ ہو گیا پھر بھی وہ پشپا کی زندگی کو داغدار نہیں بنانا چاہتا ہے تو پھر اسنے ٹھاکر کے کہنے سے کیسے پشپا کو جیون کے ہمراہ چلا جانے دیا اصولاً اس وقت ٹھاکر سے اسکی لڑائی ہو جانا چاہئے تھی مگر ایسا نہیں تھا۔ ورنہ کہانی اسی جگہ ختم ہو جاتی۔ ہو سکتا ہے کہ ان غلطیوں کی کسی حد تک ذمہ داری سنریو رائٹر پر بھی ہو لیکن اس سے کہانی کی تمام کمزوریاں اس سے منسوب نہیں کی جا سکتی ہیں دوسرے بنیادی کمزوریوں کی اصلی ذمہ داری افسانہ نویس پر ہی عائد ہوتی ہے

مکالمے احسان علی شاہ بی۔اے نے سپرد قلم فرمائے ہیں احسان صاحب اردو ادب میں ایک مترجم کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس میں کافی کامیاب بھی ہیں مگر جہاں تک انکی ذاتی تحقیقات کا سوال ہے۔ اس حیثیت سے صاحب موصوف کو کوئی خاص درجہ حاصل نہیں ہے اب ادھر کچھ دنوں سے احسان صاحب فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ اور انکی یہ پہلی فلم ہماری نظر سے گذری ہے جہاں تک بیساختگی اور برجستگی کا سوال ہے وہ ان مکالموں میں کسی حد تک موجود ہے مگر ادبی شگفتگی اور سلاست کا ان میں سرے سے پتہ ہی نہیں اور نگی کے مکالموں میں تو زیادہ تر تھیٹریکل انداز نمایاں ہے حالانکہ صاحب موصوف نے ان میں مزاح پیدا کرنا چاہتا ہے مگر ہمکو افسوس ہے ان میں مزاح کے بجائے بازاریت اور پھکڑپن کا امتزاج ہو گیا ہے۔ شاید احسان صاحب یہ بھول گئے کہ مزاح پر ہر لکھنے والے کو قدرت حاصل نہیں ہو سکتی اگر ایسا ممکن ہوتا تو آج ہندوستان میں ناصر چند کے معیاری مزاح نگاروں کی اس بری طرح کمی نہ ہوتی۔ علاوہ ازیں پشپا کے کردار میں کافی جان ہوتے ہوئے انھوں نے اسکے مکالموں کو کافی تشنہ رکھا اگر وہ اس کردار کی اہمیت پر غور کر کے لکھتے تو نہ صرف ادبی اعتبار سے فلم بلند ہو جاتی بلکہ اس کردار کا نفسیاتی پہلو بھی پوری طرح اجاگر ہو جاتا ہے مگر انھوں نے کہانی کی اس بنیادی کمزوری کو محسوس کرنے کے باوجود اسکو دور کرنے کی ذرہ برابر سعی نہیں کی۔

نغمات عزیز کاشمیری اور طفیل ہوشیارپوری کی جدت طبع کے مرہون منت ہیں۔ دوسرے فلموں کے مقابلہ میں انکو مہمل نہیں کہا جا سکتا البتہ بے تکاپن ان میں بھی موجود ہے مثلاً

" پھر اوڑھ چندر یا گھونگٹ میں سے بیدردی کو جھانکو گی "

بیدردی کو جھانکنا دہلی اور یو۔پی میں تو ناممکن ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ کشمیر اور پنجاب میں اسکے لئے آسانیاں مہیا ہوں کیونکہ آجکل کوئی گانا بغیر لفظ جوبن کے مکمل نہیں بالکل اسی طریقہ سے جیسے دوسرے فلموں میں ہوتا ہے میر دمن صاحب فرما رہی ہیں۔

" جوبن کی بند کلی کو کوئی پھول بنانے آئے گا "

جوبن کے ذکر کے ساتھ ساتھ آج کے گانوں میں مدہوکیت کا امتزاج بھی کچھ ضروری سا ہو گیا ہے بدیں وجہ عزیز اور طفیل صاحب نے فلم رتن کے گیت

" تم چلے پردیس لگا کر ٹھیس "

کے الفاظ کو رکھ دھندے کو اپنے گیت

" میرے دل پر لگے گی چوٹ ۔ نہ کرنا کھوٹ "

میں پیش کر کے یہ فرض بھی پوری پوری طرح ادا کر دیا ہے جس سے ہم صرف یہ ہی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ فلمی دنیا میں قابلیت وغیرہ کام نہیں آتی یا شاید اس ماحول میں پہنچنے کے بعد ساری علمیت سلام کر کے علیحدہ ہو جاتی ہے کیونکہ اچھے اچھے شاعر اس لائن میں پہنچ کر اپنے وقار کو کھو چکے ہیں۔

موسیقی فلم کی موسیقی کیلئے آل انڈیا ریڈیو کے شہرت یافتہ نیاز حسین شامی اور ونود کی خدمات حاصل کرنے کے باوجود یہ تصویر اس اعتبار سے انتہائی ناکام ہے کیونکہ موسیقار نے اس میں جدت طرازی کا ثبوت نہیں دیا۔ وہ سبھی پنجابی موسیقی جو فلموں میں سنتے سنتے باعث سماعت بن چکی ہے اس میں بھی پیش کی گئی ہے اور بیک گراؤنڈ میوزک تو انتہائی گھٹیا اور لچر ہے۔ ہر موقعہ پر تقریباً ایک ہی قسم کے سازوں کی آواز پیش کی گئی ہے اور ایک منظر میں تو سازوں میں ہم آہنگی بھی باقی نہیں رہی ہے معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت ان خداوندان موسیقی نے اپنی ٹیم کے ہر فرد کو میوزک ڈائرکٹر بننے کا موقعہ دیدیا تھا اس لئے ہر شخص نے اپنی سمجھ کے مطابق اس منظر پر مشق فرمائی۔

صدا بندی گوارا ہے مگر کندن لال کی بیوی کی آواز کے وقت بطور خاص اس بات کو ملحوظ رکھا گیا کہ اسکی آواز پھٹے ہوئے بانس کی طرح نکلے ممکن ہے صدا بند کا یہ کوئی فنی معجزہ ہو مگر افسوس ہے کہ تماشائی اس فنی قابلیت کو نہیں سمجھ سکے۔

عکاسی انتہائی دلکش اور جاذب نظر ہے لیکن آؤٹ ڈور شوٹنگ میں روپا کے چہرے پر اس سختی کے ساتھ دھوپ کا عکس ڈالا گیا ہے کہ اس بیچاری کی آنکھیں بار بار چندھیا جاتی ہیں۔ موٹروں کے دوڑتے وقت جو منظر دکھایا گیا ہے وہ بیحد حسین ہے اسی طرح پریم اور پشپا کی پہلی ملاقات کے وقت موٹر کے آئینہ میں نگاہوں کے تصادم کے شاٹس جو نئے نئے زاویوں سے لئے گئے ہیں وہ عکاس کی فنی سوجھ بوجھ کا پتہ دیتے ہیں۔ مجموعی حیثیت سے فی آسٹوڈیو

قابل مبارکباد ہیں۔

رقص آشا پوسلے کا پہلا رقص فنی اعتبار سے کافی بلند ہے مگر اسکے بعد جو رقص پیش کئے گئے ان کو سوائے طوالت کے سوا اور کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح باغ میں جو گانا گایا گیا ہے۔ اس کے ساتھ رقص کی جو سعی فرمائی گئی وہ انتہائی مضحکہ خیز ہے۔

اداکاری کے اعتبار سے تصویر کافی ... ہے اول تو آشا پوسلے کے خد و خال اسکرین پوئی" کے مطابق نہیں ہیں دوسرے نہ تو وہ الہڑ دوشیزہ کے کردار کو نبھا سکی ہے اور نہ رقاصہ کی حیثیت سے کامیاب ہے اسی طرح پران بھی وقت گذاری کرتا نظر آتا ہے اس کا چہرہ پر نہ تو کسی وقت غم ہے اور نہ کبھی مسرت کا شائبہ پایا جاتا ہے زبیدہ نے اپنے مختصر رول میں ایک شوخ و شنگ حسینہ کا کردار بڑی خوبی سے نبھایا ہے۔ مرموز کی خوبی کے وقت اس نے ایسے عمدہ ایکشن دئے ہیں کہ پران اور آشا پوسلے دونوں پٹ گئے مگر اسکے مقابلہ میں سلیم رضا بالکل بد ہو نظر آتا ہے۔ وہ سوائے کھڑے رہنے کے اور کچھ نہیں کر سکا اسے دیکھکر تو یہ محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کیمرہ کے سامنے پہلی مرتبہ آیا ہو اور جھجک خوف کی وجہ سے گھبرا گیا ہو سرام لال میں بڑھنے کے جوہر پوشیدہ ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت کار نے کسی خاص مصلحت کی وجہ سے اسے ابھرنے کا موقعہ دیا ہی نہیں مختصر رول کے باوجود اداکاری کے لحاظ سے نقطہ عروج پر پہونچ گئی ہے۔ دیگ اس کی حیثیت سے رتی برابر بھی ترقی نہیں کر سکا حالانکہ آخر وقت میں اسکو یہ موقعہ حاصل تھا کہ وہ پورے فلم پر چھا سکتا تھا۔ نظر نے ایک کھلنڈرے نوجوان اور دلچسپ دوست کا کردار بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے اور جب تک وہ سامنے رہتا ہے تماشائی اس سے متاثر رہتے ہیں۔ غلام قادر ... سے بھی اپنے لئے تصویر میں جگہ پیدا نہیں کر سکا کیونکہ وہ ہر موقعہ پر اوور ایکٹنگ کا شکار رہتا ہے اسکے برخلاف خبور شاہ نے کسی حد تک معیاری اداکاری کا ثبوت دیا ہے۔ باقی اداکاری کا ثبوت دیا ہے باقی اداکار صرف نمائشی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہدایت کاری اس تصویر کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ داؤد چاند میں ہدایت کارانہ صلاحیتیں تو موجود ہیں مگر انکا صحیح استعمال ابھی انکو نہیں آتا ہے۔ ورنہ یہ تصویر کی شوٹنگ سے پہلے "ہیپر وک" پر غور کرنے کے عادی ہیں اگر اسی تصویر کی کہانی پر یہ شروع میں غور کر لیتے اور اسکے تسلسل کا صحیح خیال رکھتے تو یہ ایک اعلیٰ پایہ کی تصویر ثابت ہوتی اسکے علاوہ ان کو اداکاروں پر کنٹرول کرنا بھی نہیں آتا ہے یہی وجہ ہے کہ ابھرنے والے کردار

عکس ریزیاں ...

کرشن چندر اپنی ذاتی کمپنی ماڈرن تھیٹر کیلئے "راکھ" فلمائینگے

رشید دلھن کے بعد نسیم سندیلوی کی "نئی تصویر" "داستان" ہوگی

جاں نثار اختر اور عصمت چغتائی کی شکایت۔ شوکت تھانوی "لاکھوں میں ایک"

ظفر تبریزی اور جمیل مظہر کی بغاوت۔ امتیاز علی تاج کی جیل یاترا۔ تنویر نقوی کی ملکہ

ممتاز مفتی کی حسرت۔ ساحر اور تاباں باغی۔ خانہ بدوش شاطر غزنوی۔ زبق کی کلوپیٹرا

ہندوستان کے جلیل القدر ترقی پسند افسانہ نگار کرشن چندر جو قبل ازیں بینگل اسٹوڈیو میں بحیثیت ہدایت کار شامل ہوئے تھے اور وہاں ایک فلم "سرائے کے باہر" بھی تیار کر چکے ہیں اب اپنا ذاتی پروڈکشن ماڈرن تھیٹر کے نام سے شروع کر دیا ہے۔ ایک حالیہ اطلاع کے مطابق کرشن چندر اپنے اس ادارہ کے لئے پہلی فلم "راکھ" تیار کرینگے۔ اس کا افسانہ خود انکی ذہنی کاوشوں کا ماحاصل ہوگا۔ مکالموں کی ذمہ داری بھی اس ذہین افسانہ نگار نے اپنے سر لی ہے۔ گانوں کے لئے ہندوستان کے نوجوان شاعر شو اختر عادل ایم۔اے اور حیدرآباد کے بیتاب فطرت فنکار نیاز حیدر کا نام لیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ یہ اتحاد ثلاثہ اس تصویر کے لئے مبارک فال ثابت ہوگا۔ اس تصویر کا افتتاح ایف نرمیان کے ہاتھوں سے ہوا ہے۔ اداکاروں میں لادمیکا اور مشہور افسانہ نگار و ہندوستان کے نامور اداکار ہیں۔ اعلان ہے کہ کرشن چندر کی ہدایت میں تیار ہونے والی پہلی تصویر "سرائے کے باہر" ابھی ریلیز نہیں ہوئی ہے مگر جن لوگوں کو اسکی شوٹنگ یا اصل دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ انکا بیان ہے کہ فنکارانہ لحاظ سے یہ تصویر بہت کافی بلند ہے۔ اور امید ہے کہ برخلاف کرشن چندر نے ٹیکنیک کے لحاظ سے بڑے بڑے دوسرے ہدایت کاروں کے مقابلہ میں پیش کیا ہے "سرائے کے باہر" کی اس رپورٹ کے بعد یہ اندازہ بیجا نہ ہوگا کہ "راکھ" "سرائے کے باہر" سے کہیں زیادہ بلند اور اعلےٰ تصویر ثابت ہوگی۔ خدا کرے ہمارا یہ قیاس غلط ثابت نہ ہو۔

نسیم سندیلوی بی۔اے (آنرز) ایم۔اے۔ جو افسانہ نگار اور صحافی کے بعد اپنی پہلی تصویر ریلیز ہونے سے قبل ہی ایک بلند پایہ ہدایت کار کی حیثیت سے ناقابل فراموش شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ انکے بارے میں تازہ ترین اطلاع یہ ملی ہے کہ وہ سائن ٹون لمیٹڈ کی پہلی تصویر رشید دلھن کو تقریباً مکمل کر چکے ہیں۔ اس تصویر کے مکالمے آنسہ ثریا بی۔اے (آنرز) کی جنبش قلم کے رہین منت ہیں۔ اور گانوں کی کامیابی کے لئے عمر انصاری بی۔اے (آنرز) کا نام نمایاں ہے۔ ڈائرکشن ایس خلیل کی نگرانی میں نسیم سندیلوی نے خود انجام دی ہے۔ اس تصویر میں لکھنؤ کی معاشرت کا ایک ایسا عکس پیش کیا گیا ہے جو فلمی دنیا کی تصویر میں نہیں دیکھا گیا۔ اب نسیم سندیلوی جانے سہاگ کے داستان فلمائیں گے۔ جسکی کاغذی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں اور داستان کے بعد سہاگ کی فلمبندی شروع ہوگی۔ داستان کے مکالموں کے لئے ریڈیو کے مشہور ادیب ایم۔اے۔ لطیف کی خدمات گرانقدر معاوضہ

پر حاصل کی گئی ہیں۔ نغمات کیلئے عمر انصاری بی۔ اے (آنرز) کا نام لیا جارہا ہے۔ داستان میں بھی نسیم غذبلوی کی فنکارانہ صلاحیت کا دلکش مظاہرہ ہوگا۔ اداکاروں میں ابھی تک صرف شہناز اور نکہت کے ناموں کا اعلان کیا گیا ہے **تفصیلی اطلاعات کا انتظار ہے۔**

ٹویگ چیتریٹ ۔ یونہ جو عظیم بیگ چغتائی مرحوم کی کہانی شکایت فلما رہی تھی۔ وہ قریب قریب تیار ہوچکی ہے۔ اس فلم کے مکالمے عظیم بیگ چغتائی کی ہمشیرہ عصمت چغتائی نے قلمبند فرمائے ہیں۔ عصمت اردو کی مشہور افسانہ نگار خاتون ہیں جنکے متعدد افسانے عریانی کی وجہ سے کھلبلی مچا چکے ہیں ۔ ۔ رشتے افسانوں کی اشاعت کے سلسلہ میں ہماسا اوب لطیف کے خلاف نقش نویسی کا پرچہ چاک ہوکر عریاں ادب کی ترویج کے سلسلہ میں مقدمہ بھی چل چکا ہے ۔ نہیں کہا جا سکتا کہ شکایت کے مکالموں میں کونسا انداز نگارش اختیار کیا گیا ہے ۔ گرچہ نا خواستہ ظاف اور ذلیل ہی والا قلم استعمال کیا گیا ہے تو ہم کو اندیشہ ہے کہ بمبئی سنسر بورڈ اس فلم کو سنسر نہیں کریگا اس فلم کے گانے مشہور ترقی پسند شاعر پروفیسر جان نثار اختر کی جدت طبع کا نتیجہ ہیں ۔ اور خیال ہے کہ ادبی لحاظ سے یہ کافی بلند ہونگے اور جان نثار اختر اس میں اپنی سابقہ شہرت کو برقرار رکھینگے۔ ڈائرکشن کے فرائض شاہد لطیف بجالا رہے ہیں جو عظیم بیگ چغتائی مرحوم کے بہنوئی یعنی عصمت چغتائی کے شوہر ہیں۔

کون ہے وہ شخص جو شوکت تھانوی کے نام سے واقف نہ ہو قبل ازیں یہ اطلاع ان ہی صفحات میں شائع کی جاچکی ہے کہ حضرت شوکت تھانوی پنچولی آرٹ میں شامل ہوچکے ہیں پہلے معلوم ہوا تھا کہ صاحب موصوف برسات کی ایک رات کے مکالمے لکھیں گے مگر اب معلوم ہوا ہے کہ مسٹر پنچولی نے اس تصویر کو فلمانے کا ارادہ ترک کردیا ہے اور اسکے بجائے لاکھوں میں ایک تیار کررہے ہیں سنا ہے کہ اسکی کہانی اور منظر نامہ شوکت صاحب کی جدت طبع کا رہین منت ہے۔ توقع ہے کہ یہ تصویر پنچولی کی دیگر تصاویر کے مقابلہ میں کافی بلند و برتر ہوگی بشرطیکہ شوکت صاحب کی کہانی کو جوں کا توں برقرار رکھا گیا اور اس میں کوئی قطع و برید نہیں کی گئی۔

بغاوت کسی حکومت سے نہیں بلکہ یہ نام ہے شبنم آرٹ فلمز لمیٹڈ کلکتہ کی پہلی فلم کا جسکے پروڈیوسر ایس ایم۔ رمضان اشرفی ہیں اور جو تیزی کے ساتھ تکمیلی مدارج طے کررہی ہے۔ بعض حصوں کی منظر کشی کے وقت کچھ ارباب ذوق حاضر تھے ۔ انکا بیان ہے کہ واقعی بغاوت سال رواں کی ایک انقلاب پرور ہی نہیں بلکہ اصلاحی تصویر ہوگی جسے مشہور ادیب ظفر تبریزی بی۔ اے کی ہدایات میں تیار ہونے کا فخر حاصل ہے۔ بنگال کا جادو تو مشہور ہی ہے مگر بغاوت کے گانے سنکر دنیا کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ بنگال کی موسیقی بھی بنگال کے جادو کے مانند ہے موسیقار بنگال پروفیسر ایم۔ ایچ خسرو نے جمیل مظہری۔ ایم۔ اے اور ہجو کشمی کے گانوں کو اسقدر دلکش بنادیا ہے کہ ہر سننے والا انکو سنکر تڑپ جائیگا ۔

شہر سے دُور نامی فلم کے مکالمہ نویس امتیاز علی تاج جنکے مکالموں میں اب عامیانہ پن اور ابتذال پن نمایاں ہونے لگا ہے۔ حال ہی میں حیلہ نامی فلم کی کہانی لکھکر فارغ ہوئے ہیں۔ مگر ہمکو امید نہیں کہ یہ فلم ادبی حیثیت سے کامیاب ہوسکے۔ اس فلم کو ڈائرکٹر جاگیردار اپنے ادارہ جاگیردار پروڈکشن کیلئے فلمارہے ہیں اداکاروں میں کامنی کوشل اور رتنا پور وغیرہ ہیں۔

تنویر نقوی ایک ادبی اور فلمی دنیا میں کسی مزید تعارف کے محتاج نہیں ہیں آجکل یہ مضطرب ادیب ہند پکچرز کی جدید ترین تصویر ملاک کی نہ صرف کہانی لکھ رہا ہے بلکہ اسکے مکالمے اور نغمات بھی اسکے ہی قلم کے رہین منت ہونگے اس تصویر کو ڈائرکٹر نذیر جو پیراشٹر ہند پکچرز اپنی ہدایات میں تیار کرینگے۔ چنانچہ اسکے لئے انھوں نے سوبھنا سمرتھ۔ ریاض۔ آمین اور کا شمیری کی خدمات حاصل کرلی ہیں۔

ممتاز مفتی عصر حاضر کے بلند پایہ ترقی پسند افسانہ نگار ہیں انکے مجموعے ان کہی اور گہما گہمی کو اردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ سمجھا جاتا ہے۔ ریڈیو کے علاوہ اب یہ ممتاز اشتیاق زقادر اسٹوڈیو کی فلم حسرت کا منظر نامہ اور گانے لکھنے میں منہمک ہے۔ یہ کمپنی پنجاب کے چند حوصلہ مند نوجوانوں نے قائم کی ہے اور اسکے کرتا دھرتا اے۔ ایس۔ رکھوا نہیں جو حسرت کے پروڈیوسر کی حیثیت سے عنقریب روشناس ہونگے۔ اس تصویر کے مکالمے اعظم مرزا تحریر فرمائیں گے۔ کاسٹ کا ابھی اعلان نہیں ہوا ہے

مودی میکرز لمیٹڈ کی پہلی پیشکش خانہ بدوش ہے جسکے مکالمے ہونہار ادیب اور ہدایت کار شاطر غزنوی کی صلاحیتوں کے آئینہ دار ہونگے گانوں کیلئے بسمل کا نام لیا جارہا ہے۔ غلام حیدر موسیقی کے انچارج ہیں اور ڈائرکٹر مدن موہن ہیں۔ اداکاروں میں کلاوتی۔ سلیم رضا۔ رادھا۔ مجنوں رمیش نایاب۔ غلام قادر۔ اقبال۔ ککو اور بیلا کا نام لیا جارہا ہے اسکے علاوہ آئندہ پروگرام میں۔ رقاصہ۔ میخانہ۔ ہلچل کا اعلان کیا گیا ہے۔

انگریزی کے مشہور ادیب آجکل کلوپیٹرا کی کاغذی تیاریوں میں منہمک ہیں۔ اس تصویر کو ظہور راجہ۔ راجہ مودی ٹون کے لیئے تیار کرینگے۔ راجہ کا خیال ہے کہ یہ تصویر فرانس میں تیار کی جائے ہم نہیں سمجھ سکے کہ آخر اسقدر فضول مصارف کی ضرورت ظہور راجہ کو کیوں ہوئی اگر ان کا منشا یہ ہے کہ بین الاقوامی حیثیت سے اس تصویر کو پیش کیا جائے تو انکو بجائے فرانس جانے کے۔ ڈاکٹر کوٹنس اور نیچانگ کے اصولوں کے مطابق یہ تصویر تیار کرنا چاہیئے۔ اس طرح ان کا منشا پورا ہو جائیگا۔

میرا بابا شالیمار کی جدید ترین تخلیق ہے جو جنرل ٹاکیز کے ذریعہ سے عنقریب دہلی میں ریلیز ہو رہی ہے۔ تصویر کی پوری کامیابی کا اس لئے یقین ہے کہ میسرز جنرل ٹاکیز اسکی بڑے اچھوتے طریقہ سے پبلسٹی کر رہی ہے۔ اس تصویر میں نینا نے پہلی مرتبہ رقص کیا ہے۔ اس فلم کے اسٹل دیکھنے سے یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ نینا کے یہ رقص فنی نقطہ نظر سے کافی بلند ہونگے۔ ڈائرکٹر ڈبلیو زیڈ احمد نے اس تصویر پر محنت بھی کافی کی ہے۔

حبیب فلمز کی تازہ ترین فلم باغی ہے جن کی کہانی حسید آزاد نے لکھی ہے۔ اور وہی اس فلم کو ڈائرکٹ بھی کر رہے ہیں نغمات کے لئے سوہن لال ساحر ایم۔ اے۔ تابان جہانوی اور تنویر نقوی کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ اداکاروں میں قمر۔ نازلی۔ انیلا۔ جیلانی اور آصف جاں کے نام درخشاں ستاروں کی حیثیت سے جگمگا رہے ہیں۔

قوم کا تازہ پرچہ خریدیئے۔ شہر:-

کلکتہ میں:- عبدالصمد نیوز ایجنٹ۔ نیو مارکٹ اسٹریٹ
پونا میں:- اسلم بکڈپو۔ سینٹرل روڈ
مالیگاؤں میں:- مالیگاؤں نیوز ایجنسی۔ حمید چوک
احمد آباد میں:- وکیل بکڈپو۔ محمد علی روڈ۔
شفیع بکڈپو۔ کالوپور ٹاور
کلیم بکڈپو۔ خاص بازار
بدرالدین جی نظامی۔ کالوپور ٹاور
منشی عبدالکریم نیوز ایجنٹ۔ خاص بازار

جل رہا ہے دیر سے میرا چراغ

بادلوں میں ماہ پارے کھو گئے
کتنی کرنیں کتنے تارے کھو گئے
کتنے ظلمت میں نظارے کھو گئے
اور جلتا ہی رہا میرا چراغ

بدلیاں اُٹھتی رہیں چھاتی رہیں
ظلمتیں ہر سمت منڈلاتی رہیں
آندھیوں پہ آندھیاں آتی رہیں
تھرتھرایا تک نہیں میرا چراغ

اک دھوئیں کی لہر بل کھاتی رہی
ظلمتوں کے تیر برساتی رہی
سیم و زر کی آگ کجلاتی رہی
مسکراتا ہی رہا میرا چراغ

زندگی اک سیلِ خوں ہوتی گئی
اور تکمیلِ جنوں ہوتی گئی
تیرگی جتنی فزوں ہوتی گئی
جگمگایا اور بھی میرا چراغ

قوم ہر مہینہ چھ آنے میں خریدیئے :-

مدراس میں :- ایم - اے بادشاہ - براڈوے
ایس بادشاہ ماؤنٹ روڈ
:- اسٹار بک ڈپو - کوپر اسٹریٹ
احمد بخش اینڈ سنز جے جے اسپتل
رضا حسین بکسیلرز - کرافورڈ مارکیٹ
کراچی میں :- لیڈر نیوز ایجنسی - بندر روڈ
حیدرآباد میں :- جنرل نیوز ایجنسی - شاہ علی بنڈہ
بنگلور میں :- فردوسی نیوز ایجنسی - اولڈ پاور ہاؤس
دار الاخبار انجمن ترقی اردو - ڈس مہاراجہ روڈ



... سیاست کے ماہ و انجم



سردار عبدالرب نشتر



قائداعظم محمد علی جناح

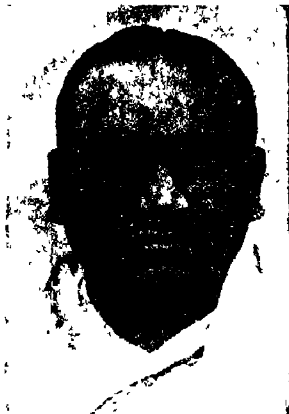


[illegible]

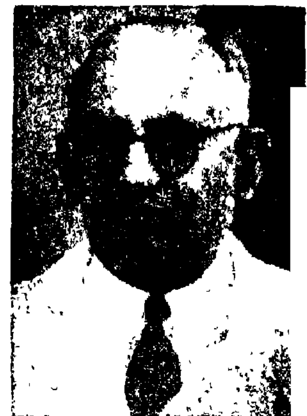




محمد علی [illegible]



جوگندر ناتھ منڈل



آئی آئی چندریگر

[illegible]



[illegible]



[illegible]



[illegible]



[illegible]



[illegible]



[illegible]



[illegible]



[illegible]



[illegible]



[illegible]



[illegible]



[illegible]